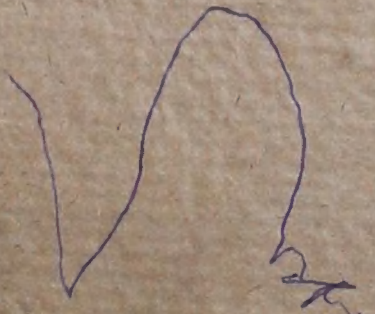


عنوان

انتساب

آج کل پنجاب میں اُردو زبان اور اس کے علم و ادب سے غیر معمولی دلچسپی نظر آتی ہے اس کی تعمیر میں سب سے زیادہ میرے دیرینہ مخدوم خان بہادر سر شیخ عبدالقادر بی ' اے بیرسٹر ایٹ لاء ممبر لیجسلیٹیو کونسل کی خدمت زبان و ادب کا حصہ ہے ۔ اس لئے میں اس ناچیز تالیف کے انتساب کے لئے جو از اول تا آخر پنجاب اور اُردو کے باہمی تعلقات کے تذکروں سے لبریز ہے' آپ ہی کے نام نامی کو طغرائے عنوان بنانے کی عزت حاصل کرتا ہوں ۔

محمود شیرانی

عرضِ حال

اس تالیف میں اُردو زبان کی قدامت پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے خصوصاً ان مسائل پر جن کی رو سے پنجاب، اس زبان کی ابتداء اور اس کی نشو ونما کا گہوارہ مانا جا سکتا ہے۔

اردو زبان کے آغاز کا سر زمین پنجاب سے منسوب ہونا کوئی نیا نظریہ یا عقیدہ نہیں ہے اس سے پیشتر پنڈت کیفی (بعقیدہ خود مذاق کے طور پر) اور شیر علی خاں صاحب سرخوش اپنے پر لطف تذکرہ "اعجاز سخن" میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں مگر اس کتاب میں اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ نظر ڈالی گئی ہے اس تالیف کا نام اس کے آخری باب "پنجاب میں اُردو" کی رعایت سے رکھا گیا ہے جو تمام و کمال پنجاب کے اردو گو شعرا کے ذکر و اذکار سے مملو ہے۔ یہاں مجھے اس شکریے کے اظہار سے بھی عہدہ برا ہونا ہے جو اس کتاب کی تالیف کے سلسلے میں بعض حضرات کی معاونت کی طرف سے مجھ پر عائد ہوتا ہے اس فہرست میں سب سے پہلا نام میرے "کارچ تاش" دوست پروفیسر سراج الدین آذر ایم اے کا ہے جن کے نفیس کتب خانہ کا دروازہ ہمیشہ میرے لئے کھلا رہا اور جن کی نادر کتابوں سے اس سلسلے میں میں نے بہت کچھ مفید مطلب سرمایہ اخذ کیا ہے۔ ان کے بعد مجھے مولوی محبوب عالم صاحب مالک و مدیر "پیسہ اخبار" جناب شیر علی خاں صاحب سرخوش، جناب غلام دستگیر صاحب نامی، میاں حفظ الرحمن صاحب منہاس اور عبد السبحان صاحب، بی اے کا ذکر کرنا ہے جن کی قیمتی امداد کا شکریہ میری دلی مسرت اور خوش دلی کا باعث ہے۔

محمود شیرانی

775

فہرست مطالب

دیباچہ

بیرون پنجاب کے جن فضلاء و ادبا کے علمی احسانات سے اہل پنجاب کی گردنیں ہمیشہ خم رہیں گی۔ ان میں علامہ حافظ محمود شیرانی مرحوم کا نام نہایت ممتاز ہے۔ "پنجاب میں اردو" حضرت علامہ کے آفتاب تحقیق کی صرف ایک شعاع ہے لیکن اس ایک شعاع سے زبان اردو کے ماخذوں کا گوشہ گوشہ منور ہو گیا اور جو محققین و طلبہ ایک صدی سے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مار رہے تھے۔ ان کو ایسی روشنی مل گئی جو ہمیشہ ان کے لیے چراغ راہ بنی رہے گی۔

"پنجاب میں اردو" پر دیباچہ لکھنا نہ تو میرا منصب ہے اس لیے کہ علمی تحقیق کے میدان کا مرد نہیں ہوں اور نہ اسکی ضرورت ہے اس لیے کہ اس پر خود مصنف کا لکھا ہوا مقدمہ موجود ہے۔ اس میں مطالب کتاب کا تعارف ایسے انداز میں کر دیا گیا ہے جس سے بہتر ممکن نہیں۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ قارئین کتاب کو مصنف کے سوانح حیات اور ان کی شخصیت سے روشناس کر دیا جائے۔

قوم اور خاندان حافظ محمود خاں شیرانی کے والد محمد اسمٰعیل خاں کا اصلی وطن ریاست جودھ پور مارواڑ تھا جہاں "شیرانیوں کی ڈھانی" کے نام سے ایک بستی آباد ہے۔ محمد اسمٰعیل خاں حضرت سید احمد شہید کے اہل قافلہ سے تعلق رکھتے تھے اور ٹونک میں جاگیر کے مالک ہونے کے علاوہ کاروبار تجارت بھی کرتے تھے۔ شیرانی سرحدی پٹھانوں کا ایک قبیلہ ہے جو ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے موضع کے متصل جنوبی وزیرستان کے جنوب میں آباد ہے۔ اس قبیلے کے بعض خاندان راجپوتانہ

میں آباد ہو گئے تھے انہیں میں حافظ محمود خاں شیرانی کے اجداد بھی تھے۔

ولادت اور تعلیم

حافظ صاحب مرحوم اکتوبر ۱۸۸۰ء میں بمقام ٹونک پیدا ہوئے چونکہ اس زمانہ میں انگریزی تعلیم کا رواج نہ تھا خصوصاً قدامت پسند خاندان تو اس کے قطعاً روادار نہ تھے اس لیے شیرانی صاحب نے پہلے حفظ قرآن کیا۔ اسکے بعد اپنے والد محترم سے فارسی پڑھتے رہے۔ غالباً ۱۸۹۵ء میں تکمیل تعلیم کے لیے لاہور بھیجے گئے۔ سنٹرل ماڈل اسکول میں داخل ہوئے لیکن انگریزی اور ریاضی وغیرہ کے مضامین سے ان کی طبیعت کو لگاؤ پیدا نہ ہو سکا لہٰذا اسکول چھوڑ کر اورینٹل کالج لاہور میں داخل ہو گئے۔ اور مولوی عبدالحکیم کلانوری سے فارسی کی تکمیل کی ۱۹۰۰ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کر کے اپنے وطن ٹونک واپس چلے گئے۔

حافظ صاحب انگلستان میں

۱۹۰۴ء میں جب قدامت پرستی کی قوتیں بڑی حد تک مغلوب ہو چکی تھیں حافظ صاحب کے والد محترم نے اپنے ہونہار بیٹے کو بیرسٹری کی تعلیم کے لیے انگلستان بھیج دیا حسن اتفاق سے اسی زمانہ میں سر عبدالقادر اور ڈاکٹر اقبال بھی وہیں موجود تھے چنانچہ ان حضرات سے حافظ صاحب کی خوب صحبتیں رہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ المامون سہروردی بھی اسی زمانہ میں انگلستان ہی میں مقیم تھے۔

حافظ صاحب نے انگلستان پہونچتے ہی سب سے پہلے انگریزی پڑھنی شروع کی کیونکہ اس سے قبل وہ اس زبان سے قریب قریب بے بہرہ رہے تھے ابھی وہ دو ابتدائی امتحان ہی پاس کیے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ ٹونک والوں نے خرچ بھیجنا بند کر دیا۔ اب تعلیم تو جاری نہ رہ سکتی تھی لیکن حافظ صاحب مزید ۶ مہینے تک انگلستان میں رہنے کے بیحد خواہشمند تھے بعض احباب کی سعی و سفارش سے سر ٹامس آرنلڈ نے ان کی دستگیری کی اور کسی فنڈ سے وظیفہ دلوا کر تحقیق علمی کے کام میں اپنا

مددگار مقرر کرلیا یہاں سے حافظ صاحب کو مشرقی علوم وابستہ کی تحقیقات کا چسکا لگا جو مدت العمر شریک حال رہا۔ وظیفے کی رقم قلیل تھی جس میں گزر اوقات مشکل تھی چنانچہ لندن کے مشہور تاجر فرم لیوزک کمپنی نے حافظ صاحب کو مشرقی مخطوطات اور دوسری قدیم اشیا کی خرید پر مامور کر دیا اس خرید پر کمیشن بھی ملتا تھا جس سے حافظ صاحب کی مالی پریشانیاں بڑی حد تک رفع ہو گئیں۔

ہندوستان میں واپسی

لیکن ۱۹۱۳ء میں وہ دفعتاً ہندوستان واپس آگئے واپسی کا مقصد یہ تھا کہ آٹھ نو سال کے بعد اپنے اعزہ سے بھی مل لیں اور بھائیوں کے ساتھ تقسیم جائداد کی بات چیت بھی کریں۔ خیال یہ تھا کہ چند ماہ میں ان امور سے فراغت حاصل کرنے کے بعد واپس انگلستان چلے جائیں گے لیکن ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی جو چار سال تک جاری رہی اور حافظ صاحب انگلستان نہ جا سکے پھر خاندانی پیچیدگیوں میں کچھ اور عرصہ گزر گیا۔

اسلامیہ کالج لاہور میں ملازمت

آٹھ سال کی خانہ نشینی کے بعد ۱۹۲۱ء میں حافظ صاحب تلاش معاش میں لاہور پہنچے یہاں ڈاکٹر اقبال اور سر عبد القادر جیسے ذی اثر دوست موجود تھے جن کی کوشش سے حافظ صاحب اسلامیہ کالج میں ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر اردو فارسی کے لکچرر مقرر ہو گئے اگرچہ مشاہرہ بہت کم تھا لیکن درویش طبع محمود خاں نے اس کو قبول کر لیا اور سات سال اسلامیہ کالج میں گزار دیئے اسی زمانے میں ان کے متعدد محققانہ مقالے رسالہ "اردو" (حیدرآباد دکن) میں شائع ہوئے جن سے علمی حلقوں میں حافظ صاحب کی تحقیق علمی کی دھوم مچ گئی ۱۹۲۸ء میں آپ کی یہ کتاب "پنجاب میں اردو" شائع ہوئی چنانچہ اسی کتاب کی وجہ سے پنجاب یونیورسٹی کے ارباب اختیار کی نظر انتخاب حافظ پر پڑی اور وہ اورینٹل کالج لاہور میں اردو کے لکچرر مقرر کئے گئے

اورینٹل کالج سے سبکدوشی

جب حافظ صاحب کو اورینٹل کالج لاہور میں نو سال گزر گئے تو ۵۵ سال عمر ہو جانے کی وجہ سے ان کی سبکدوشی کا سوال پیدا ہوا لیکن یونیورسٹی نے ان کی کارکردگی کے باعث ملازمت میں دو سال کی توسیع منظور کر لی۔ اسکے بعد ۱۹۳۸ء میں مزید دو سال کے لیے اسی اسامی پر لیکن کسی قدر کم مشاہرہ پر حافظ صاحب کا تقرر کر دیا گیا آخر ۱۵ نومبر ۱۹۴۰ء کو ۶۰ سال آٹھ ماہ کی ترلو پر پروانہ ہوئے جسکے بعد انکی ملازمت کا سلسلہ منقطع ہو گیا مولوی عبدالحق صاحب نے حافظ صاحب کو تصنیف و تالیف کی غرض سے انجمن ترقی اُردو (دہلی) میں بلا لیا تھا لیکن چند ہی مہینے وہاں کام کر پائے تھے کہ خرابی صحت کی وجہ سے اس تعلق کو ترک کر کے وطن جانے پر مجبور ہو گئے۔

وقت آخر

حافظ صاحب ۱۹۳۸ء سے ضیق النفس میں مبتلا ہو گئے تھے ہر قسم کے علاج کے باوجود اس مرض میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ خصوصاً آخری چار برس بہت تکلیف میں بسر ہوئے۔ بالآخر وقت آخر آن پہونچا اور ۱۵ فروری ۱۹۴۶ء کو یگانۂ روزگار فاضل چھیاسٹھ برس اور چار مہینے کی عمر پا کر رہ گزرائے عالم جاودانی ہوا۔ اِنا للّٰہ وَ اِنا الیہ راجعون۔

اختر شیرانی

حافظ محمود شیرانی مرحوم و مغفور کے اکلوتے فرزند محمد داؤد خاں اختر شیرانی تھے جو اردو زبان کے نہایت نغز گو شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ افسوس کہ وہ بھی اپنے والد مرحوم کی وفات سے کوئی ڈھائی سال بعد بمقام لاہور انتقال کر گئے۔ رہے نام اللہ کا۔

مخطوطات و نوادر کی جمع آوری

حافظ محمود شیرانی نے ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار پر ملازمت شروع کی اور سبکدوشی کے وقت چار سو روپئے پا رہے تھے لیکن آمدنی کی اس قلت کے باوجود انھوں نے اپنے

بست سالہ زمانۂ ملازمت میں کم و بیش بیس ہزار روپئے کی قلمی اور پرانی کتابیں جمع کیں
اور تقریباً اسی مالیت کے پُرانے سکے فراہم کیے اسکے ساتھ ہی یہ بھی ملحوظ رہے کہ
ان نوادر کی جمع آوری کے لیے انھوں نے ہزاروں روپئے سفر پر بھی خرچ کیے ہونگے
اس کا نتیجہ یہ تھا کہ انھوں نے ہمیشہ نہایت سادہ زندگی بسر کی۔ ایک معمولی سے مکان
میں رہتے تھے جس کے زیادہ تر کمرے کتابوں اور سکوں کی الماریوں سے پٹے
پڑے تھے اور ایک گوشے میں فرش پر حافظ صاحب مطالعہ و تصنیف میں
مصروف رہتے تھے۔ گرمی ہو یا جاڑا ہو۔ برسات ہو۔ شور و غوغا ہو، کوئی
چیز ان کی علمی مصروفیتوں میں حائل نہ ہوتی تھی۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے
پر انھوں نے پانچ ہزار کتابوں کا نایاب ذخیرہ معمولی رقم کے معاوضے میں پنجاب
یونیورسٹی کے سپرد کر دیا حالانکہ اگر وہ چاہتے تو ان نایاب نوادر کو فروخت کر کے
لاکھوں روپئے فراہم کر سکتے تھے۔

حُسنِ اخلاق

جن لوگوں کو حافظ شیرانی کی دوستی کا شرف حاصل رہا ہے یا
جنھیں ان کی فضیلت علمی کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا اتفاق
ہوا ہے یا جو لوگ ان سے وقتاً فوقتاً نیاز حاصل کرتے رہے ہیں وہ سب اس امر
پر متفق ہیں کہ حافظ صاحب علم و تحقیق کی جلالت قدر کے باوجود نہایت درجے کے
منکسر مزاج متواضع۔ نیک دل اور مخلص انسان تھے دوستوں پر تو جان چھڑکتے
تھے اور شاگردوں کے حق میں آیۂ رحمت سے کم نہ تھے عام ملنے والوں سے بھی ان کا
سلوک ایسا تھا کہ ہر ملنے والا ان کے حسنِ اخلاق کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔

علمی کارنامے

اس مضمون میں یہ گنجائش کہاں کہ حافظ صاحب مرحوم کے تمام
علمی کارناموں پر تبصرہ کیا جا سکے۔ وہ صرف مدرس نہ تھے بلکہ
شاعر۔ ادیب۔ محقق۔ نقاد، مورخ۔ ماہر آثار عتیقہ۔ عروضی اور خدا جانے کیا کچھ تھے

علامہ شبلی کی شعر العجم فارسی شاعری پر تنقید کا ایک لازوال کارنامہ ہے اور خود حافظ صاحب کو اس کا اعتراف تھا لیکن مورخانہ اعتبار سے وہ اس کتاب کے اکثر بیانات کو پایہ تحقیق سے ساقط جانتے تھے۔ چنانچہ انتہائی جرأت سے جو علم صحیح سے پیدا ہوتی ہے انھوں نے شعر العجم پر فاضلانہ تنقید کی جس کا کوئی جواب کسی سے بن نہ آیا۔ انھوں نے سلطان محمود غزنوی اور شاہنامہ کے متعلق مشہور حکایت کا بت اس طرح سے توڑا کہ اسکے پرخچے اڑ گئے اور سلطان محمود کا دامن ناقدردانی کے دھبے سے پاک صاف ہو گیا۔ حافظ صاحب کے زور استدلال اور تحقیق و تنقیح نے فردوسی کی طرف منسوب ہجو کو بالکل مصنوعی و الحاقی ثابت کیا۔ انھوں نے پرتھی راج راسا کے متعلق تحقیق پیش کی کہ چند بردائی سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور اس دعوے کے ثبوت میں ایسی داخلی شہادتیں پیش کیں کہ ہندی کے کسی نقاد کو بھی اسکی تردید کی جرأت نہ ہوئی تھی۔ آب حیات کی تنقید اگرچہ نامکمل رہی لیکن اس میں بھی حافظ صاحب نے مولانا آزاد کے متعدد بیانات کو پایۂ استناد سے ساقط کر دیا۔ خالق باری کو لوگ امیر خسرو کی تصنیف بتاتے ہیں لیکن حافظ صاحب نے ثابت کر دیا کہ اس کتاب میں اکثر شواہد ایسے ہیں کہ یہ کتاب لسانی اور زبانی اعتبار سے امیر خسرو سے کوئی تعلق نہیں رکھتی بلکہ یہ کسی اور شخص خسرو شاہ کی لکھی ہوئی ہے جو امیر خسرو سے بہت بعد ہوا۔

اس کے علاوہ حافظ صاحب نے بیسیوں تحقیقی مقالات اردو زبان اور اس کے متعلقہ مسائل کے متعلق لکھے۔

پنجاب میں اُردو

"پنجاب میں اردو" حافظ محمود شیرانی کا ایک لازوال ادبی کارنامہ ہے اس میں آپ نے متعدد داخلی و خارجی شواہد سے ثابت کیا ہے کہ اُردو صرف شاہجہاں کے زمانہ سے شروع نہیں ہوئی جیسا کہ عام نقاد لکھتے چلے آئے ہیں اور نہ اس کا اساسی تعلق برج بھاشا سے ہے بلکہ اس زبان کا وجود اس زمانے

سے پہلے جب سے مسلمان ہندوستان میں آباد ہوئے۔ اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں ہے
بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی میں جاتی ہے جس زبان سے اردو ترقی پاتی ہے وہ نہ برج
ہے نہ ہریانی نہ قنوجی بلکہ وہ زبان ہے جو صرف دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی
تھی ہم دیکھتے ہیں کہ اردو زبان اپنی صرف و نحو میں ملتانی زبان کے بہت قریب ہے
پنجابی اور اردو میں ساٹھ فیصدی الفاظ کا اشتراک ہے۔

حافظ صاحب کے نزدیک اردو اسی وقت بننی شروع ہو گئی تھی جب محمد بن قاسم
نے سندھ پر حملہ کیا اور شمالی مغربی سرحد سے مختلف قومیں ہندوستان میں داخل ہو
گئیں انھوں نے اس ملک کی اس زبان میں جو پنجاب میں بولی جاتی تھی اپنی زبانوں کے الفاظ
داخل کیے۔ اور وہ چونکہ ملتانی اور لہندا تھی۔ اس لیے اردو زبان بنیادی اعتبار سے
پنجابی ہی ہے جس کو دہلی پہونچ کر سرکار دربار کے تعلق کی وجہ سے وجود مستقل نصیب ہوئی
حافظ صاحب نے اپنے دعوے کے ثبوت میں جو شہادتیں فراہم کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے
کہ اردو کا وجود بہت قدیم ہے پھر پنجابی اور اردو کے سیکڑوں مشترک الفاظ اور اسما
و افعال کا ذکر کیا ہے قدیم اردو پر پنجاب کا اثر واضح کرنے کے لیے اردو کے بیشمار
پرانے نثاروں اور شاعروں کے تذکرے قلم بند کیے ہیں آخر میں گیارھویں اور
بارھویں صدی ہجری کے متعدد پنجابی شعرا کا ذکر فرمایا ہے جن میں اکثر نہایت صاف
ستھری اردو میں شعر کہتے تھے اور پنجاب کے بعض شہروں میں اردو کا ویسا ہی چرچا
ثابت کیا ہے جیسا بعد میں دہلی اور لکھنؤ میں ہوا یہاں تک کہ ایک دو نثر نگاروں کی
اردو عبارت کے نمونے بھی مہیا کر دیے ہیں حالانکہ اس وقت اردو میں نثر بہت
ہی کمیاب تھی۔

یہ چند سطور میں نے محض بہ سبیل تذکرہ قلمبند کر دی ہیں ورنہ ناظرین کتاب کو کتاب
کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ اس میں فاضل مصنف نے نہ صرف حافظ صاحب کی بہت اصلی

تفصیل دیدی ہے بلکہ خود اپنے قلم سے ایک مقدمہ بھی تحریر کردیا ہے جس کے بعد کسی اور دیباچہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی میرے نزدیک اہل پنجاب پر اور اُردو زبان پر حافظ محمود شیرانی کا یہ اتنا بڑا احسان ہے کہ ہم اس کے شکریہ سے کبھی عہدہ برا نہیں ہوسکتے جب تک اُردو زبان باقی ہے اہل پنجاب اس امر پر ناز کرتے رہیں گے کہ یہ ہماری زبان ہے اور اس کا سرچشمہ ہماری سرزمین سے پھوٹتا ہے ظاہر ہے کہ ہمیں اس فخر و ناز کا موقع حافظ صاحب کی علمی تحقیق سے حاصل ہوا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی روح پر اپنی ہزاروں رحمتیں نازل کرے۔

عبدالمجید سالک

لاہور
۱۹ ستمبر ۱۹۴۹ء

پنجاب میں اُردو

مُقدمہ

جب پرنسپل عبداللہ یوسف علی نے مجھ سے اُردو کے آغاز و قدامت کے موضوع پر لکھنے کے لیے ارشاد کیا تو میں نے ان سے عرض کی تھی کہ مضمون اگرچہ دلچسپ ہے لیکن اس پر ہماری موجودہ معلومات کی روشنی میں قلم اٹھانا قبل از وقت معلوم ہوتا ہے اور صحیح اطلاعات کی بہم رسانی کے لیے شاید ابھی ایک عرصہ درکار ہوگا"

اُردو کی قدامت

ہم اردو کے آغاز کو شاہجہاں یا اکبر کے دربار اور لشکرگاہوں کے ساتھ وابستہ کرنے کے عادی ہیں لیکن یہ زبان اس زمانہ سے بہت زیادہ قدیم ہے بلکہ میرے خیال میں ان کا وجود انہی ایام سے ماننا ہوگا جب سے مسلمان ہندوستان میں آباد ہیں اردو کی قدامت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ گجرات اور دکن میں اس زبان میں دسویں صدی کی ابتدا یعنی بابر کی آمد سے قبل سے ادبیات کا سلسلہ جاری ہوجاتا ہے اور فارسی لغات کی شہادت سے جو نویں صدی ہجری میں ہندوستان میں لکھی جاتی ہیں صاف واضح ہوتا ہے کہ اردو زبان ان ایام میں تمام اسلامی ہندوستان میں سمجھی جاتی تھی یہ لغات نگار اس کو ہندی کے نام سے یاد کرتے ہیں اور ہندی سے ان کا مقصد یہی زبان ہے جسے ہم اُردو کہتے ہیں ۔

بھاشا کا تعلق اُردو سے

ہم اردو کو برج بھاشا کی بیٹی سمجھتے رہے ہیں لیکن جب ان دونوں زبانوں کی صرف و نحو اور دوسرے خط و خال اور خصائص پر غور کیا جاتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے راستے مختلف ہیں اردو جہاں اپنے اسماء و افعال کو (الف) پر ختم کرتی ہے برج (واؤ) پر ختم کرتی ہے۔ برج میں جمع کا طریقہ بہت سادہ اور سہل ہے لیکن اردو میں بہت پیچیدہ ہے اردو میں مرکب افعال کا مع توابعات کے بہت رواج ہے بھاشا میں یہ بات موجود نہیں ہے اس لیے اُردو کو بھاشا سے کوئی تعلق نہیں۔ ان میں ماں بیٹی کا رشتہ نہیں ہے بلکہ بہنوں بہنوں کا۔

اُردو کا ارتقا کس زبان سے ہوا؟

کہا جاتا ہے کہ مغربی ہندی جس کی برج بھاشا۔ ہریانی راجستھانی۔ پنجابی اور اُردو شاخیں ہیں۔ قدیم پراکرت سورسینی کی یادگار ہے۔

لیکن جس زبان سے اُردو ارتقا پاتی ہے وہ نہ برج ہے نہ ہریانی اور نہ قنوجی ہے وہ زبان ہے جو صرف دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی ہمیں بہ تحقیق معلوم نہیں کہ جب مسلمان دہلی میں آباد ہوئے اس وقت علاقہ میں کیا زبان بولی جاتی تھی؟ آج دیکھا جاتا ہے کہ دہلی کے قریب ہی تین زبانوں یعنی ہریانوی۔ برج اور راجستھانی کا سنگم ہوتا ہے اور گریرسن نے تو صاف دہلی کو ہریانوی زبان کے علاقہ میں شامل کر دیا ہے مگر راقم کی رائے میں ہریانوی کوئی علیحدہ زبان کہلانے کی مستحق نہیں ہے بلکہ وہ پرانی اردو ہے یعنی وہی اُردو ہے جو گیارھویں صدی ہجری میں خود دہلی میں بھی بولی جاتی تھی اس میں اور اردو میں بہت کم فرق ہے۔ اگر ہم اس کو اردو نہ مانیں تو اردو کی شاخ ماننے میں تو ہمیں عذر نہیں ہونا چاہیے بہر حال یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ زبان اسلامی دور میں دہلی کے اثرات میں مبنی ہے

مسلمانوں کی آمد کے وقت دہلی کی زبان

اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ دہلی میں مسلمانوں کی آمد کے وقت کون سی زبان بولی جاتی تھی؟ یا وہ راجستھانی ہوگی یا برج؟

اس میں شک نہیں کہ آج دہلی۔ میرٹھ۔ مظفر نگر۔ سہارنپور یا دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ دوآبہ میں اردو بولی جاتی ہے لیکن اب سے تین صدی پیشتر اس علاقہ کی یہ زبان نہ تھی بلکہ یہاں برج کا طوطی بول رہا تھا۔ مغلوں کی آمد کے وقت گنگو ضلع سہارنپور میں شیخ عبد القدوس گنگوہی (متوفی ۹۴۵ھ) باوجودیکہ ایسے علاقہ سے تعلق رکھتے تھے جہاں اردو مادری زبان ہے لیکن وہ اپنے ہندی اشعار ایسی زبان میں لکھتے ہیں جو برج کے مماثل ہے۔ علی ہذا۔ مخدوم بہاء الدین برناوی برناوہ ضلع میرٹھ کے ہیں۔ لیکن ان کے ہندی اشعار قطعاً برج میں ہیں ان سے ظاہر ہے کہ دوآبہ میں برج زبان ہی مستعمل تھی اردو نے ان علاقوں سے رفتہ رفتہ برج کو خارج کر دیا ہے جس طرح ہریانہ کے علاقہ سے۔!

یہ بات ہمیں یاد رکھنی چاہیئے کہ امیر خسرو دہلی کی زبان دہلوی لکھتے ہیں ابوالفضل بھی آئین اکبری میں اس کو "دہلوی" کے نام سے یاد کرتا ہے اب شیخ باجن (متوفی ۹۱۲ھ) بھی اس کو دہلوی کہتے ہیں اور جو نمونہ اس زبان کا دیتے ہیں وہ قطعی اُردو ہے۔

اُردو دہلی میں کس طرح پہنچتی ہے؟ کیا پنجاب سے

اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے اور چونکہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں اسلئے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں!

اس نظریہ کے ثبوت میں اگرچہ ہمارے پاس کوئی قدیم شہادت یا سند نہیں لیکن سیاسی واقعات اردو زبان کی ساخت نیز دوسرے حالات ہیں اس عقیدے کے تسلیم کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔!

شہادت لسانی اور اُردو ملتانی پنجابی کی مماثلت

اس کے متعلق شہادت لسانی یہ بتلاتی ہے یا ہم دیکھتے ہیں کہ اردو اپنی صرف و نحو میں پنجابی و ملتانی زبان کے بہت قریب ہے دونوں میں اسماء افعال کے خاتمہ میں الف آتا ہے۔ دونوں میں

جمع کا طریقہ مشترک ہے یہاں تک کہ دونوں میں جمع کے جملوں میں نہ صرف جملوں کے اہم اجزا بلکہ ان کے توابعات و ملحقات پر بھی ایک ہی قاعدہ جاری ہے دونوں زبانیں تذکیر و تانیث کے قواعد افعال مرکبہ و توابع میں متحد ہیں پنجابی و اردو میں ساٹھ فیصدی سے زیادہ الفاظ مشترک ہیں۔

پنجابی اور اُردو کا اشتراک

آٹھویں اور نویں صدی ہجری کی کتب تاریخ و بغاوت کی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل ہندوستان لاکھ کو "لکھ" پاک کو "پگ" کھانڈ کو "کھنڈ" بھانڈ "بھنڈ"۔ ماٹ کو "مٹھ" آنب کو "انب" "مونگ کو "منگ" گاڑی کو گڈی" گڑیا کو گڈی" تالاب کو تل۔ بڑی جھیل کو ڈھنڈ" اور چقندر کو "گنگو یا گانگو" کہتے تھے۔ اہل پنجاب انہی الفاظ کو آج بھی "لکھ" "پگ۔ کھنڈ۔ بھنڈ۔ مٹھ۔ نب۔ منگ۔ گڈی۔ گڈا۔ ڈھنڈ اور گانگو بول رہے ہیں اس سے ظاہر ہے کہ اردو پنجابی زبانوں کا وہ عنصر جو قدیم سے ان میں مشترک تھا رفتہ رفتہ اردو زبان سے خارج ہوتا جا رہا ہے۔ ایسے افعال و الفاظ مثلاً آکھنا۔ ڈرھنا۔ انپڑنا۔ پچھاڑ۔ سنا۔ لانا (لگانا) کھڑنا۔ مرنا (جلنا) مانا (ڈالنا) لڑنا (ڈسنا) بندھنا (باندھنا) منگنا (مانگنا لینا (بھاگنا) کھیر (دودھ) نال۔ دل یائے مخلوط التلفظ" دیں" قسم کا امر "سی" قسم کا مستقبل وغیرہ جو آج صرف پنجابی میں رائج ہیں دکنی اور قدیم اردو میں عام طور پر مستعمل تھے۔

اسی طرح اردو کے محاورات" دن دہاڑے" "ہلنا جلنا" چھپ چھپانا" مانگنا تانگنا" بال وغیرہ میں اردو خوان ان کے جزو ثانی کو تابع مہمل کہنے کے عادی ہیں مگر پنجابی زبان میں یہ الفاظ با معنی ہیں اور آج بھی استعمال میں آرہے ہیں ادھر اردو کی حفاظت کا۔کے۔کی۔ اگرچہ فی زمانہ اردو کے ساتھ مخصوص ہے

پنجاب کے دیہات و قصبات نیز بعض دیگر اسما کے ساتھ اب بھی موجود ہے
الغرض یہ امور اردو اور پنجابی زبانوں کے اشتراک قدیم کے بین دلائل ہیں

پنجاب پر بیرونی و سیاسی اثرات علاوہ بریں پنجاب ۔ ہندوستان کی خوش قسمتی یا بد قسمتی کی کنجی بنا رہا ہے اور شمالی اطراف سے ہر زمانہ سے ہندوستان پر ہر عہد اور ہر زمانہ میں حملے ہوتے رہے ہیں چنانچہ مسلمان بھی شمال ہی کے راستے ہندوستان میں داخل ہوئے ان کی ابتدائی بستیاں سندھ اور ملتان میں قائم ہوتی ہیں ۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں صفاریوں اور سامانیوں کی بنا پر مغربی پنجاب اور سندھ میں ایرانی اثر فروغ پانے لگتا ہے۔

ملتان اور اس کے اطراف میں فارسی کا دور! حتیٰ کہ چوتھی صدی ہجری کے عرب سیاح لکھتے ہیں کہ ملتان و منصورہ میں فارسی بولی جاتی ہے یہ سیاح یہاں کے بعض شہروں اور دریاؤں کے نام فارسی طرز میں لکھتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایرانی تمدن کے اثرات ان اطراف میں بہت وسعت اختیار کر چکے تھے۔

پنجاب پر ایرانی تمدن کا اقتدار چوتھی صدی کے اواخر سے محمودی حملوں کا آغاز ہوتا ہے اور تمام پنجاب آل ناصر کے زیر اقتدار آجاتا ہے آل غزنہ کی حکومت تقریباً ایک سو ستر سال تک رہتی ہے ۔

غزنی دور میں مسلمانوں کی نئی زبان اگر آل غزنہ سے پیشتر مسلمانوں کو کسی ہندی زبان کے اختیار کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تو اس عہد میں جو خاصہ دراز ہے وہ پنجاب میں کوئی نہ کوئی زبان سرکاری ۔ تجارتی و معاشرتی اغراض سے اختیار کر لیتے ہیں جن کو غوریوں کے عہد میں ۔ جب دارالسلطنت لاہور سے دہلی چلا جاتا ہے اسلامی فوجیں اور دوسرے پیشہ ور اپنے ساتھ دہلی لے جاتے ہیں ۔

پنجاب کی نئی زبان کا مرکز دہلی میں منتقل ہوتا ہے

دہلی میں یہ زبان برج اور دوسری زبانوں سے دن رات کے باہمی تعلقات کی بنا پر وقتاً فوقتاً ترمیم قبول کرتی رہتی ہے اور رفتہ رفتہ اردو کی شکل میں تبدیل ہوتی جاتی ہے۔

پنجاب کا اردو کے ساتھ تعلق اسی بنا ختم نہیں ہو جاتا بلکہ بعد کے زمانہ میں بھی سیاسی اسباب اس تعلق میں تجدید پیدا کرتے ہیں تغلق آٹھویں صدی میں سید اور لودھی نویں صدی ہجری میں ایسے خاندان ہیں جو خاص دہلی سے نکل کر دہلی آتے ہیں ان کے لشکر پنجاب اور پنجابیوں سے تعلق رکھتے تھے اس لیے کوئی تعجب نہیں اگر ان نوواردوں نے دہلی کی زبان پر اثر ڈالا ہے۔

ساتویں صدی ہجری میں اس زبان کی حالت

ساتویں صدی ہجری میں وہ خصوصیات نظر آتی ہیں جو ایک طرف اس کو پنجابی سے اور دوسری طرف برج سے ممیز کرتی ہے۔ شیخ فریدالدین گنج شکر (متوفی ۶۶۴ھ) اور مادر مومناں کے درمیان اردو میں جو گفتگو ہوئی اس کے دو فقرے ہم تک پہنچے ہیں مادر مومناں نے کہا تھا "خوجا برہان الدین بالا ہے" شیخ نے جواب میں فرمایا "پونوں کا چاند بھی بالا ہے" آخر فقرہ میں "کا" "اور "ہوتا ہے" ایسے الفاظ ہیں جو اس جملہ کو پنجابی اور برج سے مختلف کر دیتے ہیں۔

آٹھویں صدی ہجری کا ایک اور فقرہ جو فیروز شاہ خلجی (۷۵۲ھ تا ۷۹۰ھ) کے حملہ سندھ سے تعلق رکھتا ہے تاریخ فیروز شاہی میں شمس سراج عفیف یوں نقل کرتے ہیں "برکت شیخ تھیا اک موا اک نہا۔"

دہلی سے اردو ہندوستان کے مختلف حصوں میں پہنچتی ہے

اسلامی سلطنت چونکہ دہلی پہنچ کر بہت جلد مرکزی حیثیت اختیار کر لیتی ہے اس لیے یہ زبان اسلامی لشکروں مہاجروں اور نوآبادکاروں کے ساتھ ہندوستان کے ہر گوشہ میں پہنچ جاتی ہے خلجی اس کو گجرات اور دکن پہنچاتے ہیں محمد تغلق جب آٹھویں

صدی ہجری میں دہلی کو اجاڑ کر دولت آباد کو آباد کرتا ہے تو یہ زبان دکن یعنی آباد کاروں کی زبان بن جاتی ہے گجرات و دکن میں دسویں صدی ہجری سے اس تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے گویا دکن اور گجرات اردو کے علیحدہ علیحدہ مرکز قائم ہو جاتے ہیں اہل گجرات اس کو نویں صدی ہجری میں "زبان دہلوی" کے نام سے یاد کرتے ہیں لیکن آنے والی صدی میں "گجری" یا گوجری" کہنے لگتے ہیں اسی طرح دکن میں پہلے پہل یہ زبان "زبان ہندوستان" کہلائی بعد کو دکنی کہنے لگے۔ اہل دہلی بارہویں صدی کے آخر سے اس کو "ریختہ" کہنے لگے جو دراصل موسیقی کی اصطلاح تھی۔ بعد میں کلام مخلوط بدو زبان کے معنی دینے لگے اور پھر نظم ہندی پر اس کا اطلاق ہونے لگا۔

اُردو کی ہر دلعزیزی | شاہان گجرات اردو میں بات چیت کیا کرتے تھے چنانچہ محمود شاہ بیگڑہ کا یہ فقرہ تاریخ میں محفوظ ہے "نیچا بیری سب کوئی جھوڑیے" بابر اسکی ہر دلعزیزی دیکھ کر اس میں ایک مصرعہ لکھتا ہے "مجکا نہ ہوا کچھ ہوس مانک موتی" اگر مغلوں کا حملہ ہندوستان میں سدراہ نہ بنتا تو اس میں شک نہیں کہ اردو بہت جلد فارسی کو ہٹا کر ہندوستان کی درباری زبان بن جاتی۔ فیروز شاہ تغلق کے بعد ایکدم سے فارسی پر زوال آتا ہے اور تغلق۔ سید اور پٹھان اردو ہی اختیار کر لیتے ہیں۔ محمد شاہ تغلق لفظ "کھڑا کھڑی" کے تلفظ کو اصلی دہلوی اور غیر دہلوی باشندوں کی شناخت کے لیے معیار مقرر کرتا ہے۔ سوریوں کو فارسی سے سخت دشمنی تھی اکبر کے عہد میں برہمنوں

۱؎ سلطان فیروز شاہ تغلق ۷۵۲ھ و ۷۹۰ھ نے اپنے عہد میں ایک لاکھ سے زیادہ غلام جمع کیے تھے جو زیادہ تر شرقی ہندوستان سے علاقہ رکھتے تھے فیروز شاہ کے جانشینوں کے عہد میں یہ لوگ اس قدر طاقتور ہو گئے تھے کہ سیاسی معاملات میں دخیل ہو کر ملک میں فتنہ و فساد برپا کرنے لگے ناصر الدین محمد شاہ ۷۹۲ھ و ۷۹۵ھ نے تنگ آ کر دہلی سے ان کا اخراج عام کر دیا اور حکم دیدیا کہ تین دن کے اندر اندر شہر خالی کر دیں اگر اس کے بعد (بقیہ صفحہ ۲۴ پر)

کے طفیل اردو میں سنسکرت کے الفاظ روشناس کیے گیے لیکن بعد کو بطریق متروک ہو گیا عالمگیر کے عہد سے دیکھا جاتا ہے کہ طبائع کا عام رجحان اردو کی طرف ہوتا جاتا ہے اگرچہ اس کے اسباب سے ہم ناواقف ہیں!

شمالی ہندوستان میں اردو کا مرکز شمالی ہندوستان میں دکن سے ایک صدی بعد تصنیفات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے مگر ابتدائی منازل میں اس کی رفتار بہت سست ہے۔ دہلی میں محمد شاہ تغلق میں اردو کا مرکز قائم ہونے سے پیشتر یہ زبان دہلی کے مضافات میں ادبی حیثیت اختیار کرتی ہے۔ شمالی ہند کے مصنفین میں سب سے پیشتر محمد افضل پانی پتی (یا جھنجھانوی) ہیں جو ۱۰۲۶ھ میں بعد جہانگیر وفات پاگئے ان کا بارہ ماسہ" بہت مشہور ہے۔ یہ تصنیف جس میں فارسی اثرات بہت نمایاں ہیں برج کے اثرات سے بھی خالی نہیں ہے۔!

ہریانوی زبان کا مرکز ادہر ہریانی زبان کے علاقہ میں اردو گیارہویں صدی ہجری میں (بعہد عالمگیر) اپنا قدم جما لیتی ہے۔ جھجھر کے محبوب عالم عرف شیخ جیون متعدد تصنیفات اس زبان میں یادگار چھوڑتے ہیں جن میں "دردنامہ محمد" سب سے اہم ہے ان کی دوسری تصنیفات "محشر نامہ" "خواب نامہ پیغمبر" "سرنامہ بی بی فاطمہ خاتون" کے نام ہم تک پہونچے ہیں۔ اس عہد میں عبدالواسع ہانسوی جو فارسی کی مشہور قواعد

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۳) نظر آئیں تو قتل کر دیئے جائیں اس سخت حکم کے باوجود اس جماعت کے متعدد ارکان دہلی میں مقیم رہے اور جب گرفتار ہوئے تو اپنے آپ کو دہلی کا اصلی باشندہ بیان کیا محمد شاہ نے اصلی دہلوی اور پوربی بنگالی کی شناخت کے لیے ان سے لفظ "کھڑا کھڑی" کہلوایا۔ چونکہ مشرقی ہند کے لوگ ہائے مخلوط التلفظ کے ادا کرنے میں عام ہندوستانیوں سے مختلف ہیں اسلیے یہ غلام دہلویوں سے آسانی کے ساتھ پہچان لیے گئے ہیں اور تلوار کے گھاٹ اتار دیے گئے۔

"دستورالعمل فارسی" کے مصنف ہیں بچوں کے لیے "نصاب سہ زبان" لکھتے ہیں جس میں ذریعہ تعلیم یہی زبان ہے۔

عہدِ عالمگیر کی ایک یادگار تحریک

عالمگیر کے عہد کی اہم خصوصیات یہ ہے کہ اس عہد سے کچھ عرصہ پیشتر ایک نئی تحریک وجود میں آتی ہے جس کے ماتحت بچوں کی تعلیم کا ذریعہ ہندی زبانیں بن جاتی ہیں عالمگیر کے عہد میں یہ تحریک عام ہو جاتی ہے اور بے شمار کتابیں بچوں کی تعلیم کے لیے لکھی جاتی ہیں جن میں اکثر و بیشتر منظوم ہوتی ہیں یہ سلسلہ ہندوستان کے اکثر صوبوں میں جاری ہو جاتا ہے مثلاً دہلی، دکن اور پنجاب۔

ہریانی زبان اور اس کی حالت

ہریانی زبان دراصل ایک قسم کی اردو ہے جو گیارہویں صدی ہجری میں شاید اردو سے اتنی مختلف نہیں تھی جس قدر کہ آج دیکھی جاتی ہے کیونکہ زمانہ مابعد میں جب کہ ہریانی اپنی اصلی حالت پر قائم رہی اردو میں دہلی کے محاورے اور شعراء کے تصرفات کی بنا پر کثیر تغیرات واقع ہوئے اور موجودہ اردو اسی اصلاح شدہ شکل کا نام ہے۔ ہریانہ علاقوں میں تصنیفات کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے لیکن اس کے ادبیات کے متعلق ہماری موجودہ معلومات بہت محدود ہیں حضرت شاہ غلام جیلانی رہتکی مصنف چہار کہار متوفی ۱۲۳۹ھ اور مولوی محمد رمضان مصنف "آخرگت" و بلبل باغ محمد ز ۱۲۲۶ھ اور انور روہتکی۔ (جو اسی صدی کے نصف دوم سے علاقہ رکھتے ہیں) کے نام اور تصنیفات سے پتہ چلتا ہے کہ محبوب عالم کی تحریک اس علاقہ میں برابر جاری رہی ہے۔

اگر ہریانہ کی قید کو اڑا دیا جائے تو اور مصنفین بھی اس فہرست میں جگہ پا سکتے ہیں مثلاً میر جعفر زٹلی۔ نارنولی جو عہد عالمگیر و فرخ سیر کے مشہور ہزال ہیں اور امام بخش تھانیسری مصنف معجزہ نبی جو بارہویں صدی کے بزرگ ہیں دلبر سوانی۔ جنہوں نے اپنا دیوان بہادر شاہ بادشاہ دہلی کی خدمت میں بھیجا تھا۔

پنجاب میں اُردو کا نیا مرکز | پنجاب میں اردو کا نیا مرکز قائم ہوتا ہے یہاں کے مصنفین میں سب سے مقدم مولانا عبدی ہیں جو سنہ ۱۰۷۶ھ میں بعہد عالمگیر فقہ ہندی تصنیف کرتے ہیں فقہ ہندی کی اردو بالکل پنجابی نما ہے اور جملوں کی بندش بھی بالکل پنجابی طرز کی ہے یہ تصنیف ہریاد۔ کرنال اور میوات کی زبان سے مختلف ہے۔ بارہویں صدی میں قصبہ بٹالہ (ضلع گورداسپور) میں اردو کا خاصا چرچا رہا ہے یہاں اردو کی تحریک شیخ محمد فاضل الدین بٹالوی (متوفی سنہ ۱۱۵۱ھ) کے مبارک ہاتھوں سے پروان چڑھتی ہے ان کے پیر بھائی شیخ نورالدین بھی اس میں حصہ لیتے ہیں۔ شیخ فاضل الدین کے فرزند شاہ غلام قادر (متوفی سنہ ۱۱۶۶ھ) اردو مثنوی موسوم بہ رمز العشق کے مصنف ہیں اور شاہ فقیر اللہ بھی اپنی اردو مثنوی سنہ ۱۲۰۴ھ میں اسکے تتبع میں لکھتے ہیں، بارہویں صدی کے نصف آخر میں پنجاب میں متعدد بزرگ ایسے نظر آتے ہیں جو اردو میں نظمیں لکھتے ہیں۔ شیخ محمد جان شیخ نصیر الدین محمد غوث بٹالوی۔ نامدار خاں دت۔ دلشاد پسروری (دلبر وری)، غلام قادر جلالپوریہ اور رام کشن کے نام اس ذیل میں پیش کیے جا سکتے ہیں بٹالہ کی تحریک کا اس عہد کی دہلی میں اردو کی تحریک سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگرچہ دونوں مرکز قریب قریب ایک ہی زمانے میں قائم ہوئے پنجاب میں اردو نظم کا زیادہ رواج رہا ہے اور نثر نسبتاً کم ملتی ہے تاہم نثر کے نمونے موجود ہیں مثلاً کتاب اسرار مسائل اور رسالہ "سلوتری" جن کے مصنفین کا سراغ تاحال نہیں مل سکتا ہے!

اردو کا آخری لیکن سب سے زبردست اور شاندار مرکز دہلی ہے جو ولی اورنگ آبادی کے اثرات میں قائم ہوتا ہے اور کچھ عرصہ کے بعد وہاں سے لکھنؤ اور لکھنؤ سے کلکتہ پہونچ کر عام ہو جاتا ہے

ہندی السنہ پر مسلمانوں کے احسانات | یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندی السنہ کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کے بارے میں بھی چند کلمات اضافہ کر دیئے جائیں۔ ایک ایسے زمانہ میں جب کہ مسلمانوں پر برادران وطن ہر قسم کے

الزامات و اتہامات عائد کرنے کے عادی ہو رہے ہیں ان کی تاریخ کو توڑ مروڑ کر مسخ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور ان کے احسانات کو جو انھوں نے ہندوستان پر کیے گلدستۂ طاق نسیاں بنایا جا رہا ہے یہ بیان کرنا بالکل بے موسم معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسلمان ہی ہیں جنھوں نے برادران وطن سے پیشتر ہندی زبانوں کی تہذیب و ترقی پر توجہ دی ہے اس ملک کے شمال و مغرب کی زبانوں یعنی پشتو۔ سندھی۔ کشمیری اور پنجابی کا قریب قریب تمام ادبی سرمایہ مسلمانوں کی کوششوں کا ممنون احسان ہے۔ بنگالی زبان اور اس کے ادبی سرمایہ کو فروغ دینے والے مسلمان ہیں برج قنوجی اور اودھی کی ترقی میں بھی مسلمانوں نے خاصا حصہ لیا ہے۔ کبیر، قطبن اور محمد جائسی تلسی داس اور سور داس سے پیشتر میدان میں آتے ہیں۔

اُردو املا اور رسم الخط آخر میں اردو املا کے متعلق چند الفاظ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ فارسی خط زمانہ قدیم سے ہندی اصوات اور ہندی السنہ کے لکھنے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ ابتدا میں خط نسخ نہ صرف اردو بلکہ ہندوستان کی تمام زبانوں کے لیے مخصوص تھا۔ چنانچہ پشتو۔ سندھی اور پنجابی آج بھی نسخ میں لکھی جاتی ہیں۔ عالمگیر کے بعد شمالی ہند میں نستعلیق رائج ہو گیا۔ خاص ہندی اصوات کے لیے علیحدہ علیحدہ علامات مقرر کی گئی ہیں اور مختلف زبانوں میں مختلف طریقوں سے لکھی جاتی ہیں مثلاً ٹ ٹھ۔ ڈ پر پہلے تین تین نقاط۔ بعد میں چار نقاط لگائے جانے لگے۔ گجرات میں بارہویں صدی ہجری کی ابتدا میں الف پر ضرب کی علامت "×" لگائی جاتی تھی اور الف ممدودہ "آ" الف کی شکل میں لکھا جاتا تھا... نویں صدی ہجری میں کاف کے نیچے تین نقطے لگائے جاتے تھے۔ بعد میں اوپر لگائے جانے لگے۔ ہائے مخلوط التلفظ کا استعمال بھی دیرینہ ہے۔ اردو کا آخری الف لاحقہ بتقلید فارسی "ہ" کی شکل میں لکھا جاتا تھا مثلاً اہسوڑہ۔ چونہ۔ سہرہ۔ سمجھہ۔ ہیرہ۔ اسی طرح ناوہ بنگالہ اور بنگانہ وغیرہ

عہد عالمگیر میں ایک ترمیم

عالمگیر کے عہد میں فضائل خاں کے عرض کرنے پر کہ ہندی رسم الخط میں اسم و کلمہ کے آخر میں "ہے" نہیں آیا کرتی بلکہ الف ہوتا ہے جیسے کانا کہا جاتا ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایسے الفاظ کو الف کے ساتھ لکھے جائیں عالمگیر نے یہ تجویز پسند کی اور حکم دیدیا کہ آئندہ ایسے کلمے الف کے ساتھ لکھے جائیں یعنی مالوہ کو مالوا۔ بنگالہ کو بنگالا وقس علیٰ ہذا اس فرمان کی تعمیل نہ صرف شاہی دفتر اور ٹکسالوں میں ہوئی بلکہ اردو خواں لوگوں نے بھی یہی املا اختیار کر لیا اور آئندہ لہسوڑا، چونا، سہرا، سمجھا اور ہیرا لکھا جانے لگا۔

الف لاحقہ کے استعمال پر اردو اور پنجابی کا اشتراک

الف لاحقہ اردو میں ایسا الف ہے جو اکثر خاتمہ کی غرض سے بڑھایا جاتا ہے اردو اور پنجابی اس الف پر اس قدر مصر ہیں کہ جہاں کہیں یہ حرف موجود نہیں ہے اصل کلمہ میں اضافہ کر دیا جاتا ہے حتیٰ کہ غیر زبانوں کے الفاظ پر بھی یہ عمل جاری ہوتا ہے مثلاً مرغ سے مرغا یہی حالت نیول۔ بھونر۔ کوٹل۔ اور بھوس کی ہے۔ جو نیولا بھونرا کوٹلا اور بھوسا بنا لیے گئے ہیں۔

اُردو

لفظ اردو ایران میں مغلوی عہد کی یادگار ہے اور منتصف قرن ششم میں فارسی زبان میں رائج ہو جاتا ہے۔ اس کے معنی امرا و سلاطین کی فرودگاہ یا کیمپ ہیں۔ تاریخوں میں سب سے پیشتر یہ لفظ جہانکشائے جوینی میں ملتا ہے جس سے دو اقتباس یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

"ہر سال کہ از قومے شخصے را برق رسد قبیلہ و خانہ او را از میان خیلہاں بیرون کنند تا مدت سہ سال در باردوے شہزادگان درنتوانند آمد" (صفحہ ۱۶۲ جلد اول) "تمامت پادشاہزادگان در خدمت و بندگی تا آں بیرون اردو سہ نوبت آفتاب را زانو زدند و باز ند اندرون اردو آمدند و مجلس لہو و طرب آراستند" (صفحہ ۱۴۰ جلد اول)

ہندوستان میں اس لفظ کا استعمال بابر کے عہد سے ہونے لگا ہے تزک بابری سے ذیل کی مثال ملاحظہ ہو۔

"در وقت رسیدن نزد با میان چادرہائے اردو ق مارا کہ عقب ماندہ بودے بلند مارا کہ خیال کردہ زود بر می گردند۔ باردوئے خود رسیدہ، ہیچ چیز تقید نشدہ کوچ می کنند" (صہ ۱۱۶ طبع ملک الکتاب)

مگر زبان کے معنی میں اس کا استعمال چنداں قدیم نہیں ہے اس کو رواج میں آئے ہوئے سوا سو سال کا عرصہ کم و بیش گذرتا ہے ادبیات میں سب سے پیشتر میر محمد عطا حسین خاں تحسین نے یہ نام اختیار کیا چنانچہ نو طرز مرصع تالیف ۱۲۱۳ھ کا فقرہ

"اور یہ جو کوئی حوصلہ سیکھنے زبان اردوئے معلیٰ کا رکھے گا سو مطالعہ اس گلدستہ نگارین سے ہوش اور شعور نحوائے کلام حاصل کرے۔"

میر امن نے بھی تحسین کی تقلید میں یہی نام رکھا چنانچہ باغ و بہار ۱۲۱۷ھ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

"حقیقت اردو زبان بزرگوں کے منہ سے یوں سنی ہے۔" (صفحہ ۴)

اس کے بعد یہ لفظ عام ہو گیا دریائے لطافت تصنیف ۱۲۲۲ھ میں میر انشاء اللہ خاں اور قدرت اپنے تذکرہ میں اسی نام سے یاد کرتے ہیں۔

انشاء کہتے ہیں

"بالجملہ زبان اردو مشتمل است بر چند زبان یعنی عربی و فارسی و ترکی و پنجابی و غیر آں۔" قدرت کہتا ہے۔

"کہ شعرا زبان دکنی را گذشتہ ریختہ را موافق اردوئے معلیٰ شاہجہاں آباد موزوں بکنید۔" مولوی اکرم علی اخوان الصفا اردو تالیف ۱۲۱۵ھ میں لکھتے ہیں

"رسالہ اخوان الصفا کہ انسان و بہائم کے مناظرہ میں ہے تو اس کا زبان اردو میں ترجمہ کر لیکن نہایت سلیس کہ الفاظ مغلق اس میں نہ ہو دیں۔"

غازی الدین حیدر والی اودھ کے دور میں محمد بخش مہجور نورتن کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں

"اگرچہ اس نالائق روخلائق نے سابق میں انشاء گلشن نوبہار غیرت گلزار ارم

انشائے چار چمن دل لگن پر از قصص دلفریب و فسانہائے عجیب بعبارت رنگین اور مضمون نو آئین زبان اردو میں تحریر اور تسطیر کی ہیں۔"

حاجی نعمت اللہ اپنی تفسیر سورۂ یوسف میں تحریر کرتے ہیں۔
غرض ان فائدوں کی امید پر بیچ لکھنے ترجمہ از روئے کتاب احسن القصص کے مشغول ہوا اور وجہ نزول اس سورت متبرکہ کے اور عجوبات اور لطائفات کو بیچ سمجھ ان کے آئے اپنی زبان روزمرہ میں جمع کی اور مقید زبان اردو کا ہوا۔" اس کی وجہ تسمیہ کے متعلق صاحب ظہیر الانشار لکھتے ہیں۔
"چوں بازار را از ترکی و فارسی اردو گویند ضرورت استعمال این زبان مرکب وجہ تسمیہ در بازار باضرورت ترشد خصوصاً در بازار خاص پادشاہی کہ بہ تعظیم نام بازار خاص اردوئے معلیٰ بود۔ لہذا نام مزد تازہ مرکب نیز اردوئے معلیٰ قرار یافت تا این کہ بانقراض از منہ آں تخصیص آداب شاہی باقی نماندآں التزام لفظ معلیٰ ہم نماند فقط اردو باقی ماند پس وجہ تسمیہ اردو ہمیں است واسم بامسمیٰ ریختہ است یعنی زبان عربی و فارسی دریں ریختہ اند۔"
(منقول از جلوۂ خضر)

میر امن کی بھی قریب یہی رائے ہے۔ کہتے ہیں۔
"آخر امیر تیمور نے جن کے گھرانے میں ابتک نام سلطنت کا چلا آرہا ہے ہندوستان لیا ان کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا اس واسطے شہر کا بازار اردو کہلایا۔ جب حضرت شاہجہاں صاحبقران ثانی نے قلعہ مبارک اور جامع مسجد اور شہر پناہ تعمیر کروایا۔ اور شہر کو اپنا دارالخلافت بنایا تب شاہجہاں آباد مشہور ہوا۔ اگرچہ دلی جدی ہے وہ پرانا شہر اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے۔ اور وہاں کے بازار کو اردوئے معلیٰ خطاب دیا۔" (صـــ)
سر سید احمد خاں بھی اپنی تصنیف آثار الصنادید میں انہی بزرگوں کے ہم آواز ہیں

"اور چونکہ یہ زبان خاص پادشاہی بازاروں میں مروج تھی اس واسطے اس کو زبان اردو کہا کرتے تھے اور بادشاہی امیر امرا اسی کو بولا کرتے تھے گویا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی یہی زبان تھی۔ ہوتے ہوتے خود اس زبان ہی کا نام اردو پڑ گیا۔"

مؤلف فرہنگ آصفیہ کہتے ہیں:-

"چونکہ اول اول اس کی شاہجہانی لشکر سے ابتدا ہوئی۔ لہٰذا اس کا نام بھی اردو پڑ گیا۔ قلعہ معلیٰ کے لاہوری دروازے کے سامنے اُردو بازار کے نام سے ایک بازار بھی آباد ہو گیا جو بلاقی بیگم کے کوچہ اور چاندنی چوک کی سڑک کے جنوبی پہلو پر واقع ہے۔"

ان بیانات میں قریب قریب اکثر اسناد اس امر پر متفق ہیں کہ دہلی کے اردو بازار کی بنا پر اس زبان کا نام زبان اُردو ٹھہرا۔ ان کا خیال ممکن ہے کہ صحیح ہو یہاں اردو بازار کے متعلق چند الفاظ کہنے ضروری ہیں اس میں شک نہیں کہ دہلی میں ایک بازار کا نام اردو بازار تھا جو ملحق لیکن اس کا پہلا نام لاہوری بازار تھا آثار الصنادید میں سید احمد خاں خونی دروازے کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں۔

"اور اسکے آگے بڑا بازار جس میں چاندنی چوک وغیرہ سب بازار شامل ہیں مگر اگلے زمانے میں یہ بازار لاہوری بازار کہلاتا تھا۔ یہ بازار قلعہ کے لاہوری دروازے سے فتحپوری تک ہے اس بازار کے پہلے حصے کو اردو بازار کہتے ہیں اور اسکے آگے جہاں ترپولیہ اور کوتوالی ہے وہ اسی کا نام سے مشہور ہے اور اسکے آگے چاندنی چوک کہلاتا ہے اور اسی کے آگے فتحپوری کا یہ بازار ہے چالیس گز کے عرض سے بیس گز ادھر اور بیس گز ادھر بیچ میں سرتاسر نہر جاری ہے اور گرد نہر کے

دو رستہ درخت لگے ہوئے ہیں صاحب سیر المنتشم اسی بازار کے بیان میں تحریر فرماتے ہیں۔

"غرض اس بازار میں دو طرف دکانیں گچ کی کرسی دار بہت موزوں وخوش قرینہ ہیں اور اس کے سقف بام پر بالا خانے یک منزلہ اور بیچ میں اسکے دو سڑکوں کو سنگ ریزہ و بجری سے ایسے پختہ و مصفا کیا ہے کہ آدمیوں کا منہ اور عمارت کا چہرہ اس میں مثل آئینہ کے دکھائی دیتا ہے۔ ہر روز اس پر آبپاشی ہوتی ہے۔ اہل گزر کی روح تازہ ہوتی ہے اور مابین دونوں سڑکوں کے نہر جاری ہے اور کنارے پر سڑک کے درخت ہیں ان کی ہیئت مجموعی جدول میں بین السطور کتاب نظر آتی ہے"۔ (صفحہ ۵۰۲)

لاہوری دروازے کی رعایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں اس بازار کا نام لاہوری بازار رکھا گیا بعد میں معسکر کی رعایت سے اردو بازار کہلانے لگا ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہ بازار ۱۸۵۷ء میں برباد کر دیا۔ چنانچہ مرزا غالب اردوئے معلی میں میر مہدی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"واہ رے حسن اعتقاد۔ ارے بندہ خدا اردو بازار نہ رہا اردو کہاں دلی کہاں واللہ اب شہر نہیں کیمپ ہے چھاؤنی ہے نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر۔" (صفحہ ۱۸۴ اکمل المطابع)

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:۔

"تم اردو کے مرزا قتیل بن گئے ہو اردو بازار میں نہر کے کنارے رہتے تھے رودنیل بن گئے ہو۔" (صفحہ ۱۸۴)

"تعجب ہے کہ اردو ایک بازار کا نام ہونے سے زبان کا نام اردو رکھ دیا گیا لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ کوئی قدیم نام نہیں ہے نہ قدما اس کا ذکر کرتے

ہیں یہ شعرا اس سے واقف ہیں تاریخوں میں اس کا ذکر آتا ہے اس کی قدامت کی تائید میں البتہ ایک بیان ملتا ہے جو حکیم شمس اللہ صاحب قادری نے اردوٗ قدیم میں دیا ہے۔ وہذا

"مویدالفضلا سے (جو فارسی کی ایک مستند لغت ہے اور بابر کی آمد سے ایک عرصہ پہلے سلطان ابراہیم کے عہد میں لکھی گئی) ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان میں اسلامی لشکرگاہیں اردو کہ اہل اردو کی زبان کہا کرتے تھے چنانچہ کتاب مذکورہ میں ایک مقام پر تحریر ہے۔

"در زبان اہل اردو خون خرابا گویند"

یہ بیان خیال کرتا ہوں حکیم صاحب ممدوح نے نول کشور کی مطبوعہ مویدالفضلا سے لیا ہے لیکن یہ نسخہ اگرچہ مالکان مطبع اس کو مصنف کا دستخطی بیان کرتے ہیں مصنف کے عہد سے بہت بعد کا نوشتہ ہے جب قلمی نسخوں سے اس کا مقابلہ کیا جاتا تھا تو اس میں سیکڑوں الفاظ ایسے ملتے ہیں جو قلمی نسخوں میں موجود نہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نول کشور نے کوئی ایسا نسخہ چھاپا ہے جس میں کسی غیر شخص نے بعد میں بہت کچھ اضافہ کر دیا ہے۔ مثلاً لفظ برہم کی تشریح میں وہ کہتا ہے۔

"فقیر گوید کہ ایں لغت را از مجو سے کہ در دین خود لغایت فاضل بود آزر دشیر نام داشت و در عہد محمد اکبر شاہ از کرمان بہندوستان آمدہ در تحقیق نمودم" (ص ۱۵۹)

اب یہ بیان صاحب مویدالفضلا کا نہیں ہو سکتا اس لیے کہ وہ اپنی تصنیف ۹۲۵ھ میں ختم کر چکا ہے اور یہ شخص اکبر کا ذکر ایسے الفاظ میں کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت زندہ نہیں تھا دوسرے یہ جملہ یعنی در زبان اہل اردو

خون خرابا گویند"۔ مجھ کو موید الفضلا کے قلمی نسخہ میں نہیں ملا۔ اور کوئی تعجب نہیں اگر مطبع نول کشور کے مصحح نے اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہو اردو سلاطین کے لشکر گاہوں کو کہتے تھے اس معنی میں مغلیہ عہد کے تمام مورخ اس لفظ کا استعمال کر رہے ہیں حتیٰ کہ اکبر کے بعض ایسے سکوں پر جو اثنائے سفر میں لگائے جاتے تھے اکثر اوقات "ضرب اردوئے ظفر قرین" ہوتا تھا اس کے بعض مسی سکوں پر ایک طرف "اردو ظفر قرین" اور دوسری طرف "ضرب الف فلوس" ہوتا تھا۔

جب ہم تحسین کے ہمعصروں کی تصنیفات دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ بزرگ اردو اور اردو معلیٰ کے نام تک سے روشناس نہیں۔ استعمال میں لانا کجا۔ وہ اس کو ہندی کے نام سے پکارتے ہیں یا ریختہ کے نام سے، چنانچہ میر جعفر زٹلی جن کا عہد عالمگیر سے لے کر فرخ سیر کے دور تک ہے۔ اس کو ہندی کے نام سے یاد کرتے ہیں وہ اپنی تصنیف زٹل نامہ کے خاتمہ میں جو شامل کلیات ہے۔ لکھتے ہیں۔

"اگرچہ سبھی کوڑہ کرکٹ است ہندی در ہندی زبان لٹ پٹ است

شاہ حاتم اپنے دیوان زادہ میں جو ۱۱۶۹ھ کی یادگار ہے اپنے متعلق لکھتے ہیں:

"در شعر فارسی پیرو صائب است و در ریختہ ولی را استاد می داند"

(از فہرست اسپرینگر صفحہ ۱۱۶)

میر اثر اپنی مثنوی میں جو فی زمانہ خواب وخیال کے نام سے مشہور ہے اور ۱۱۵۳ھ اسکی تاریخ تصنیف ہے لکھتے ہیں۔

"ایک تو ریختہ ہے سہل زباں دوسرے جب کہ ہو بشوخی بیاں

دیگر سے

فارسی سو ہیں ہندوی سو ہیں باقی و رشاد مثنوی سو ہیں۔ دیگر سے

ریختہ نے یہ تب شرف پایا جب کہ حضرت نے اس کو فرمایا

مرتبہ ریختہ کا اندر ہوا معتبر فارسی کے طور ہوا

میرزا سودا تنبیہ الغافلین میں حوالہ قلم کرتے ہیں۔

"او خدا عالم است این چند بیت ریختہ از قبیل قصیدہ و غزل بچہ سبب حسن قبول یافتہ است"

نثر کے علاوہ نظم میں بھی ریختہ ہی لکھتے ہیں۔ چنانچہ بعض امثال ؎

تو نے وہ سودا زبان ریختہ ایجاد کی
پڑھ کے اک عالم اٹھاتا ہے ترے اشعار فیض (صـ۳۲۷)

دیگر ؎

کہنے لگے ریختہ جو کوئی سودا کی طرح اس میں زمیں سے ہو تا لوح و قلم واہ واہ

دیگر ؎

ریختہ اور بھی دنیا میں رہے اے سودا جینے دیوے جو کبھوں کاوش دوراں مجکو

دیگر ؎

سخن کو ریختہ کے پوچھے تھا کوئی سودا پسند خاطر دلہا ہوا یہ فن مجھ سے

دیگر ؎

شعر ناموزوں سے تو بہتر ہے کہنا ریختہ کب کہا میں نقل کر مضمون کسی کا ریختہ
بے حیائی ہے یہ کہنا سن کے میرا ریختہ خون معنی تاریخ باد پیما ریختہ
ابروئے ریختہ از جوشش سودا ریختہ (صـ۳۵۶)

دیگر ؎

ریختہ کی جو وہ کہے ہے غزل لفظ و معنی میں کم ہے اسکے نغل (صـ۳۷)

یہی حالت میر تقی میر کی ہے میں ان کے کلیات سے ذیل کی بعض امثال یہاں حوالہ قلم کرتا ہوں :۔

؎ گفتگو ریختہ میں ہم سے نہ کر — یہ ہماری زبان ہے پیارے (ص ۱۳۱)

دیگر ؎

مضبوط کیسے کیسے کہے ریختے و لے — سمجھا نہ کوئی میری زبان اس دیار میں

دیگر ؎ ص ۲۴۵

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختے کے — بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے

قائم فرماتے ہیں ؎

قائم میں ریختہ کو دیا خلعت قبول — ورنہ یہ پیش اہل ہنر کیا کمال تھا

اور جرأت ؎

"کہو غزل اور اس انداز کی جرأت اب تو — ریختہ جیسے کہ اگلی تری مشہور ہوئی

سید غلام علی عشرت پدماوت اردو مصنفہ ۱۲۱۱ھ کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں۔

"انھوں نے قصہ راجن رتن سین اور پدمات کا کہ زبان پوبی میں تصنیف مولانا محمد جائسی کا ہے زبان ریختہ میں تصنیف کرنا شروع کیا۔"

شاہ عبدالقادر دہلوی اپنے ترجمہ قرآن پاک ۱۲۰۵ھ میں فرماتے ہیں۔

"اول یہ کہ اس جگہ ترجمہ لفظ بلفظ ضروری نہیں کیونکہ ہندی ترکیب عربی سے بہت بعید ہے۔ اگر بعینہ وہی ترکیب بند ہے تو معنی مفہوم نہ ہوں دوسرے یہ کہ اس میں زبان ریختہ نہیں بولی جاتی بلکہ ہندی تاکہ عوام کو بے تکلف دریافت ہو۔"

یہی نہیں بلکہ ریختہ اور ہندی کا استعمال میرامن کے دور کے بعد تک ہوتا رہا ہے۔ مولوی خرم علی نصیحت المسلمین تالیف ۱۲۳۸ھ میں لکھتے ہیں:۔

"بندہ خرم علی کے دل میں آیا کہ اس شرک کی برائی قرآن شریف سے ثابت کیجئے اور ہر آیت کا ترجمہ ہندی زبان میں صاف صاف بیان

کر دیجئے تاکہ ہر کو فائدہ عام ہو۔"

دسماع میں ایک رسالہ کا ترجمہ ۱۲۴۶ھ میں کیا گیا تھا۔ اس میں سے فقرہ ذیل ملاحظہ ہو۔

"لیکن عام اس کی فہمید سے عاجز تھے اس لیے ریختہ زبان میں اس کے ترجمہ کرنے کا اتفاق ہوا۔"

غالب فرماتے ہیں:۔

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میرؔ بھی تھا

دیگر۔ شیفتہ گلشن بے خار میں لکھتے ہیں۔

"تذکرہ ترتیب یافت مشتمل بر اشعار موزون فصاحت گستر و ریختہ گویان بلاغت طراز لغایت مختصر۔"

ریختہ کی وجہ تسمیہ میں ہمارے تذکرہ نگاروں نے حسب معمول عجیب عجیب خیال آرائیاں کی ہیں۔ منشی درگاپرشاد صاحب نادر خزینۃ العلوم میں کہتے ہیں۔

"ریختہ بمعنی گرے ہوئے کے ہیں پس جو زبان اصلیت سے گر جائے اس کو زبان ریختہ کہتے ہیں۔ چنانچہ فارسی زبان میں عربی کی لغت شامل ہوئے اسے زبان ریختہ فارسی کہتے ہیں۔ اسی طرح حسب تقریر بالا زبان ریختہ ہندی کو زبان اُردو سمجھتے ہیں (خزینۃ العلوم فی المتعلقات المنظوم صہ ۴۹ مفید عام لاہور ۱۸۷۹ء)

حضرت آزاد آب حیات میں فرماتے ہیں۔

"اس زبان کو ریختہ کہتے ہیں کیونکہ مختلف زبانوں نے اسے ریختہ کیا ہے جیسے دیوار کو اینٹ۔ مٹی۔ چونا۔ سفیدی وغیرہ پختہ کرتے ہیں یا یہ کہ ریختہ کے معنی ہیں گری پڑی پریشان چیز چونکہ اس میں الفاظ پریشان جمع

ہیں اس لیے اسے ریختہ کہتے ہیں۔"

صاحب جلوۂ خضر کا بیان ہے:۔

اس زبان کا نام ریختہ شاہجہاں کے وقت میں رکھا گیا چونکہ ریختہ گچ کو کہتے ہیں۔ پختگی کے لحاظ سے اس کو ریختہ کہنے لگے۔

ہمارے مخدوم حضرت سرخوش اعجاز سخن میں رقم فرماتے ہیں۔

اگرچہ لفظ ریختہ کے فارسی میں کئی معنی ہیں۔ مگر زبان کے متعلق میں فطرتاً اسے ٹوٹا پھوٹا یا شکستہ ہی مراد لی جا سکتی ہے۔"

ان بیانات میں ریختہ کے معنی گرے پڑے اور پریشان کے بتائے ہیں فارسی میں بے شک یہ معنی مستعمل ہیں۔ مثلاً شکست و ریخت لیکن یہاں یہ معنی قطعاً ناموزوں ہیں دوسرے معنی چونا۔ سفیدی کے دیئے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ریختہ تعمیرات کی اصطلاح کی ایک شکل ہے جس کا اطلاق عمارت پختہ و سنگین برخلاف عمارت گلیں و چوبیں پر ہوتا ہے اس لیے اس کا استعمال چونہ اور استرکاری وغیرہ پر بھی ہونے لگا ہے جس سے عمارت پختہ و مضبوط ہو جاتی ہے۔

شمس سراج عفیف اپنی تاریخ فیروز شاہی میں حصار فیروزہ کی آبادی کے بیان میں اس کی خندق کی تعمیر کے متعلق کہتے ہیں۔

"بعد ملازم مرتب شدن حصار خندق کا دیدند ایں چنیں کہ بعد از نہ خندق درباہر دو بازوی خندق ریختہ برآوردند و بالائے بازوہائے خندق کنگرہ بستند (صـــ ۱۲۶)

دوسرے مقام پہ یہی مورخ بیان کرتا ہے

"دریں پنج گردہ آبادانی از ہریک گردہ بگردہ بود خلائق بے علائق خانہا ریختہ کردہ برآوردہ " (صـــ ۱۳۵)

تیسرے مقام پر یہ لفظ یوں آیا ہے۔

"آں عمارت بصنعت کارگران اہل مہارت و بصارت از سنگ
گہر سنگ (یا گہر سل) یا چونہ ریختہ برآوردہ"۔ (ص ۱۱)

چوتھے موقع پر یہ فقرہ ملتا ہے۔ (اصطلاح معمار)

"الغرض در ہر محلے و مقامے کہ عمارت کردہ ہم از پختہ برآوردہ و از
جنس چوبینہ برائے نام نے مگر ہمیں تختہ ہائے در"۔ (ص ۲۲۱)

ان چاروں فقروں سے واضح ہوتا ہے کہ ریختہ کے معنی پکی تعمیر کے لیے گئے ہیں برخلاف کچی تعمیر کے جو مٹی یا لکڑی ہو یعنی ریختہ ایسی تعمیر ہے جو چونہ پتھر سے تیار ہو سودا ایک مقام پر کہتے ہیں۔

"ہر بیت لکھے ہے یہ غزل ایسی ہی مضبوط
سودا جوں ریختہ کے گھر پر کرے گچ"

دوسرے مقام پر کہتے ہیں۔

مظہر کا شعر فارسی اور ریختہ کے بیچ
سودا یقین جان کہ روڑا ہے باٹ کا
آگاہ فارسی تو کہیں اس کا ریختہ
واقف جو ریختہ کے ذرا ہوئے ٹھاٹ کا
سنکر وہ یہ کہے کہ نہیں ریختہ ہے یہ
اور ریختہ بھی تو فیروز شاہ کی لاٹ کا

لیکن زبان کے سلسلہ میں ریختہ کے یہ معنی بھی نامناسب ہیں۔

(مصدر ریختن) ہمیں یاد رہے کہ ریختن فارسی زبان میں متعدد معنی میں آتا ہے اور معنی سے قطع نظر وہ (۱) بنانے۔ ایجاد کرنے (۲) کسی چیز کو قالب میں ڈھالنے۔ نئی چیز بنانے اور (۳) موزوں کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔

مثال اول نظیری ؎

وائے گر از الماس بہر جان ما
تیغ ابرو رمح مژگاں ریختند

(دیگر) باقر کاشی ؎

شاہد از عہدہ غمہائے تو آیم بیروں — تنے از روئے بربزم دلے از خارہ کنم

مثال معنی دوم ؎

برائے ریختن توپ تازہ شدن تعین — بشاہراہ عقیدت نہ صلاق شد پایاں

(دیگر) نظیری ؎

ہر طرف رنگے بگل بسر رسد شد — قالب گبر و مسلماں ریختند

اس سے ریختہ گر نکلا ہے جو حروں کو ڈھالتا اور بناتا ہے۔ سعید اشرف ؎

خود بخود بادہ عیش از قدحم می ریزد — گوئیا جام مرا ریختہ گر ساختہ است

مثال معنی سوم ؎

مصرع زلف بتاں چوں بر زبان شانہ ریخت — موشگافاں را کلید دندانہ ریخت

یہی حالت مصرع ریختہ (معنی ریختہ گر) ہے اس کا اطلاق ایسے مصرع یا معنی پر ہوتا ہے جو بے تکلف اور تامل ذہن میں آجاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ مصرع موزوں و معنی موزوں کے معنی دیتا ہے۔ ملا طغرا ؎

دارم چو شانہ صبر تا روے دہر — چوں مصرع زلف مصرع ریختہ"

یہیں سے وہ محاورہ نکلتا ہے "فلاں ریختہ ایں کار است" یعنی اس کام کے لیے موزوں ہے۔ شغف ؎

مے سوزم و می گدازم دمے گریم — چوں شمع شغف ریختہ ایں کارم

آخری معنی کے اثرات میں ریختہ نے ساتویں قرن ہجری میں ہندوستان میں نئے معنی پیدا کر لیے۔ اسکی تفصیل یہ ہے کہ جب امیر خسرو دہلوی نے ایرانی اور ہندی موسیقی کے اتحاد سے ایک نئی چیز تیار کی اسکے لیے انھوں نے بعض نئی اصطلاحات مثلاً۔ قول۔ ترانہ۔ مردنی۔ صوت۔ بسیط۔ دو حرف۔ چہار اصول نقش فارسی اور غزل وغیرہ وضع کیں اسی سلسلہ میں انھوں نے ریختہ کی اصطلاح بھی وضع

کی۔اس اصطلاح سے موسیقی میں یہ مقصد قرار پایا کہ جو فارسی خیال ہندوی کے مطابق ہو اور جس میں دونوں زبان کے سرود ایک تال اور ایک راگ میں بندھے ہوں اس کو ریختہ کہتے ہیں۔ ریختہ کے لیے کسی پردہ کی قید نہیں ہے وہ ہر پردہ میں باندھی جاتی ہے۔میری اس اطلاع کا ماخذ کتاب چشتیہ ہے جو مخدوم حضرت علاءالدین ثانی برناوی نے ۱۰۶۵ھ میں تصنیف کی ہے اس کتاب کا اصل نسخہ بحالت تباہ راقم کو مل گیا ہے۔ مخدوم علاءالدین جانشین ہیں خاتم التارکین حضرت شیخ بہاءالدین برناوی متوفی ۱۰۳۸ھ کے جو فن موسیقی کے امیر خسرو کے بعد ہندوستان میں بےنظیر مانے جاتے ہیں۔ حتّٰی کہ راگ درپن میں فقیراللہ نے موسیقی دانوں میں سب سے پیشتر آپ ہی کا ذکر کیا ہے۔ مخدوم علاءالدین اپنے پیر و مرشد مخدوم بہاءالدین کی سند پر امیر خسرو کی خدمات موسیقی کے ذکر میں ریختہ کے متعلق کہتے ہیں۔

"اصلاح کہ دیگر آں کہ فارسی کہ با مضمون خیال ہندوی مطابق باشد والفاظ ہر دو زبان را در یک تال و یک راگ بربست نمودہ باشند و انضمام و اتصال دادہ سرایند آن را ریختہ گویند و ایں ریختہ را در کہ پردہ می بندند و ذوق و لذتے افزوں می دہد۔"

اس عبارت میں خیال کسی شرح کا محتاج نہیں کیونکہ اب بھی موسیقی میں اس کا رواج ہے۔ رہی فارسی اسکے لیے مخدوم علاءالدین فرماتے ہیں۔

در فارسی اصطلاح آں را نام نہند کہ یک بیت را با تانا تلی مقروں ساختہ بربست کنند"۔ گویا ریختہ کا اطلاق ایسے سرود پر ہوتا تھا جس میں ہندی اور فارسی اشعار یا مصرعے یا فقرے جو مضمون و تال اور راگ کے اعتبار سے متحد ہوتے تھے ترکیب دیدیے جاتے تھے اس کی مثال میں امیر خسرو کی وہ غزل بتائی جا سکتی ہے جس کا مطلع

ہے ؎

زحال مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں
جو تاب ہجراں ندارم ایجان لیو کہے لگائے چھتیاں

شیخ بہاء الدین بن حاجی معز الدین متوفی ۹۱۲ھ شیخ رحمت اللہ گجراتی کے مرید تھے۔ باجن تخلص تھا۔ اور فارسی و ہندی میں شعر کہتے تھے۔ انھوں نے اپنی ایک تالیف میں جو مریدوں کی ہدایت اور اپنے مرشد کے حالات میں لکھی ہے فقرات ذیل کو ریختہ کے نام سے یاد کیا ہے۔

یہ صوفی سر الٰہی	ایں مرتبہ وارد شاہی	یہ مظہر عین خدائی
دراں مجلس عین خدا باشد	آنجا عین شین خدا باشد	آنجا بارود رحمۃ اللہ
آنجا ساقی رسول اللہ	آنجا ہمہ اللہ باشد زغیر اللہ	

شیخ باجن اس سرود کو ریختہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ میں انھیں کی تصنیف سے ایک اور مثال دیتا ہوں۔

باجن یہ وہ روپ نہ ہوئے جو کوئی بکھانے — بکھانے آپ کو جیوں سب کوئی جانے۔
آں نردیست من وصف جمالش دانم — اس حدیث از دگراں پوچھ کہ من حیرانم
باش تا جاں بدود در سر آں یار لطیف — کہ بکارے بہ ازیں کار نیاید جانم"

شیخ جمالی عہد ہمایوں و شیرشاہ کے شاعر ہیں ان کے نام پر ریختہ مشہور ہے بعض تذکروں اور بیاضوں میں امیر خسرو کی طرف منسوب ہے ؎

. . . . . . ہر دو تیرا لگتا ہے — موتیا شد بر در تو ستا ہے
خوار شدم زار شدم لٹ گیا — در رہ عشق تو کمر تتا ہے
گرچہ بدم گفت رقیب کتن — اس کا کہا مت کرو یہ جھوٹا ہے
گاہ نگفتہ کہ جمالی تو بیند — نہم کرد کیا اپنا کرم ہوتا ہے

شیخ سعدی دورِ اکبری کے ایک بزرگ ہیں جن کو غلطی سے عوام شیخ سعدی شیرازی مانتے ہیں۔ ان کا ریختہ اکثر تذکرہ نویسوں نے نقل کیا ہے۔ میں صرف مقطع پر قناعت کرتا ہوں ؎

سعدی کہ گفتہ ریختہ در ریختہ دُر ریختہ   شیر و شکر آمیختہ ہم ریختہ ہم گیت ہے

گویا اس عہد تک ریختہ کے معنی گیت کے لیے جاتے تھے ہندی موسیقی کی سرپرستی چونکہ اکثر سلاطین و مشائخ نے کی ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ متعدد فارسی اصطلاحات اس میں داخل ہو گئی ہیں چنانچہ ریختہ بھی ہندی موسیقی میں موجود ہے۔ ہندی زبان میں ہم ریختہ کی سرگذشت سے اچھی طرح سے واقف نہیں ہیں تاہم اس قدر یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ ریختہ وضع ہونے سے عنقریب بعد ہی ہندی موسیقی میں پہونچ گیا حتیٰ کہ بعض ریختہ شاہ کبیر یا کبیر داس کی طرف منسوب ہیں۔ ہندی لغات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندی شعرا نے بحر مضارع مثمن اخرب مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن کا نام ریختہ رکھ دیا ہے جس کی مثال ذیل میں عرض ہے۔

سن لے بیٹھو درانی و نو لال کی بڑائی   سب لوک لاج ڈالے الفا ہیں دھو بھائی
بھو ریں ہی بن کئی جراجل بھرو کے کاج بھیا   پیچھے نموں اڑا چک آں موندے میرے نینا
ڈرپی میں ہائے کہہ کہہ تب بولے ٹیڈھے بینا   بھوں تو رہی اکیلی۔ دا سنگ گوال سینا
تب سینے بھو کر کے تاری مری بکائی   ہنس ہنس کے تہل ہم سے کر دے گو گھٹولی
یہ چھپ تہل سے کم کی اب کیسوں جائے بولی   نرکھے کبھی بدن کو کبھوں چھو دے چولی
میں تو سکچی ماری۔ داسوں کچھ نہ بولی   چن پہیاں میری ٹھلکی، گگری دھرن گرائی
انگنا کے بند ٹوٹے چندری شنڈ اک پھاری   ڈرلی کے نرکھوں لکھوں لگ بہیاں میرداری
یہ سب کچال دیکھیں تک ٹھاٹے پر کھ ماری   تا ہوں یہ نادم میر دلے کے سنا دے گاری
گھر جن ہیں میری والی جیا دہ کرے ہنسائی   کہوں کہے پیاری تو کیوں اکیلی آئی

کے گھر میں تیرے پت کی توموں بھی لڑائی   تو چل بچوں ہمارے کر موسوں ہمتر تائی

ابد ہنائے موزی توری، جوری بھلی بنائی

۴۲ د ۴۳

ناراں دا کی باتیں سن کے میں ات لی ئی   دیرج بہار

بعض وقت مصرع کے آخری رکن فاعلاتن میں سبب خفیف گرا کر فاعلن لے آتے ہیں۔ راس رتناولی میں ایسی متعدد مثالیں میری نظر سے گذری ہیں۔ قدیم زمانہ میں ریختہ صرف بحر مضارع ہی میں محدود نہ تھا بلکہ اور بحروں میں بھی لکھا جاتا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد ریختہ نے موسیقی سے نکل کر عمومیت حاصل کرلی اور اس کا اطلاق ایسے کلام منظوم پر ہونے لگا جس میں دو زبانوں کا اتحاد ہو چنانچہ شیخ باجن شیخ جمالی اور شیخ سعدی کے یہاں ریختہ کا یہی مفہوم ہے دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ریختہ ایسی نظم ہوتی تھی جس میں ہندی فارسی کے الفاظ یا فقرے متحد ہوتے تھے۔ یہاں ایک مثال بارھویں قرن ہجری کے ریختہ کی دی جاتی ہے جو خواجہ حافظ کی مشہور غزل تضمین ہے ریختہ ؎

سوکھ چین کے منڈل موں سبھ جا کرو پکارا   دل می رود ز دستم صاحبدلاں خدارا

انکھیاں نے جھڑ لگایا، رسوا کریں گی آخر   دردا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا

اے مرگ تک امن دے دل کی مرادلیں ہے   باشد کہ باز بینیم، آں یار آشنا را

دو دن کی زندگانی مت کر جفا کسی پر   نیکی بجائے یاراں، فرصت شمار یارا

تن من گیا ہے لوہو، لوہو گیا ہے پانی   دلبر کہ در کف او، موم است سنگ خارا

اکثر گناہ کر کے، اب ہو رہے ہیں تائب   اے شیخ پاک دامن، معذور دار ما را

اندر سرائے گلشن، بلبل پکارتی ہے   ہات الصبوح ہبوا یا ایہا السکارا

محتاج یک نظر کا دربار پہ کھڑا ہوں   ... سے تفقدے کن درویش بے نوا را

دنیا کا فکر مت کر، کہتا ہیں خواجہ حافظ   کیں کیمیائے ہستی، قاروں کند گدا را

میر تقی میر نے اپنے تذکرہ میں ریختہ کی چار قسمیں کی ہیں۔

(۱) یہ ہے کہ ایک مصرع ہندی ہو اور ایک مصرعہ فارسی جیسی کہ تضمین بالا۔

(۲) یہ کہ نصف مصرعہ ہندی نصف فارسی۔

(۳) یہ ہے کہ اس میں فارسی کا عنصر حرف و فعل کی صورت میں ہو۔

(۴) وہ ہے جس میں صرف کی ترکیبیں ہوں۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقسیم میر صاحب کی اپنی اپج ہے اور عام طور پر رائج نہیں ہے۔ ریختہ کی غزلوں میں یہ تقسیمیں مخلوط شکل میں عام طور پر ملتی ہیں۔

گیارہویں صدی میں ریختہ کا اطلاق بالعموم اردو نظم پہ ہونے لگا چنانچہ ذیل کی غزل بھی ریختہ ہے۔

جاناں رحم فرماؤ ناں یا مجہ بلا یا آؤ ناں
اپنا بھی کیا ترساؤ ناں یا مجہ بلا یا آؤ ناں

تیرے فراقوں میں دن رین لہو سیں ہیں آنجہوں نیں
کب لگ مہ برساؤ ناں، یا مجہ بلا یا آؤ ناں

کیتا کہوں نے ترس ایک یک گھڑی گذری برس
بیگی خبر کہلاؤ ناں، یا مجہ بلا یا آؤ ناں

پیاری شتابی کر دوں خون غریباں نہیں روا
مجہ جیو کوں بچاؤ نا، یا مجہ بلا یا آؤ ناں

ہے دل منیں یہ آرزو اک روز اپنے روبرو
اے جان من بتلاؤ نا، یا مجہ بلا یا آؤ ناں

حسن ہے دن چار کا جوں پھول ہے گلزار کا
آخر کو ہے کملاؤ ناں، یا مجہ بلا یا آؤ ناں

ساجن کرو کیتا گلا، اب وصل کا شربت پلا
تو جگر بہو کھاؤ ناں یا مجہ بلا یا آؤ ناں

اپنا نہ ہو بیباک توں آخر ہے مشت خاک توں
کچھ حق سیتی شرماؤ ناں یا مجہ بلا یا آؤ ناں

یہ دل جلے کا قول ہے ہر یہ سخن بے مول ہے
مطلب حقیقی پاؤ ناں یا مجہ بلا یا آؤ ناں

کہتا ہوں اب بہلا حرف رحمت جو کرتی ہوئے توکرہ
پیچھے عبث پچھتاؤ ناں یا مجہ بلا یا آؤ ناں

یاد رہے کہ اس عہد میں ریختہ نظم کے ساتھ مخصوص ہے اس کو نثر کے ساتھ یا زبان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ استاد ولی کے ہاں اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے

ذیل میں بعض حوالہ قلم ہیں۔

۱۔ ولی تجھ حسن کی تعریف میں جب ریختہ بولے — سُنے تو اس کی ن جان مول سحان جاں عجم آکر
۲۔ امید مجھ کو یو ہے ولی کیا عجب اگر — اس ریختہ کو سنکے ہوں گے معنی نگار بند"
۳۔ یو ریختہ ولی کا جا کر اسے سنا یو — رکھتا ہے فکر روشن جو انوری کی مانند"

اور سراج اورنگ آبادی سے

اے سراج اس منتخب دیوان کے سب ریختے — خامۂ مژگاں خوباں سے ہیں لائق صاد کے

میر تقی میر کے ہاں بھی بعض اوقات اس مفہوم میں آیا ہے۔ مثال

۱۔ پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ — مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں (ص۱۲۴)
۲۔ میر سر ہند ہی نہیں کچھ یہ ریختہ — ہے دھوم میرے شعر کی سارے دکن کے بیچ ص۱۹
۳۔ کچھ ہند ہی میں میر نہیں لوگ جیب چاک — ہے میرے ریختوں کا دوانا دکن تمام (ص۲۱۱)
۴۔ دوانہ ہو گیا تو میر آخر ریختہ کہہ کر — نہ کہتا تھا میں اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں ص۸۰
۵۔ رنگ کچھ ہے عشق کیا تھا ریختے کیا کیا میں نے کہے — رفتہ رفتہ ہندوستان سے شعر مرا ایران گیا (۲۷۰)

اشعار بالا سے ریختہ کے معنی شعر و سخن (ہندی) یا کلام منظوم کے لیے گئے ہیں ریختہ کہنا مرادف ہے سخن گفتن کا جب دہلی میں ولی کے اثرات میں اردو شاعری کا رواج ہوا تو ریختہ دکن سے یہی معنی ساتھ لایا ہے۔

اگرچہ شمال میں اُردو گو شعرا گیارہویں صدی ہجری میں موجود تھے۔ مثلاً محمد افضل جھنجھانوی متوفی ۱۰۳۵ھ اور جعفر زٹلی لیکن قدمائے اردو نے ریختہ گوئی کا سہرا دکن ہی کے سر باندھا ہے اکثر نے ولی کے تتبع میں شعر گوئی کی ہے چنانچہ شاہ حاتم اپنے لیے کہتے ہیں

"در شعر فارسی پیرو مرزا صائب است و در ریختہ ولی را استاد می داند"

میر تقی میر کہتے ہیں ؎

خوگر نہیں ہم یوں ہی کچھ ریختہ کہنے سے — معشوق جو اپنا تھا باشندہ دکن کا تھا ص۲۶۴

قائم کا بیان ہے ؂

قائمؔ میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ   اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی"

میر حسن کا قول ہے بدباید داست کہ ریختہ اول از زبان دکن رواج یافتہ"

کلیاتِ سودا کے بیان میں ان کے ایک شاگرد کا بیان ہے۔

بعد از انقضائے دورۂ فارسی گویاں نوبت بادشاہی ملک سخنوری ریختہ ہندی بہ ولی دکنی و نامی وآبرو وغیرہ رسید"

شاہ گلشن نے جو مشورہ ولی کو دیا ہے قدرت نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"شما را زبان دکنی را گذاشتہ ریختہ را موافق اردوئے معلیٰ شاہجہاں آباد موزوں بکنید۔"

ریختہ سے مراد اگرچہ ولی اور سراج کے ہاں نظم اُردو ہے لیکن دہلویوں نے بالآخر اس کو زبان اردو کے معنی دیدیے اور یہ معنی تدریجاً پیدا ہو گئے اس لیے کہ ان میں اردو زبان کا تمام تر سرمایہ نظم ہی میں تھا۔ جب نثر پیدا ہو گئی تو یہی اصطلاح اس پر ناطق آگئی اس طرح ریختہ تدریجاً اردو زبان کا نام ہو گیا۔

اردو کے نام ریختہ کے علاوہ اور بھی ہیں۔ مثلاً شیخ باجن متوفی ۹۱۲ھ اس کو زبان دہلوی کے نام سے یاد کرتے ہیں وہ کہتے ہیں "صفت دنیا بزبان دہلوی گفتہ" اس سرخی کے ذیل میں انھوں نے اشعار ذیل لکھے ہیں جو اُردو اشعار کا قدیم نمونہ مانے جا سکتے ہیں ؂

دوہرہ

یہ فتنی کیا کسے یہ ملتی ہے   جب ملتی ہے تب چھلتی ہے (بین اول)

اول آن چھل بہت چھلانے   آن جھوہری ہستی گمائے   آن رو کو بہت رلائے

یہ فتنی کیا کسے یہ ملتی ہے   جب ملتی ہے تب چھلتی ہے (بین دوم)

آج بہت کھیرے پالنے   جے اس بکلے دے ان چھالے   جے رہے اس تھے تالے
شے نہ جانے اس تھے پالے   جے اس کا رن پتنہ ترسنا   جے جکو لے تو اس نہ ٹھہا
یہ فتنی انکھوں پتا دے   جکو پاس انکھوں نہ آوے   جے اس کدہیں نہ بو رہیں
جے جکہ ملے تو بہی اس چہریا   جسے دیکھ اس تبہی کھا گے   یہ نیلیج ان ستہ لاگے (تخلص)
دیکھ باجن یہ تو جہوٹی   منہہ میٹھی چپٹ تیتھی   یہ اپلے الیسی وہ نیتھی
یہ فتنی کیا کیسے یہ ملتی ہے   جب ملتی ہے تب بہلی ہے

یہ اشعار میں نے ایسے نسخے سے لیے جو سخت غلط ہے اور بارھویں صدی کے خاتمہ کے قریب لکھا گیا ہے۔ باجن پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو کو زبان دہلوی کے نام سے یاد کیا ہے۔

ایک دلچسپ امر یہ ہے کہ جب اہالی دکن نے اردو کا نام دکنی رکھا۔ اہالی گجرات نے اس کا نام گجراتی یا گوجری رکھ دیا۔ لطف یہ ہے کہ خود ان ممالک کے باشندے اس کو ان ناموں سے پکارتے رہے ہیں۔ شیخ محمد خوب نے خوب ترنگ ۹۸۶ھ میں لکھی ہے اس تصنیف کی زبان گجراتی کے مقابلہ میں زیادہ تر اردو کے ذیل میں داخل ہے لیکن شیخ اس کو گجراتی بولتے ہیں۔ شعر

جیوں دل عرب عجم کی بات   سن بولی ، بولی گجرات

اسی طرح شاہ علی محمد جیو گام دھنی کی "جواہر اسرار اللہ" کو اس کا مرتب شیخ حبیب اللہ قریشی الاحمدی گوجری کہتا ہے چنانچہ دیباچہ میں لکھتا ہے۔

"در بیان توحید و اسرار بالفاظ گوجری بطریق نظم فرمودہ در یں مختصر آوردہ و جمع کردہ۔"

محمد امین نے اپنی مثنوی یوسف زلیخا بعہد عالمگیر ۱۱۰۹ھ میں نظم کی ہے باوجودیکہ وہ صاف دکنی اردو میں لکھ رہا ہے مگر وہ اسکی گوجری زبان کے نام سے یاد کرتا ہے

چنانچہ ؎

سو مطلب ہے اب یوابیں کا — کبھی گوجری سے یوسف زلیخا
ہر یک بہا گئے ہے قصہ فارسی کا — ایں اس کوں اتاری گوجری میں
کہ بوجھے ہر کدام اسکی حقیقت — بڑی ہے گوجری ہر یک یہ نعمت

دکنی

بالی دکن دکنی کہتے رہے اسکی متعدد امثال بہم پہونچائی جاسکتی ہیں لیکن میں صرف ایک مثال پر قناعت کرتا ہوں مثلاً شاہ ملک بیجاپوری رسالہ احکام الصلوٰۃ تالیف ۱۱۰۸ھ کے خاتمے میں کہتے ہیں ؎

"یوں مسلماں کوں دکھنی کیا اس سبب — فہم کر کے دل میں کریں یاد سب"

زبان ہندوستان

پرانے مغربی مصنفین کبھی اس کو لینگویج آف اندوستان یا ہندوستان اور بعد میں ہندوستانی کہنے لگے۔ ہمارے ہاں عام خیال یہ ہے کہ انگریزوں نے یہ نام دیا ہے لیکن امر واقع یہ ہے کہ خود ہمارے اسلاف اس کو زبان ہندوستان یا بولی ہندوستان کہتے رہے۔ مولانا وجہی کتب سب رس میں جو بقول مولوی عبدالحق صاحب ۱۰۴۵ھ کے عنقریب بعد تصنیف ہوئی ہے اردو کو "زبان ہندوستان" کہتے ہیں۔

"آغاز داستان۔ زبان ہندوستان۔ نقل۔ ایک شہر تھا۔ اس کا ناؤں سیستان"۔ (رسالہ اردو اورنگ آباد ص ۲۵ حصہ شمارہ دھم)

ہندی یا ہندوی

اردو کا سب سے قدیم نام ہندی یا ہندوی ہے اسکی ایک پرانی مثال وہ ہے جو حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق متوفی ۹۰۲ھ کے رسالہ خوش نغز میں ملتی ہے میراں جی فرماتے ہیں۔

ہیں عربی بول کیرے — اور فارسی بہوتیرے
یہ ہندی بولوں سب — اس ارتوں کے سبب
یہ بھاکا بھاسو بولی — پن اس کا بھاوت کھولی

جو گو ہگو پند پایا   تو ایسے بولی چلایا
ہے کوئی اچھیں خاصے   اس بیان کیرے پیاسے
دسے عربی بول نہ بھانے   نا فارسی پہچانے
یہ ان کو بچیں ہیت   سنت بوجھیں زیت
یہ دیکھت ہندی بول   پڑھنے ہیں نپ تول

(رسالہ اردو ۱۹۵ حصہ بست و ششم)

اُردو کا آغاز

سب سے پیشتر میں وہ آراء نقل کر دیتا ہوں جو ہمارے مصنفین نے اُردو کے آغاز اور قدامت کے متعلق دی ہیں۔ میر امن کا بیان ہے۔

"جب اکبر شاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قومیں قدردانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سنکر حضور میں آکر جمع ہوئیں لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سودا سلف [illegible] کرتے ایک زبان اردو کی مقرر ہوئی۔ (باغ و بہار)

سر سید کہتے ہیں۔

جبکہ شہاب الدین شاہجہاں بادشاہ ہوا اور اس نے انتظام سلطنت کا کیا اور سب ملکوں کے وکلا کے حاضر رہنے کا حکم دیا۔ اور دلی کو نئے سر سے آباد کیا اور قلعہ بنایا۔ اور شاہجہاں آباد اس کا نام رکھا اس وقت شہر میں تمام ملکوں کے لوگوں کا مجمع ہوا ہر ایک کی گفتار رفتار جدا تھی ہر ایک کا رنگ ڈھنگ نرالا تھا جب آپس میں معاملہ کرتے ناچار ایک لفظ اپنی زبان کا دو لفظ اسکی زبان کے تین لفظ دوسری کی زبان کے ملا کر بولتے اور سودا سلف لیتے۔ رفتہ رفتہ اس زبان نے ایسی ترکیب پائی کہ یہ خود بخود ایک نئی زبان ہو گئی۔

ظہیر الانشا کے مصنف کا قول ہے۔

"ہرگاہ سریر سلطنت از جہانگیر تحویل شدہ بنوبت شاہجہاں بادشاہ رسید اینجا کہ بسبب مصاحبت و معاشرت علمائے دین فی الجملہ خودداری و تشرع

غالب بود۔ اہل زبان ریختہ معجون مرکب بسبب آمد و رفت تاجران ہر دیار در بازار بضرورت خرید و فروخت در معاملات واد شد ضروری الاستعمال شد تا زبان یکے بفہم دیگرے در آید۔" (منقول از جلوۂ خضر)

امام بخش صہبائی رسالہ قواعد اردو میں فرماتے ہیں۔

"شاہجہاں آباد تیموریہ خاندان کے شاہجہان نے آباد کیا۔ اس وقت فارسی کے بعض الفاظ اور ہندی کے اکثر الفاظ میں کثرت استعمال کے سبب تبدل و تغیر واقع ہوا۔ اور اس خلاملا سے جو بولی مروج ہوئی اس کا نام اردو ٹھہرا۔" (ماخوذ از خزینۃ العلوم)

شمس العلماء محمد حسین آزاد کی رائے ہے۔

"مسلمان اب بھی یہیں کی زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے تھے اور اس زبان کو کس شوق اور محبت سے بولتے ہیں۔ شاید بہ نسبت ہندوؤں کے فارسی عربی لفظ ان کی زبان پر زیادہ آجاتے ہونگے۔ اور جتنا رہنا سہنا اور استقلال زیادہ ہوگیا اتنا ہی روز بروز فارسی ترکی نے ضعف اور یہاں کی زبان نے زور پکڑا ہوگا۔ رفتہ رفتہ شاہجہاں کے زمانہ میں کہ اقبال تیموریہ کا آفتاب عین اوج پر تھا۔ شہر اور شہر پناہ تعمیر ہوکر نئی دلی دارالخلافہ ہوئی۔ بادشاہ اور ارکان دولت زیادہ تر وہاں رہنے لگے اہل سیف۔ اہل قلم۔ اہل حرفہ اور تجار وغیرہ ملک ملک و شہر شہر کے آدمی یک جگہ جمع ہوئے۔ ترکی میں اردو بازار لشکر کو کہتے ہیں اردوئے شاہی اور دربار میں ملے جلے الفاظ زیادہ بولے جاتے تھے وہاں کی بولی کا نام اردو ہوگیا۔" (آب حیات صفحہ ۲۰ سنہ ۱۸۱۷ء)

یہ بیانات جو ہمارے تذکرہ نگار ایک دوسرے سے نقل کرتے ہیں حقیقت

سے بہت دور ہیں۔ ہمیں ان کو صرف بزرگوں کے تبرک کے طور تسلیم کرنا چاہیئے ورنہ کیا اکبر اور شاہجہاں سے دلی نہ تھی یا ہندو مسلمان نہ تھے۔ یا لوگ سودا سلف نہیں لیتے تھے۔ یا مختلف قومیں ایک ساتھ رہ سہہ کر کاروبار کرنا نہیں جانتی تھیں پھر اکبر یا شاہجہاں کے عہد کے ساتھ کیا خصوصیت ہے کہ اردو کی بنیاد رکھی جا رہے شاہجہاں نئی دلی کا قلعہ ۱۰۵۸ھ میں تیار کرتا ہے محمد افضل پانی پتی متوفی ۱۰۵۳ھ شاہجہاں کے آباد ہونے سے پہلے پہلے اپنا درد نامہ یا بارہ ماسہ اردو میں تصنیف کرتا ہے۔ دکن میں اردو ادبیات کا سلسلہ اکبر بادشاہ کی تخت نشینی سے پچاس سال قبل شروع ہو جاتا ہے اور یہ بزرگ ہیں کہ شاہجہاں آباد کے سنگ بنیاد کے ساتھ ساتھ اردو کی بنیاد ڈالی رہے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ بابر اپنے ترکی دیوان میں ایک شعر ایسا لکھ جاتا ہے جس کا ڈیڑھ مصرعہ اردو ہے وہ شعر یہ ہے۔

مج کا نہ ہوا کچھ ہوس مانک و موتی
فقرا ہلیغہ بس بولغوسید در پانی و روتی (گل رعنا)

اصل یہ ہے کہ اردو کی داغ بیل اسی دن سے پڑنی شروع ہو گئی ہے جس دن سے مسلمانوں نے ہندوستان میں آکر توطن اختیار کیا ہے۔ ہمارے مصنفین کا اور عموماً خیال یہ ہے کہ اردو برج بھاشا سے نکلی ہے۔ کوئی اسے برج کی بیٹی بتاتا ہے اور کوئی اسکے دودھ سے اسکی پرورش کرتا ہے۔ میں تمثیلاً بعض کے بیاضات یہاں حوالہ قلم کرتا ہوں

آزاد فرماتے ہیں۔

اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دنیا کے پردہ پر ہندوستان کے ساتھ آئی ہو اسکی عمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں

نہیں ہے اور برج کا سبزہ زار اس کا وطن ہے

حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری رسالہ تاج اردو کے قدیم نمبر میں یوں گویا ہیں:۔

مسلمانوں کے اثر سے برج بھاشا میں عربی فارسی الفاظ داخل ہونے لگے جس کے باعث اس میں تغیر شروع ہوا۔ جو روز بروز بڑھتا گیا اور ایک عرصہ کے بعد اردو زبان کی صورت اختیار کرلی۔

اس موقع پر ہمارے مورخ یہ امر فراموش کرجاتے ہیں کہ مسلمانوں کے تعلقات ہندوستان اور اہل ہند کے ساتھ پرتھی راج کی شکست اور فتح دہلی کے زمانہ سے شروع نہیں ہوتے بلکہ ان واقعات سے کئی صدی پیشتر سے ابتدا پاتے ہیں وہ عربوں کے فتح سندھ و ملتان اور غزنوی خاندان کی فتح پنجاب کو مطلق فراموش کرجاتے ہیں سندھ و ملتان پر مسلمان پہلی صدی سے قابض تھے۔ پنجاب پر ان کا قبضہ معزالدین محمد سام کی آمد سے ایک سو ستر سال پہلے سے تھا۔ سندھ و پنجاب میں ہندو مسلم اقوام سب سے پہلے ملی جلی ہیں۔ اس لیے انھیں اگر ایک عام زبان کی ضرورت ہوئی تو ان ممالک میں پیش آئی ہوگی اور اردو کو ان ممالک میں وجود میں آنا چاہیئے۔

عربوں نے جب ایران فتح کیا تو سیاسی اور سرکاری اغراض کے لیے ایران کی مختلف زبانوں سے ایک زبان کو چن لیا۔ یہ زبان مشرقی ایران میں بولی جاتی تھی اگرچہ ہم غلطی سے اس کو خطہ فارس کی طرف منسوب کیا کرتے ہیں۔ اسی طرح جب مسلمان سندھ و پنجاب پر قابض ہوگئے تو یہاں بھی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی اگر سندھ میں نہیں تو پنجاب میں یقیناً انھیں کوئی نہ کوئی زبان اختیار کرنی پڑتی ہوگی۔

جب ہم اردو کے ڈول اسکی ساخت اور وضع قطع کو دیکھتے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا ڈھنگ اور ہے اور برج بھاشا کا ڈھنگ اور ہے۔ دونوں کے قواعد و ضوابط و اصول مختلف ہیں۔ اردو برج بھاشا کے مقابلہ میں پنجابی بالخصوص

ملتانی سے مماثلت قریبہ رکھتی ہے۔ برج سے چند ترمیمیں قبول کر لینا یا الفاظ کا مستعار لینا دوسری بات ہے لیکن جہاں برج سے الفاظ مستعار لیے جاتے ہیں وہاں برج پر بھی اپنا اثر ڈالا ہے۔ اور برج پر کیا موقوف ہے ہندوستان کی دوسری زبانیں بھی اردو کے پرتو سے خالی نہیں۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیے اگرچہ اردو زبان بھی بین الاقوامی ضروریات کی بنا پر وجود میں آئی لیکن بہت جلد جمہور ہندوستان کے عام مسلمانوں کی زبان بن گئی۔ اس نے ستلج پار کر کے مسلمانوں کا دامن پکڑ لیا مسلمان سپاہی اہل بہر و علم، دستکار و پیشہ ور، مزدور و فقیر، درویش و مسافر کا ساتھ دیا۔ گجرات دکن بنگال بہار جہاں کہیں وہ گئے یہ ان کے ساتھ رہی اور ساتھ ہی بسی۔ ابتدا میں وہ عوام و غیر تعلیم یافتہ طبقہ کی زبان تھی آخر میں مشکل ہو کر بعزیزی دیکھ کر تعلیم یافتہ طبقے نے بھی اس کی طرف توجہ کی۔

پیشتر اس کے کہ ہم اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ بحث کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً مسلمانی عہد کے تاریخی واقعات پر بالخصوص جو دہلی اور پنجاب کے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہیں ایک نظر ڈالیں۔

پہلی صدی ہجری کے اواخر میں محمد بن قاسم کی فتوحات۔ سندھ اور ملتان کو اسلامی قلمرو میں شامل کر دیتی ہیں لیکن تیسری صدی سے صفاریوں کی فتوحات کی بنا پر ایرانی اثرات بھی پھیل جاتے ہیں ....

اس عہد کے سیاحوں کا بیان ہے کہ یہاں کے باشندے ہندو اور مسلمان عراقی لباس پہنتے تھے۔ ہندو بھی شلوار کا استعمال کرتے تھے اور داڑھیاں رکھتے تھے۔ صدی کے سیاح اصطخری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ملتان اور منصورہ کے باشندے فارسی اور سندھی دونوں زبانیں بولتے تھے۔ موجودہ بلوچستان کے ایک حصہ کا نام ایرانیوں نے توران رکھا تھا اس کے حاکم نشین شہر کا نام قصدار یا قزدار تھا

یہی شہر فارسی کی مشہور شاعرہ رابعہ بنت کعب القصداری کا جس نے استاد رودکی متوفی ۳۲۹ھ سے سبق حاصل کیے تھے وطن تھا۔ ایرانیوں نے دریائے ترم کے پاس ایک شہر کا نام کرمان اور گندھارا کا قندھار۔ ملتان کے ریگستان کو دشتِ قپچاق دریا سندھ کو جیحون، مہران اور سندھ رود، دریائے چناب کو چندر رود یا چندرود کہتے تھے مسعودی منصورہ کے قریب اس شہر کا نام دوشاب بتاتا ہے جو بظاہر کہ فارسی الاصل ہے بلکہ انہوں نے اپنے وطن کے پانچ دریاؤں کی یاد میں پانچ دریاؤں کے درمیانی علاقہ کا نام بھی پنجاب رکھ دیا تھا۔

اس کے برخلاف خود فارسی زبان میں بھی ایسے الفاظ ملتے ہیں جو اسی عہد میں فارسی پر ہندی اثرات کی گواہی دیتے ہیں مثلاً لفظ بت جو بدھ کی بگڑی شکل ہے یا کوتوال جو ٹھیٹ ہندی یعنی کوٹ وال بمعنی مالک قلعہ تھا۔ یہ الفاظ شاہنامہ فردوسی میں موجود ہے چنانچہ

چو آگاہ شد کوتوال حصار ‏ برآویخت با رستم نامدار

صاحب شرف نامہ لکھتے ہیں۔

"و از شیخ واحدی محقق است کہ لفظ ہندی است کہ بکثرت استعمال و فارسی مشہور شدہ۔"

ہیلاج کی بابت بھی صاحب شرف نامہ کی یہی رائے ہے وہ لکھتے ہیں۔

"این لفظ ہندی است کہ مستعمل در فارسی شدہ است۔"

اور لفظ بیلک کی تشریح میں لکھتے ہیں۔

"تیر شکاری دو شاخہ این لغت ہندی است کہ مستعمل در پارسی شدہ"

لکھن یعنی لنگھن (روزہ ہندواں) منوچہری کے ہاں ملتا ہے۔ بشل یعنی سیل ہندی ہے اور فرخی کے ہاں ملتا ہے ؎

بگوز شل افغانیاں دو پرہ دتیز
چو دستہ دستہ بہم تیرہائے بے سوفار

چندن فرخی اور منوچہری کے ہاں ملتا ہے جسے آجکل ہم صندل کہتے ہیں
برشگال (ورس گال) یعنی برسات کا موسم ہندی لفظ ہے۔ مسعود سعد سلمان
کے ہاں موجود ہے سہ

برشگال اے بہار ہندوستان اے نجات از بلائے تابستاں

ان چند امور سے جو میں نے اوپر درج کیے ہیں واضح ہوتا ہے کہ ہندی اور
ایرانی تمدن کا سنگم سندھ و ملتان میں غزنوی عہد سے پیشتر ہو چکا تھا۔

غزنوی دور میں سلطان محمود غزنوی ۳۸۹ھ ۴۲۱ھ نے ۴۱۳ھ میں لاہور کو
قبضہ کر کے پنجاب میں اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ اس شہر کا جس کا جدید نام محمود پور
رکھا گیا اپنے والی کا صدر مقام بنا دیا جس کے تحت فوج کی بڑی تعداد رہتی تھی
مفتوحہ علاقہ مختلف ضلعوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ مثلاً جالندھر جہلم۔ ملتان۔ سندھ
وغیرہ سپاہ میں زیادہ تر ترک افغان۔ خلج اور ہندی تھی۔ فوج کی تعداد کا اندازہ
اس سے ہو سکتا ہے کہ ابو نجم زریر شیبانی کے پاس جو سلطان ابراہیم غزنوی ۴۵۱ھ
تا ۴۹۲ھ کے عہد کا سپہ سالار ہند تھا۔ چالیس ہزار فوج تھی۔ اسکے ماتحتوں کی فوجیں
اس کے علاوہ ہیں۔ الغرض مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد محمود کے وقت ہی سے
پنجاب میں آباد ہو گئی تھی۔ غزنوی سلطنت اگرچہ ایران و خراسان میں سلجوقیوں
کے بڑھتے عروج کے سامنے اپنے مقبوضات یکے بعد دیگرے کھو رہی تھی۔ لیکن
ہندوستان میں ان کی طاقت ترقی پر تھی۔ ناسی سلطان مسعود شہید نے فتح کی
غزنوی عہد کے والیان ہند کے حالات اور کارناموں پر اگرچہ پردہ پڑا ہوا ہے
لیکن ابوالفرج رونی کے بیانات سے معلوم ہے کہ ابوالنجم زریر شیبانی کے کارناموں

نے سلطان محمود کے دور کا احیا کر دیا تھا وہ ایک طرف بانرسی (بنارس) دوسری طرف سومنات پر چھاپہ مارتا ہے تانیسر (تھانیسر) والوں کو مغلوب اور قنوج کو زیر کر چکا ہے جیرٹ پر اس کا قبضہ ہے اور چونکہ ایلکی والی دہلی نے جیرٹ کو تباہ کر دیا ہے وہ انتقاماً دہلی پر حملہ کی تیاریاں کر رہا ہے۔ یکایک سلطان ابراہیم غزنوی کی ہندوستان میں آمد نے اس کے ارادے کو معرض التوا میں ڈال دیا ہے۔ زریر جس کی تقصیرات کا ہمیں کوئی علم نہیں باغی اور غدار قرار دیا جاتا ہے اور ایک جنگ کے بعد گرفتار ہو کر قتل کر دیا جاتا ہے۔ ابوالنجم کا جانشین شاہزادہ سیف الدولہ محمود آگرہ فتح کرتا ہے۔ سلطان مسعود ثالث ۴۹۲ھ تا ۵۰۸ھ کے زمانہ میں سرستی غزنویوں کے مقبوضات میں داخل ہو جاتا ہے۔ ان امور سے ظاہر ہے کہ آل غزنہ کے مقبوضات . . . .

. . . . ہندوستان میں برابر وسیع ہوتے رہے۔

مسلمانوں کی یہ کثیر تعداد جو تجارت۔ فوجی و سرکاری خدمت کی غرض سے پنجاب میں ان ایام میں آباد تھی یہ پنجاب ہی کو اپنا وطن تصور کرنے لگی تھی۔ لاہور اس عہد کے مسلم ہندوستان کا مرکز بن گیا تھا۔ پنجاب ان کی نگاہ میں ایک فتح کردہ ملک نہیں تھا بلکہ وہ اس پر وطن کی حیثیت سے نظر ڈالنے لگے تھے۔ خواجہ سعد سلمان شاہزادہ مجدود کی خزانچی بن کر بعہد سلطنت مسعود شہید ہندوستان آئے ان کے فرزند خواجہ مسعود شاعر مشہور ہیں۔ یہ لاہور میں پیدا ہوئے یہاں نشوونما اور تعلیم و تربیت پائی وہ اپنے حبسیات کو لاہور کو مابرو وطن کے نام سے پکارتے ہیں چنانچہ سے

اے لاہور ویحک بے من چگونہ
بے آفتاب تاباں روشن چگونہ

تا این عزیز فرزند از تو جدا شدہ است
با درد و داد و نوحہ و شیون چگونہ

تو مرغزار بودی و من شیر مرغزار
با من چگونہ بودی بے من چگونہ

رسید عبد من از روئے عود و دلبر زد — چگونہ ہاشم بیروی آں بہشتی حور
چو یاد شہر مراد در دیار خویش کنم — مبادکس کہ شد از یار و شہر خویش نفور

ایک اور جگہ جب حبس سے رہائی کی امید منقطع ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں سہ

کار اطلاق من چو بستہ بماند — کہ ہمیں آبرو وشش بکشاید
مرمرا حاجتے ہمی باشد — وز دلم خار رشتے ہمی زاید
گلے باید از خدائے ندم — کہ از دبوئے بود ہوا باید
کہ ہمی زار زدے بو بادر — جان و دل ورستم ہمی ناید

لاہور کے سب سے پہلے شاعر ابو عبد اللہ روزبہ بن عبد اللہ النکتی اللہوری ہیں۔ جو مسعود شہید کے مداح ہیں۔ مسعود رازی سلطان محمود اور سلطان مسعود شہید کے عہد کا شاعر ہے۔ ذوالحجہ سنہ ۴۳۱ھ کے جشن مہرگان کے موقع پر اس نے سلطان مسعود کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا۔ جس میں سلجوقیوں کے بڑھتے اقتدار کی روک تھام کے لیے سلطان کو نصیحت کی تھی۔ یہ نصیحت[1] سلطان پر گراں گذری۔ شاعر سے ناراض ہوا اور سزا دہی کیلئے اسے ہندوستان بھجوا دیا۔ ۸ رجمادی الآخرہ سنہ ۴۳۱ھ کے جشن نوروز منانے وقت شاعر کے دوستوں نے اسکی سفارش کی۔ سلطان نے شاعر کا قصور معاف کر دیا اسکے قصیدہ پر تین سو دینار بطور صلہ دیئے اور ہزار دینار مشاہرہ بھی معاملات جہلم پر مقرر کر دیا لیکن حکم دیا کہ ہندوستان ہی میں رہے[2]۔ استاد ابو الفرج

مسعود رازی

ابو الفرج رونی

۱ مسعود رازی کے اشعار یہ ہیں سہ
مخالفان تو موراں بدند مار شدند — بر آر زود ز موراں مار گشتہ دمار
مدہ زمان شان زیں بیش و روزگار مبر — کہ اژدہا شود ار روزگار یابد مار (بیہقی ۶۴۴)

۲ مسعود جس کا تخلص مسعودی ہے ہندوستان میں بزمانہ امارت سیف الدولہ محمود سنہ ۴۲۹ھ کے قریب وفات پاتا ہے۔ ابو الفرج اس کا فرزند ایک قصیدہ میں سیف الدولہ محمود سے اپنے باپ کی تنخواہ پر تقرری کا ملتمس ہے سہ
گر زوجہ ہے کہ داشت مسعودی — کند آنرا ملک بداں بہیں

رونی اسی شاعر کا فرزند ہے۔ رونی منسوب ہے۔ رونہ کی طرف جو لاہور کا ایک موضع بیان کیا جاتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالفرج نے اپنی تمام عمر لاہور ہی میں گذاری ضرور تاایک آدھ مرتبہ اس نے غزنین کا سفر کیا۔ حتٰی کہ جو قصائد اس نے سلطان ابراہیم اور اس کے فرزند سلطان مسعود ثالث کی مدح میں لکھے ہیں ایسے موقع پر لکھے ہیں جب یہ سلاطین ہندوستان آئے ہیں۔

علماء میں سب سے مقدم شیخ اسمٰعیل لاہوری متوفی ۴۴۸ھ ہیں جو جامع علوم ظاہری و باطنی تھے۔ آپ سادات بخارا سے ہیں اور لاہور کے پہلے واعظ ۲۹۵ھ میں بخارا سے لاہور تشریف لائے اور یہیں آباد ہو گئے۔ آپ کی مجالس وعظ میں مخلوق کثرت سے جمع ہوتی تھی۔ ہندو ہزاروں کی تعداد میں وعظ سن کر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ آپکے پہلے جمعہ میں ڈھائی سو دوسرے جمعہ میں پانچسو پچاس اور تیسرے میں ایک ہزار ہندو مشرف بہ اسلام ہوئے۔

مشائخ کے سلسلہ میں ابی الحسن بن ابو عثمان الجلابی صاحب کشف المحجوب ہیں جو ۴۶۵ھ میں انتقال فرماتے ہیں اور لاہور میں مدفون ہیں۔ فی زمانہ داتا گنج بخش کے نام سے مشہور ہیں شاہ یوسف ایک بلند پایہ بزرگ ہیں اور ۵۵۰ھ میں وفات پاتے ہیں ان کے علاوہ شیخ فخر الدین حسین زنجانی لاہوری سید احمد توختہ ترمذی لاہوری سید یعقوب صدر دیوان زنجانی لاہوری کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہئیے یہ بزرگ قرن ششم ہجری کا سے تعلق رکھتے ہیں۔ خاندان غزنہ کے دو بادشاہ خسرو شاہ متوفی ۵۵۵ھ اور خسرو ملک متوفی ۵۸۲ھ لاہور ہی کو اپنا دار السلطنت بنایا۔

باوجود اس عہد کی تاریخ مفقود ہے ان چند ناموں سے جو اوپر درج ہیں یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ لاہور ان ایام میں ایک بارونق اسلامی شہر اور مرجع علم و فضل و ادب بن گیا تھا۔

آل غزنہ کی حکومت ہندوستان میں کم و بیش ایک سو ستر سال تک رہی ہے اس عرصہ میں مسلمان اور ہندو اقوام کی یکجائی سے ایک نئی زبان کا پیدا ہونا لازمی بات ہے۔ سرکاری ضروریات کی بنا پر بھی شاہی عہدیداروں اور ملازمین کیلئے اس ملک کی زبان سے واقف ہونا ضروری تھا۔ آخر غزنویوں کے قبضے میں تمام پنجاب سندھ اور ملتان تھا۔ ہانسی سرستی اور میرٹھ تک ان کے قبضہ میں تھے بلکہ یوں کہیے دہلی کے قریب تک پھیلے ہوئے تھے۔ اتنے بڑے علاقہ کے مالی و ملکی انتظام کیلئے عمال کو اس ملک کی زبان سیکھنی ضروری تھی۔ چونکہ لاہور ہندوستان کا دارالسلطنت تھا اس لیے کہ ظاہر ہے کہ اس خطہ کی زبان کو اس عہد کی حکومت اور مسلمانوں نے ترجیح دی ہوگی۔ یہ خیال کرنا کہ جب تک مسلمان پنجاب میں آباد رہے انھوں نے کسی ہندی زبان سے سروکار نہ رکھا اور جب پنجاب سے دہلی گئے تب برج بھاشا اختیار کی۔ ایک ناقابل قبول خیال ہے جو عقل و درایت کے منافی ہے اسلیے کہ ان کو نہ صرف سرکاری ضروریات کی بنا پر ایسی زبان کی ضرورت تھی بلکہ خود مسلمانوں کی اقوام کو بھی ایک دوسرے سے تبادلہ خیالات کے لیے اس کی ضرورت تھی۔ تعلیم یافتہ گروہ کے لیے یہ مشکل فارسی نے حل کر دی تھی لیکن ان کا غیر تعلیمیافتہ طبقہ جو کہ آبادی کا جزو اعظم تھا فارسی سے قطعاً نابلد تھا۔ یہ مسلمان چونکہ تازہ ولایت تھے۔ انھوں نے اس کا نام ہندی رکھ دیا۔ خود غزنویوں نے شروع ہی سے ہندی زبان کی طرف توجہ دی تھی ان میں ابوریحان محمد بن احمد البرونی قابل ذکر ہے جو ابتدا میں ابوالعباس مامون خوارزم شاہ کے دربار سے تعلق رکھتا تھا لیکن مامون کے قتل کے بعد ۴۰۸ھ میں سلطان محمود کے ہمراہ غزنین چلا گیا۔ بیرونی محمود کے غزوات میں شریک رہا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک عرصہ تک اس کا قیام لاہور اور ملتان میں رہا ہے۔ اس نے ہندی اور سنسکرت زبان سیکھی اور

ہندوؤں کے مذاہب اور علوم مثلاً ہیئت۔ نجوم و ریاضی۔ جغرافیہ و طبیعیات پر کماحقہ عبور حاصل کیا۔ عربی سے سنسکرت میں اور سنسکرت سے عربی میں متعدد کتابیں ترجمہ کیں۔ عربی میں جو ترجمہ کیں ان کے نام شکیا اور پتنجلی ہیں لیکن البیرونی کی سب سے مشہور کتاب تاریخ الہند ہے جو اہل ہند کے اس عہد کے علوم کی قاموس ہے۔

محمود کے زمانہ میں ہندی زبان کے ترجمانوں کی ایک جماعت غزنین میں مقیم تھی ان میں تلک ہندی اور بہرام کے نام ہم تک پہونچے ہیں۔ تلک دراصل ایک حجام تھا۔ ہندی اور فارسی زبانوں میں بخوبی عالم تھا۔ کشمیر میں تربیت پائی تھی۔ خط ہندی و فارسی نہایت اعلیٰ لکھتا تھا۔ ترجمانی سے ترقی کر کے ہندو افواج کے سپہ سالار (غزنین میں ہندوؤں کی فوج بھی رہا کرتی تھی) سندر کی وفات پر سلطان مسعود شہید نے اسے سپہ سالار بنا دیا۔ تلک نے بالآخر اس قدر عروج پایا کہ سلطان نے نیال تگین سپہ سالار ہند کی سرکوبی کے لیے جو باغی ہو گیا تھا تلک ہی کو مقرر کیا اور تلک نے ہندوستان آکر اور کئی شکستیں دیں کر نیال تگین کو قتل کر دیا۔

کوئی تعجب نہیں اگر سلطان محمود ہندی زبان سے کسی قدر آشنا ہو گیا ہو کہ جب ۴۱۳ھ کی مہم میں سلطان کالنجر پہونچتا ہے۔ نندا کالنجر کا راجہ سلطان کی مدح میں ہندی شعر لکھ کر بھیجتا ہے۔ سلطان فضلائے ہند و عرب کو یہ اشعار دکھاتا ہے اور سب ان اشعار کی توصیف کی رطب اللسان ہوتے ہیں۔ سلطان ان اشعار سے اس قدر خوش ہوتا ہے کہ صلہ میں نندہ کو پندرہ قلعوں کی حکومت کا پٹہ لکھ کر دیتا ہے جن میں کالنجر شامل تھا۔

بدقسمتی سے اس عہد کی تاریخ پر ایسا پردہ پڑا ہوا ہے کہ ہم ان ایام کے سیاسی حالات سے بخوبی واقف نہیں چہ جائے کہ معاشی اقتصادی اور ادبی پہلو کے حالات ملیں لیکن ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ پنجاب کے میدانوں میں مسلمان حملہ آور بہت

جلد سیاسی منافرت کے باوجود ہندوؤں کے ساتھ مل جل کر رہنے بسنے اور ان کے ساتھ اختلاط وارتباط قائم کرنے لگے ہیں۔

حکیم سنائی متوفی ۵۴۵ھ کے متعلق ہم اسی قدر جانتے ہیں کہ وہ صوفی شاعر ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان بھی آئے ہیں اور کسی قدر ہندی زبان سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ ایک شعر میں پانی کے لفظ کو اس طرح استعمال کر گئے ہیں گویا فارسی زبان کا لفظ ہے ؎

سنائی

نہ در آں معدہ غدود میدہ ۔ نہ در آں دیدۂ قطرۂ پانی

عثمان مختاری غزنوی بھی ہندوستان آئے ہیں۔ انھوں نے والی سندھ اور محمود دوبارہ والی ہند کی مدح میں قصائد لکھے ہیں۔ ایک موقع پر بازار سے ایک غلام خریدتے ہیں اس کے ذکر میں ایک شعر میں دو ہندی لفظ باندھ گئے ہیں۔ اس قصیدہ کا مطلع ہے ؎

عثمان مختاری

یکے غلامکے ہندی خرید از بازار ۔ بدان بہا کہ زگفتار آنم آید عار

دوسرا شعر یہ ہے ؎

زمن بدید بہ بادسے بجنۃ گفتے چوں ۔ مگس بدید بیعہ برمن نشستہ گفتے مار

اس شعر میں چوں اور مار دونوں ہندی لفظ ہیں۔

لیکن یہ خواجہ مسعود سعد سلمان ہیں جن کے متعلق متقدمین و متاخرین متفقاً کہتے ہیں کہ وہ ہندی میں بھی صاحب دیوان تھے مجھ کو ان کی ہندی شعر گوئی کے متعلق شبہ تھا کیونکہ جہاں وہ اپنی فارسی و عربی زبان دانی پر اپنے قصائد میں فخر کرتے ہیں وہاں ہندی کا ذکر نہیں کرتے مثلاً ؎

خواجہ مسعود سعد سلمان

مرا بد آں تو کہ در پارسی و در تازی ۔ بنظم و نثر ندارد دو چون کس استقلال

دوسرے موقع پر گویا ہیں ؎

کس از بپارسی و تازی امتحان زوئے | مرا مبارز میدان امتحان شدے

تیسرے موقع پر کہا ہے ؎

بریں ہر دو زبان دہر دو میدان | بگرد و نم رسیدہ کامرانی
سخن در آرزو بہ پیش خاطر من | روان زود کی دام بانی

لیکن جہاں محمد عوفی کہتا ہے

"دار را سہ دیوان ست یکے بتازی و یکے بپارسی و یکے بہندی"
"لباب الالباب محمد عوفی صہ ۲۴۶ جلد دوم"

عوفی کے ساتھ امیر خسرو فرماتے ہیں :-

در پیش ازیں از شاہان سخن کسے را سہ دیوان بنود مگر مرا کہ خسرو ممالک کلامم مسعود سعد سلمان را اگرچہ است آما آں سہ دیوان در عبارت فارسی و ہندی است در پارسی مجرد کسے سخن را سہ قسم نکردہ جز من کہ دریں کار قسام دعا و لم (دیباچہ غرۃ الکمال صہ ۲۶)

اس لیے ہمیں تسلیم کرنا چاہیئے کہ خواجہ ہندی میں بھی شعر کہتے تھے مگر بدقسمتی سے ان کا کلام دستبرد زمانہ کے ہاتھوں شاید ہمیشہ کے لیے دستبرد نہ ہو گیا خواجہ سعد سلمان برابر ساٹھ سال تک ہندوستان میں رہے ہیں۔ خواجہ مسعود یہیں پیدا ہوئے اور یہیں رہے۔ مسعود ثالث کے عہد میں مقطع جالندھر تھے قصہ ارمیں بھی رہے۔ لاہور ان کا وطن ہے اور جس محبت کے ساتھ وہ اس کا ذکر کرتے ہیں ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے جو اس سے پیشتر نقل ہو چکے ہیں اس لیے اگر انھوں نے اپنے وطن کی زبان میں اشعار لکھے ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے خواجہ کے دیوان فارسی میں بعض باتیں ایسی موجود ہیں جن کو ہندوستان کا پرتو مانا جاتا ہے
(۱) فارسی زبان میں بارہ ماسہ کی صنف کی نظموں کا رواج نہیں ہے۔ اور

نہ سنسکرت میں ایسی نظمیں موجود ہیں۔ ادہر ادہر پنجابی اور ہندی میں اب سے بیس سال قبل تک بارہ ماسوں کا بکثرت رواج تھا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ خواجہ نے دوازدہ ماہہ لکھنے میں جسے غزلیات مشہوریہ کے نام سے یاد کرتے ہیں پنجابی کی تقلید کی ہے۔ یا بارہ ماسہ خود ان ہی کی ایجاد ہیں۔ ہندی میں سب سے قدیم بارہ ماسہ ہے جو کبیر کی طرف منسوب ہے۔ ہندی کے بارہ ماسوں میں ایک ہجراں دیدہ عورت کی کہانی دی جاتی ہے جو خود اپنے فراق کی داستان الم حسرتناک الفاظ میں سناتی ہے خواجہ مسعود کے یہاں دوازدہ ماہہ صرف مدحیہ ہے اور مہینے کی خوشگواری کا ذکر کرکے شراب کی دعوت دی جاتی تھی۔ اس مشہوریہ میں ان کا ممدوح شاہ ارسلان بن مسعود متوفی ۵۱۲ھ ہے۔

۲۔ دوازدہ ماہہ کے ساتھ غزلیات ایامیہ اور غزلیات اسبوعیہ کا ذکر بھی مناسب ہے۔ غزلیات ایامیہ میں ہر غزل فارسی ماہ کے دنوں کے نام پر لکھی گئی ہے اور باستثنا ارسلان بن مسعود کی مدح میں ہے۔ غزلیات اسبوعیہ ہفتہ کے دنوں کے نام پر ہیں اور حسب معمول ارسلان کی مدح میں ہیں۔

۳۔ انھوں نے قطعات شہرآشوب بھی لکھے ہیں جن میں پیشہ وروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ امیر خسرو نے بھی شہرآشوب لکھا ہے۔ سنا جاتا ہے کہ سنسکرت میں بھی اس قسم کی نظمیں ہوتی ہیں۔

اس قسم کی نظمیں فارسی ادبیات میں موجود نہیں ہیں اور خواجہ مسعود ان امور میں تمام شعرائے ایران سے منفرد ہیں کیا اس کو ہندوستان کا اثر تسلیم کیا جائے یا خواجہ کی ایجاد مانا جائے۔ خواجہ نے ایک شعر میں ایک ہندی محاورہ بھی استعمال کیا ہے ؎

چو رعد زاہر بغرید کوس محمودی   برآمد از پس دیوار حصن مارامار

سلطان معزالدین محمد بن سام ۵۸۲ھ میں لاہور فتح کرتا ہے اور آل ناصر کا آخری
تاجدار خسرو ملک قید ہو کر سلطان غیاث الدین کے پاس غور پہونچا دیا جاتا ہے۔
فاتح دہلی کی سمت بغرض تسخیر نگاہ ڈالتا ہے۔ نرائن کی جنگ میں راے پتھورا کی شکست کے
بعد مسلمانوں کا قبضہ اجمیر پر ہوتا ہے۔ قطب الدین ایبک ۵۸۹ھ میں دہلی اور میرٹھ
پر قابض ہوتا ہے۔ دہلی کے قبضہ کے بعد پایۂ تخت لاہور و کہرام سے تبدیل ہو کر دہلی
آجاتا ہے جس طرح ہماری یاد داشت میں انگریزی حکومت نے اپنا دار السلطنت
کلکتہ سے دہلی تبدیل کر لیا۔ یہی صورت اس وقت بھی پیش آئی لیکن اسکی اس تبدیلی
میں بے حد فرق ہے۔ آج صرف اسی قدر ہوا ہے کہ وائسرائے ہند کلکتہ کے بجائے
دہلی رہنے لگے اور نئی عمارات ان دفتروں کے لیے بنا دی گئیں۔ لیکن ان ایام
میں اس تبدیلی کا مطلب یہ تھا کہ لاکھوں انسان پنجاب سے ہجرت کر کے دہلی اور
اس کے نواح میں آباد ہو گئے تمام فوج اور اہل دیوان مع ان کے متعلقین اور
قبائل کے ہجرت کر کے چلے آئے۔ ہمیں اس عہد کی معاشرت کا یہ پہلو یاد رکھنا چاہیے
کہ انسان مختلف قبائل میں منقسم تھے۔ حکومت کا تعلق براہ راست قبیلہ سے نہیں ہوتا
تھا بلکہ قبیلہ کے رئیس کے ساتھ رئیس قبیلہ کی حرمت و وقعت قبیلہ کے ارکان کی تعداد
اور وجاہت پر منحصر ہوتی تھی۔ ایک قبیلہ جس قدر طاقتور ہے اسکے مطابق اسکے سردار
کی حیثیت ہے۔ حکومت اپنی فوجیں انہی قبیلوں سے بھرتی کرتی تھی اور قبیلہ کا سردار
ہی اکثر ان کا افسر ہوا کرتا تھا۔ سلطنت غزنین کی فوجیں میں زیادہ عنصر ترکوں خلجیوں
افغانوں اور ہندوؤں کا تھا۔ لمغان کی وادیوں میں جیپال کی شکست کے بعد خلج
اور افغان قومیں جو افغانستان کے پہاڑوں میں آباد تھیں ناصر الدین سبکتگین کی متبع
ہوئیں اور کثیر تعداد میں اسکی فوج میں بھرتی ہو گئیں۔ خلجی ان ایام میں افغانوں
سے زیادہ طاقتور تھے۔ اور افغانستان کی ہمسائیگی میں آباد تھے۔ ان کی اصل ترک

ہے۔ غلاموں کے عہد میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم ساری کی ساری ہندوستان کی طرف ہجرت کر آتی ہے اور مختلف مقامات میں آباد ہو جاتی ہے۔ پرانے زمانے میں غلجی پور نام کے بیسیوں قصبے اور موضع نظر آتے ہیں۔ قیاس میں آتا ہے کہ اسی قوم کے آباد کردہ ہوں گے یہی لوگ بہار و بنگال فتح کرتے ہیں جہاں ایک علیحدہ سلطنت کی بنیاد ڈالتے ہیں۔ بنگالہ میں ان کی سلطنت اگرچہ دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔ لیکن سیاسی لحاظ سے وہ اس قدر طاقتور تھے کہ غلاموں کے بعد تخت ہندوستان کے یہی وارث بنتے ہیں اور مالوہ میں علیحدہ سلطنت قائم کرتے ہیں اس کے بعد ان کے اصلی وطن افغانستان میں غلجیوں کا نام نہیں سنا جاتا غلجی کس زمانہ میں اسلام لائے تاریخ اس بارہ میں خاموش ہے۔

افغانستان ہندوستان کے مغربی پہاڑوں میں دریائے سندھ تک آباد تھے افغان البیرونی ایک مقام پر ان کو افغانوں کے نام سے یاد کرتا ہے۔ دوسرے مقام پر ہندو لکھتا ہے ابوالفرج رونی افغانوں اور جاٹوں کو مشرک کہہ رہا ہے اس سے ظاہر ہے افغان ان ایام میں تابع اسلام نہیں تھے۔ سیاسی اعتبار سے افغان ہر زمانہ میں اہمیت رکھتے تھے۔ سلطان محمود نے دو مرتبہ ان کی گوشمالی کی ہے مسعود شہید نے ان کے خلاف فوج بھیجی ہے۔ مسعود ثالث نے بھی ان کو سزا دی ہے لیکن ہندوستان میں اگرچہ فوجوں میں ہمیشہ بھرتی ہوتے تھے۔ تغلقوں کے عہد میں وقعت حاصل کرتے تھے۔ اگرچہ غلجیوں کی طرح افغان بڑی تعداد میں ہندوستان کی طرف ہجرت نہیں کرتے تاہم ایک معتدبہ تعداد ان کی ہر زمانہ میں یہاں موجود رہتی ہے۔ دہلی سے چار کوس کے فاصلہ پر افغان پور ایک قصبہ تھا جو غلاموں کے زمانہ میں آباد ہوا تھا اور اس میں افغان ہی آباد تھے۔

خطۂ پنجاب کے باشندے اپنے قد و قامت اور طبعی جرأت کی بنا پر فوجی

خدمات کیلئے بہت مناسب و موزوں ہیں۔ اس لیے سلطان محمود نے جو فوج ہندوستان سے انتخاب کی وہ تمام پنجابی تھی۔ اسکے جانشین بھی پنجابی فوجیں رکھتے تھے جب دہلی کی طرف مہاجرت ہوئی تھی تو ایک بڑی تعداد پنجابیوں کی بھی تھی۔ انہی ایام میں ملتانی لوگ بھی جوق در جوق آباد ہو گئے ہیں ان میں سے بعض تجارت کرتے ہیں۔ ممالک غیر سے براہ راست ان کے تعلقات تھے۔ تاریخ میں سب سے پہلے ان ملتانیوں کا ذکر غیاث الدین بلبن کے عہد میں ملتا ہے۔ وہ ساہو کارہ کا کام بھی کرتے تھے۔ امراد رؤسا کو روپیہ قرض دیا کرتے تھے۔ اور اپنی دولتمندی کے لیے ضرب المثل تھے۔ علاء الدین خلجی کے عہد میں وہ سلطنت کے معاملات میں بھی دخیل ہیں۔ بعض ان میں سے بڑے بڑے عہدوں کے مالک ہیں۔ مثلاً الپ خاں امیر ملتانی ملک عین الملک ملتانی اور خواجہ حمید الدین ملک التجار ملتانی جو بعد میں قاضی شہر دہلی بنا دیے گئے اور ملک فضل اللہ ملتانی۔ بعض مشاہیر علماء اس جماعت سے تعلق رکھتے جن کے فضل و شہرت کی بنا پر تاریخ میں ان کے نام مذکور ہیں مثلاً مولانا محب ملتانی قدیم اور مولانا شہاب الدین ملتانی۔ سرائے عدل علاء الدین کے کپڑے کی منڈی تمام تر ملتانی تاجروں کے قبضے میں تھی۔ سلطنت نے دس لاکھ روپئے کپڑے کا نرخ ارزاں کرنے کے لیے ایک مشت ان کو عطا کیا تھا۔

جب معز الدین اور اس کے والی قطب الدین ایبک نے چند سال کے عرصہ میں اجمیر ہانسی سرستی۔ کہرام۔ میرٹھ۔ دہلی۔ بدایوں۔ قنوج۔ بنارس۔ بہر دالا تھنگر گوالیر۔ کالنجر اودہ اور مالوہ فتح کر لیے تو اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس نئے علاقہ کے انتظام کے لیے ان کو کس قدر آدمی درکار ہوئے ہوں گے کیونکہ ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر شہر میں ان کو اپنی چھاؤنی رکھنی پڑی ہوگی۔ چاروں طرف طاقتور ہندو راجہ موجود تھے جن کو قدرتاً مسلمانوں سے عداوت تھی اسلیے ہمیں ماننا پڑے گا کہ ان ایام میں

شمال سے لوگ بڑی تعداد میں ہجرت کر کے ہندوستان کی طرف چلے گئے ہیں اور ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ لاہور چونکہ پایۂ دار السلطنت تھا اسلئے ضروری ہوا کہ یہاں لوگ تبدیلی دار السلطنت کے وقت بتقریب ملازمت تجارت و دیگر خدمات زیادہ تعداد میں جا بسیں.

قطب الدین ایبک کے ساتھ جو لوگ ہجرت کر کے دہلی آ گئے ہیں اگرچہ یوں تو ان میں مختلف اقوام شامل تھیں مثلاً ترک (جو بڑے عہدوں پر ممتاز تھے) خراسانی جو مناصب دیوانی پر سرفراز تھے. خلجی. افغان اور پنجابی. لیکن ان میں زیادہ تعداد موخر الذکر کی تھی. جو فوجی اور دیوانی خدمات کے علاوہ زندگی کے اور پیشوں اور شعبوں پر بھی متصرف تھے. اس سے قبل اشارہ کیا جا چکا ہے کہ سندھ میں مسلمانوں اور ہندؤوں کے اختلاط سے اگر کوئی نئی زبان نہیں بنی تھی تو غزنوی دور میں جو ایک سو ستر سال پر حاوی ہے ایسی مخلوط یا بین الاقوامی زبان ظہور پذیر ہو سکتی ہے. اردو چونکہ پنجاب میں بنی ہے اس لئے ضروری ہے کہ وہ یا تو پنجابی کے مماثل ہو یا اس کی قریبی رشتہ دار ہو. بہرحال قطب الدین کے فوجی اور دیگر متوسلین پنجاب سے کوئی ایسی زبان اپنے ہمراہ لے کر روانہ ہوتے ہیں جس میں خود مسلمان تو باہم ایک دوسرے سے تکلم کر سکیں اور ساتھ ہی ہندو اقوام بھی اس کو سمجھ سکیں اور جس کو قیام پنجاب کے زمانہ میں وہ بولتے رہے.

دہلی میں آباد ہونے کے بہت جلد بعد ان نو آبادکاروں میں ہندی اہل کمال پیدا ہونے لگتے ہیں. تاج الدین سنگریزہ جو التمش ۶۳۳ھ اور اس کا اسباط کا مداح ہے دہلی کا پہلا نغز نویس ہے. جو ہمیں معلوم ہے. وہ اپنے کمال اور ہندوستان زئی کے متعلق ایک شعر میں گویا ہے ؎

مولد و منشا مبیں در خاک ہندوستان مرا — نظم و نثرم بیں کہ با آب خراسان آمدہ است

ایک شعر میں دو ہندی لفظ سیر اور من باندھ گیا ہے. دیکھو ہذا ؎

خیز از مئے قدیم مرا مسیر کن بہ رطل — بگذر ازیں حدیث کہ تاکیسر دلکیہ من است

غلاموں اور ان کے جانشین خلجیوں کے دور میں پنجاب کو اس عہد کے سیاسی وجود کی بنا پر زبردست اہمیت مل گئی تھی یعنی چنگیزی مغلوں کے حملے بار بار ہندوستان پر ہوتے تھے ان حملوں کی روک تھام کے لیے سلاطین دہلی حکومت ملتان و دیپال پور کے لیے اکثر تجربہ کار و بہادر سپہ سالار یا ولی عہد سلطنت کو نامزد کرتے تھے جو ایک بڑی فوج کے ساتھ ہر وقت ان کے مقابلہ کے لیے تیار رہتا تھا چنانچہ شمس الدین التمش نے اپنے فرزند رکن فیروز شاہ کو ریاست لاہور دی۔ ناصر الدین محمود نے شیر خاں کو جو ایک مشہور جنگ آزما تھا پنجاب کا حاکم بنایا۔ غیاث الدین بلبن نے اپنے ولی عہد سلطان محمد شہید کو ایالت ملتان و لاہور دی چنانچہ مغلوں کے ہاتھ یہ شہزادہ جنگ میں مارا گیا۔ اس کا فرزند شہزادہ کیخسرو اس کا جانشین بنایا جاتا ہے۔ جلال الدین فیروز شاہ خلجی نے اپنے ولی عہد ارکلی خاں کو حاکم لاہور و ملتان و سندھ مقرر کیا تھا۔ علاء الدین کے عہد میں ملک مبارز الدین ظفر خاں تغلق اور بعد میں غازی ملک تغلق والی پنجاب ہوئے۔ اول الذکر مغلوں کے ہاتھ سے ہی شہید ہوتا ہے۔ غازی ملک تغلق کے پنجاب کے ساتھ گہرے تعلقات ہیں بقول ابن بطوطہ وہ ایک قرونہ سے تھا۔ بقول فرشتہ اس کا باپ ملک تغلق غیاث الدین بلبن کا غلام تھا۔ اور پنجاب کے جاٹوں میں اس نے شادی کی تھی۔ جس سے غازی ملک تغلق پیدا ہوا۔ اس طرح غازی ملک پنجابی بنے ان ایام میں ہندو اپنی بیٹیاں مسلمانوں کو دیا کرتے تھے۔ اس خاندان نے اکثر شادیاں ہندوؤں میں کی ہیں۔ فیروز شاہ تغلق کی ماں بھی رانا مل بھٹی والی ابوہر کی دختر تھی۔ غازی ملک کا تمام وقت پنجاب میں گذرا۔ اور قطب الدین مبارک شاہ کے آخر عہد تک والی دیپال پور رہا اس عرصہ میں مغل حملہ آور دس سے بیس مرتبہ اس نے جنگیں کیں اور ہر جنگ میں ان کو ہزیمت دی۔ جب خسرو نمک حرام نے غداری کر کے خلجی خاندان کے

تمام افراد کو قتل کر دیا اور خود تخت دہلی پر قابض ہو گیا۔ غازی ملک کی رگ حمیت حرکت میں آئی وہ ایک بڑی فوج کے ساتھ دہلی کی طرف بڑھا اور خسرو نمک حرام سے اپنے آقاؤں کے خون کا بدلہ لے کر عام خواہش کے مطابق ۷۲۰ھ میں بادشاہ ہندوستان بن گیا اور غیاث الدین تغلق کے نام سے تاریخ میں مشہور ہوا۔ یہ اسکے اعمال شریفہ کا انعام تھا کہ غازی کو تخت ہندوستان مل گیا۔ لیکن ہمارے لیے سب سے زیادہ دلچسپی کا امر یہ ہے کہ غیاث الدین پنجابیوں کے لشکر کے ساتھ دہلی میں داخل ہوتا ہے جس نے وہاں آباد ہو کر دہلی کی زبان پر بے حد اثر ڈالا ہوگا۔ اور دہلی کے کوچہ و بازار میں ہر طرف پنجابی اور پنجابی بولنے والے نظر آتے ہوں گے۔ جب نارمنوں کی فتح نے انگریزی زبان پر ایک نہ مٹنے والا اثر ڈالا اور ہمیشہ کے لیے اسکی رفتار کو بدل دیا تو ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ دہلی پر ان پنجابیوں نے کس قدر اثر ڈالا ہوگا جو دیپال پور سے اٹھ کر دہلی آباد ہونے کے لیے آ گئے تھے۔ اگرچہ دہلی کے مسلمان اس سے پیشتر بھی کوئی بھی ہی زبان بول رہے تھے جو ان دیپال پوریوں کی زبان کے بہت قریب تھی۔

تغلقوں کے عہد میں دہلی میں جس قسم کی زبان بولی جاتی تھی اگر ہم کو ان کے نمونے دیکھنا ہیں تو قدیم دکنی اردو کے ادبیات دیکھنے چاہئیے جو اس زبان کے بہت قریب ہیں۔ دکنی زبان میں شعر و شاعری کا آغاز اواخر قرن نہم سے شروع ہو جاتا ہے یا یوں کہنا چاہیئے کہ اس عہد تک بعض تصنیفات ہم کو مل جاتی ہیں ان میں سب سے قدیم میرانجی شمس العشاق کی تصنیفات ہیں۔

خلجیوں نے دکن سب سے پہلے آباد کیا اور اردو مسلمانی فتوحات کے ساتھ وہاں پہونچ گئی۔ لیکن یہ غیاث الدین کا فرزند محمد تغلق ۷۲۵ھ ہے جو دہلی کی زبان کو دولت آباد پہونچاتا ہے۔ محمد تغلق کو عالمگیر کی طرح دکن سے بیحد شغف تھا شہزادگی کے زمانہ میں بچشم خود دیکھ آیا تھا۔ ورنگل دوبارہ فتح کیا۔ دولت آباد کے قدرتی استحکام

نے اسکے دل پر بے حد اثر ڈالا۔ یہ شہر اسکے نزدیک دار السلطنت ہند کے لیے زیادہ مناسب اور مرکز دہ تھا۔ وہاں سے دہلی۔ گجرات۔ لکھنوتی۔ سنگانو۔ ستگاؤں۔ سنار گاؤں۔ تلنگانہ۔ معبر دہور سمندر اور کپلا وغیرہ ایک ہی مسافت پر آجاتے تھے۔ اسی لیے ۷۲۷ھ میں ایک صبح اس نے یہ اعلان کروا دیا کہ رعایائے دہلی مع ان قصبات کے لوگوں کے جو دہلی سے چار چار کوس کے اندر واقع تھے۔ تمام کمال امیر و غریب پیر و جوان مع زن و بچہ کنیز و غلام دولت آباد کی طرف کوچ کریں۔ شہر و نواحی کو یہ ہوشربا حکم ملا اور حکم کے ملتے ہی اسکی تعمیل شروع ہو گئی۔ شاہی فرمان اس قدر سخت تھا کہ شہر و قصبہ کے انسان تو انسان بلی کتے تک فراموش نہیں ہوئے تھے۔ ان ایام میں دہلی کے گرد و اطراف میں بیحد قریات و قصبات آباد تھے۔ سلطنت نے مسافروں کی سہولت کے لیے کسی قدر انتظام بھی کیا اور زاد راہ بھی محتاجوں اور بے استطاعتوں کو ملا لیکن دہلی کی آرام طلب درخانہ دوست رعیت کو یہ سفر راس نہ آیا اور بہت سے راستہ میں تلف ہو گئے۔ چند سال کے بعد سلطان نے فرمان جاری کیا کہ جس کا جی چاہے دہلی چلا جائے اور جس کا جی چاہے دولت آباد میں رہے اس حکم پر بعض صاحب استطاعت واپس چلے گئے۔ لیکن ایک بڑا حصہ مرہٹواڑی ہی میں رہ پڑا اور آباد ہو گیا۔ اس طرح دہلی کی زبان دکن پہونچ گئی۔ محمد تغلق کے آخر زمانہ سلطنت میں امیران صدہ نے دکن میں بغاوت کر دی۔ موت نے بادشاہ کو اتنی مہلت نہ دی کہ باغیوں کی سرکوبی کرتا۔ ۷۴۸ھ میں حسن گنگو علاءالدین شاہ کے نام سے بادشاہ دکن بن گیا اور تقریباً دو سو سال تک بہمنی خاندان دکن میں حکومت کرتا رہا۔ اور ۹۲۳ھ میں ختم ہوا۔ یہ پہلا افغان خاندان ہے جو ممالک ہند میں سر برآوردہ ہوتا ہے۔ بہمنیوں کی میراث پانچ سلطنتوں میں منقسم ہو جاتی ہے (۱) عماد شاہی جسے ۹۸۰ھ میں نظام شاہی برباد کرتے ہیں۔

(۲) نظام شاہی جنھیں اکبر کی فوجیں سنہ ۱۰۰۸ھ میں فتح کر لیتی ہیں (۳) برید شاہی جو سنہ ۱۰۱۸ھ تک حکمرانی کرتی ہے (۴) عادل شاہی۔ ان کو سنہ ۱۰۹۷ھ میں عالمگیر فتح کر لیتا ہے (۵) قطب شاہی سنہ ۱۰۹۸ھ میں عالمگیر ان کا علاقہ اپنی قلمرو میں شامل کر لیتا ہے جو سلطنتیں ان میں طاقتور اور ممتاز تھیں اور جن کے زمانہ میں اردو ادبیات کو فروغ ہوتا ہے۔ قطب شاہی اور عادل شاہی ہیں۔ تین سو پچاس سال کے بعد ان علاقوں کا دہلی کے ساتھ الحاق ہوتا ہے اس زمانہ میں دہلی سے دکنیوں کا براہ راست کوئی تعلق نہیں رہا اور نتیجہ یہ نکلا کہ دکنی اردو متعدد امور میں جو بعض صرف و نحو سے تعلق رکھتے تھے اور بعض محاوروں سے مختلف ہو گئی اس امتیاز کے ظاہر کرنے کے لیے اہل علم نے ایک کا دکنی اور دوسری کا نام اردوئے معلیٰ رکھ دیا لیکن یہ فرق ان زبانوں میں کیوں آ گیا۔ اس کا جواب یہی ہے کہ دکنی تغلقوں کے عہد کی زبان کی جو دہلی میں بولی جاتی تھی تقلید کر رہے ہیں۔ ادہر اردو زبان دہلی میں آنے والے سیاسی واقعات اور ماحول سے برابر متاثر ہوتی رہی اس لیے ایک یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ تغلقوں کے زمانہ سے بیشتر ہی اردو ایک علیحدہ اور مستقل زبان بن چکی تھی اور اس نے اپنے صرف و نحو کے قواعد علیحدہ مقرر کر لیے تھے ممالک گجرات اور دکن دوسرے الفاظ میں بمبئی پریسیڈنسی (علاوہ سندہ) اور مدراس پریسیڈنسی کے اہل اسلام میں جو زبان رائج ہے وہ یہی دکنی ہے اور دونوں پریسیڈنسیوں کی زبان میں بہت کم فرق ہے اور جو فرق ہے اس قابل نہیں کہ بیان کیا جائے اسکی وجہ بھی تاریخی ہے۔ خلجی گجرات کو دوبارہ فتح کرتے ہیں لیکن محمد تغلق کے جانشین سلطان فیروز شاہ متوفی سنہ ۷۹۰ھ کے بعد گجرات نے دکن کی تقلید کر کے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ اور تقریباً دو سو سال تک گجرات دہلی سے علیحدہ رہا۔ سنہ ۹۸۰ھ میں جلال الدین نے دوبارہ اس کو فتح کیا جس قسم کی اردو گجراتیوں نے تغلقوں سے سیکھی تھی وہ اسی پر قائم رہے اسکے

علاوہ دکن اور گجرات ہمسایہ ممالک ہیں اور ان میں تعلقات بھی قائم تھے۔ قصہ مختصر یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر گجرات اور دکن میں ایک ہی زبان رائج رہی۔ گجراتی اردو میں بھی دسویں صدی سے تصنیفات شروع ہونے لگی تھیں۔

پنجاب ایک مرتبہ اور خضر خاں کی صورت میں دہلی پر حملہ کرتا ہے۔ خضر خاں ملک سلیمان کا فرزند ہے جس کو ملک مردان دولت نے اپنا پسر خواندہ بنایا تھا۔ ملک مردان دولت ملتان کا حاکم تھا۔ اسکی وفات پر اس کا فرزند ملک شیخ جانشین ہوا جس کی وفات پر ملک سلیمان حاکم ملتان بن گیا۔ اس کے بعد اس کا فرزند خضر خاں فیروز شاہ تغلق کے حکم سے حاکم ملتان بنا دیا گیا۔ جب سارنگ خاں نے اس سے ملتان چھین لیا خضر خاں تیمور کے حملہ ۸۰۱ھ کے ایام میں امیر سے دہلی میں جا ملا۔ امیر نے اس کی خدمات پسند کر کے ملتان و پنجاب کی حکومت پھر اس کے حوالے کر دی۔ خضر خاں اپنے آخری حملے میں جو ۸۱۶ھ میں کیا تھا۔ دہلی پر قابض ہو گیا۔ اس حملہ کے تفصیلی حالات معلوم نہیں صرف اتنا معلوم ہے کہ خضر خاں کے ساتھ اس وقت ساٹھ ہزار سوار تھے۔ ذوالحجہ سنہ مذکور میں حملہ آور ہوا اور ۱۵ ربیع الاول ۸۱۷ھ میں دولت خاں لودھی نے جو دہلی پر قابض تھا ہتھیار ڈال دیئے۔ خضر خاں کی تمام فوج پنجاب سے تعلق رکھتی تھی جس طرح کہ وہ خود پنجابی تھے اور جب وہ بادشاہ بن گیا ہے تو ظاہر ہے کہ دہلی کی زبان پر پنجاب کا اثر مجدداً ہو گیا۔

لودھی پٹھان بسلسلۂ تجارت ہندوستان آتے رہتے تھے۔ بہن جب ملک بہرام اپنے بھائی سے ناخوش ہو کر ملتان چلا آیا۔ اور بعہد فیروز شاہ تغلق ملک مردان دولت حاکم ملتان کے ہاں ملازم ہو گیا۔ اس کے پانچ فرزند ہوئے ملک سلطان شاہ ملک کالا۔ ملک فیروز۔ ملک محمد اور ملک خواجہ۔ باپ کی وفات پر پانچوں بھائی ملتان ہی میں آباد رہے۔ جب خضر خاں حاکم ملتان بن گیا۔ ملک سلطان شاہ اس کے

ہاں ملازم ہو گیا اور کچھ عرصہ میں افغان کی ایک جماعت کی افسری حاصل کر لی۔ خضر خاں کی ملو اقبال خاں کے ساتھ جو جنگ ہوئی اس میں سلطان شاہ نے غیر معمولی بہادری دکھائی۔ وہ دشمن کی صفیں چیرتا ہوا ملو اقبال خاں تک پہونچ گیا اور اس کا سر کاٹ لیا۔ اس خدمت کے سلسلہ میں خضر خاں نے، اس کی قدر دانی کی اور اسلام خاں کا خطاب دیکر سرہند کی حکومت عنایت کر دی۔ اسلام خاں کے بھائی اسکے ہمراہ رہے۔ اور ملک کالا جو بہلول کے باپ کا نام ہے پرگنہ دورالہ کا حاکم بن گیا۔ ملک کالا کی بیوی پورے دنوں سے تھی عین اسی وقت مکان کی چھت گری جس کے نیچے دب کر وہ فوت ہو گئی۔ اس شبہہ میں کہ کہیں بچہ زندہ ہو مرتو مرکا پیٹ چاک کیا گیا دیکھا کہ بچہ زندہ و سلامت ہے۔ اس کا نام بہلول رکھا ویسے لوگ بہلا کرتے تھے۔ ملک کالا نیازی افغانوں کی جنگ میں مارا گیا اور یتیم بہلول اسکے چچا اسلام خاں کے پاس پہونچا دیا گیا۔ سن رشد کے قریب بہلول نے ایک جنگ میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے اس پر اسلام خاں نے اپنی بیٹی اسے بیاہ دی۔ اب اسلام خاں اس قدر طاقتور ہو گیا تھا کہ بارہ ہزار افغان جن میں اکثر اسکے خویش اور ہم قوم تھے اسکے ملازم تھے۔ اپنی وفات پر اسلام خاں نے فرزندان نرینہ چھوڑنے کے باوجود ملک بہلول کو بروئے وصیت اپنا جانشین بنا دیا۔ اب اسلام خاں کی فوج کی تین ٹولیاں بن گئیں۔ ایک ٹولی بہلول کے تابع تھی۔ دوسری ملک فیروز برادر اسلام خاں کی اور تیسری قطب خلف اسلام خاں کی لیکن بہلول اپنے حسن تدبیر سے رفتہ رفتہ دوسری جماعت کو توڑ کر طاقتور بن گیا۔ اور سلطنت دہلی کا کبھی باغی اور کبھی مطیع رہ کر ستمبر میں بادشاہ دہلی بن گیا۔ اگرچہ اسکے لشکر میں زیادہ تعداد افغانوں کی تھی لیکن یہ افغان ایسے تھے جو زیادہ تر پنجاب میں تھے۔

ان چند مختصر بیانات سے جو میں نے اوپر عرض کیے ہیں بخوبی واضح ہوتا ہے

کہ سیاسی نقطۂ نظر سے پنجاب کا اثر دہلی پر ہر عہد میں نمایاں رہا ہے۔

یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ سیاسی واقعات کا اثر زبان پر بہت گہرا ہوتا ہے، چنانچہ جب ہم اردو اور پنجابی زبان کی صرف و نحو ان کے قواعد اور عام ہیئت کا مقابلہ کرتے ہیں تو یہ اثر قدم قدم پر محسوس ہوتا ہے اور دونوں زبانوں میں مماثلت کا راز صحیح طور پر آشکارا ہو جاتا ہے آیندہ باب میں اسی مسئلہ پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔

پنجاب

پنجاب اگرچہ میانداب کا ہمسایہ ملک ہے لیکن رسم و رواج اور اوضاع و اطوار میں اس سے بالکل مختلف ہے۔ ہندو اقتدار کے دور میں جہاں وابیوں اور پنجابیوں میں چشمک رہی ہے اور میانداب جو اپنے سنسکرت کے تمدن پر نازاں تھا پنجاب کو ایک وحشی ملک تصور کرتا رہا ہے۔ مہابھارت اور رسیبنی کے بعض اشاروں سے مفہوم ہوتا ہے کہ اس ملک کے لوگوں کسی باقاعدہ نظام کے ماتحت نہ تھے۔ ان کا کوئی بادشاہ تھا۔ وہ ہمیشہ جنگ و فساد میں مبتلا تھے۔ ان کے ہاں برہمن نہیں تھے۔ تمام پنجاب چھوٹے چھوٹے رئیسوں میں منقسم تھا جو ایک دوسرے سے برسر پیکار تھے باشندے ویدوں کا احترام نہیں کرتے تھے اور نہ دیوتاؤں پر قربانیاں چڑھاتے تھے وہ بالکل وحشی اور غیر مہذب تھے شراب پیتے تھے اور ہر قسم کا گوشت کھانے کے عادی تھے۔ ان کی عورتیں قد و قامت کی بڑی رنگ کی پیلی اور اخلاقاً گندی ہوتی تھیں۔ کئی کئی شوہر رکھتی تھیں۔ ایک شخص کا وارث اس کا فرزند نہیں ہوتا تھا بلکہ اسکی بہن کا لڑکا۔ یہ بیانات دشمنوں کے قلم سے ہیں اور بہت ممکن ہے ان میں صداقت کا عنصر بہت کم ہو۔

بہر کیف اسلام کی آمد پر پنجاب کی حالت میں ایک انقلاب رونما ہوتا ہے اور اہل پنجاب حلقہ بگوش اسلام ہو کر دینی و دنیوی ترقی کرتے رہے ہیں۔ ابھی مسلمانوں کو دہلی میں آباد ہوئے ایک صدی بھی نہیں گذرنے پائی ہے کہ ہم دہلی کے دربار میں پنجاب کے بعض مشاہیر امراء و فضلاء دیکھتے ہیں۔ اگرچہ اس عہد کی تاریخ کے فقدان نے ہمارے لئے یہ امر ناممکن کر دیا ہے کہ کوئی مکمل بیان اس عہد کے مشاہیر

پنجاب پہ دیا جائے۔ لیکن یہاں میں بعض ایسے اسمار درج کرتا ہوں جو خاک پنجاب سے ہیں اور اتفاقیہ اس زمانہ کی تاریخ میں ان کے نام مل جاتے ہیں۔ ساتویں صدی میں اگرچہ پنجاب دارالسلطنت ہند نہیں رہا تھا تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ پنجاب کے شہروں میں مقتدر ہستیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ مثلاً ملک عین الدین علیشہ کوہ جودی۔ یہ بلبن اور کیقباد کے عہد میں امیر تھے۔ ملک تاج الدین کہرامی اور ملک نصیر الدین کہرامی اسی زمانہ کے امرا میں داخل ہیں۔ سامانہ سے سید عزیز اور سید معین الدین بہت ممتاز اور زہد واتقا و علو نسب میں شہرۂ آفاق تھے۔ قاضی رکن الدین بھی سامانہ کے باشندے ہیں اور جید علمائے وقت میں شمار ہوتے ہیں۔ مولانا رکن الدین سنامی اور مولانا ضیاء الدین سنامی خلجیوں کے عہد کے علما ر شمار ہوتے ہیں۔ موخر الذکر محکمہ احتساب کے افسر تھے اور صوفیہ کے مخالف تھے انھوں نے اپنی تصنیف یادگار چھوڑی ہے۔ مولانا علاء الدین لاہور کے باشندے اور اپنے زمانہ کے علمار میں محسوب تھے۔ قصور سے مولانا سراج الدین پیدا ہوتے ہیں جو فضل و کمال سے متصف تھے۔ ملتان میں شیخ بہاء الدین زکریا اور اجودھن میں شیخ فرید الدین مشہور تر از آفتاب ہستیاں ہیں ان کا خاندان علم و فضل تصوف و عرفان کے لیے صدیوں مشہور رہا ہے۔ اگرچہ مغلوں کے حملے نے پنجاب کو عرصہ تک دم نہیں لینے دیا۔ اور اسکی رفتار کی ترقی کو روک دیا لیکن اس نقصان سے پنجاب کو یہ فائدہ پہونچا کہ اس نے تین خاندان ہندوستان کو ایسے دیئے جنھوں نے تخت دہلی پر بیٹھ کر دو سو برس تک ہندوستان پہ حکومت کی۔ اس معاملہ میں ہندوستان کا کوئی صوبہ پنجاب کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

ملک پنجاب کی زبان آج کل پنجابی کے نام سے موسوم ہے۔ امیر خسرو اس کو لاہوری کے نام سے یاد کرتے ہیں اور ابو الفضل ملتانی کہتا ہے۔ مغربی مورخین

نے شمالاً و جنوباً ایک خط کھینچ کر شرقی و مغربی پنجابی میں اسے تقسیم کر دیا ہے مشرقی حصہ کی زبان کا نام پنجابی رکھا ہے اور مغربی حصہ کی زبان کا نام لہندا پنجابی کو وہ مغربی ہندی میں شامل کرتے ہیں اور لہندا کو بیرونی دائرہ میں داخل کرکے سندھی اور کشمیری کا رشتہ دار مانتے ہیں اہل پنجاب یہ فرق تسلیم نہیں کرتے ان کا بیان ہے کہ پنجابی اور لہندا ایک ہی چیز ہے۔ مغربی اور مشرقی زبان میں جو فرق ہے وہ اصولی نہیں ہے بلکہ تدریجی اور ضلع ضلع کی مقامی خصوصیات کی بنا پر پیدا ہوتا چلا گیا ہے اور یہ تقسیم ہر حال میں جائز ہے۔

پنجاب اگرچہ پانچ دریاؤں کا ملک ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ صوبہ کی زبان انہی دریاؤں کے مابین محصور ہے بلکہ وہ ان دریاؤں سے چھلک کر دونوں طرف پھیل گئی ہے ادھر دریائے گھگر تک آگئی ہے ادھر دریائے سندھ پار کر گئی ہے۔ ایک اہم مغربی عقیدہ یہ ہے کہ پنجابی زبان کی ہمسایہ ہندوستانی زبان جو مغربی ہندی کی ایک شاخ ہے۔ ایک زمانہ میں تمام مشرقی پنجاب پر پھیل گئی ہے اور اس صوبہ کی اصلی زبان لہندا کو ہٹاتی ہوئی یا اس پر چھائی ہوئی دریائے چناب تک پہونچ گئی بلکہ بعض اوقات اس کا اثر جہلم تک محسوس ہوتا ہے ہند میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سیاسی واقعات کا بہاؤ شمال سے زیادہ تر جنوب کی طرف رہا ہے سیاسی واقعات نیز مغلوں کے دباؤ کے زیر اثر آٹھویں اور نویں صدی ہجری میں بڑے بڑے گروہ پنجاب سے ہجرت کرکے دہلی اور اسکے نواح میں آباد ہوتے رہے ہیں۔ بارھویں صدی میں سکھ پنجاب سے نکل کر ارد دبانگڑ اور بیکانیری علاقوں میں گھس جاتے ہیں ان واقعات کے سامنے ہندوستانی زبان کے شمال کی طرف بڑھنے اور لہندا کو پیچھے ڈھکیلنے کا کوئی موقع مناسب نظر نہیں آتا

پنجابی میں شعر و ادب ایک معتد بہ مقدار میں موجود ہے جس کا اکثر حصہ مسلمان

دماغوں کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ خواجہ مسعود سلمان کے بعد پنجابی کے پہلے شاعر شیخ فریدالدین متوفی ۶۶۴ھ ہیں۔ سکھوں کا بیان ہے کہ وہ فریدالدین ابراہیم ہیں جو گرو نانک کے معاصر ہیں۔ ان کے کلام کا کسی قدر حصہ اتفاق سے سکھوں کی مقدس کتاب گرنتھ صاحب میں محفوظ ہے۔ دوسرے شاعر گرو نانک صاحب ہیں جن کا جپ جی سکھوں میں بہت مقبول ہے۔ شاہ حسین متوفی ۱۰۰۸ھ نے ایک کافی اپنی یادگار چھوڑی ہے۔ پنجاب کے علماء نے بے شمار کتابیں اور رسالے اس نظر سے تصنیف کیے ہیں کہ مسلمان جماعت کا غیر تعلیم یافتہ طبقہ احکام دین روزہ نماز اور مسائل شرعیہ سے ضروری واقفیت حاصل کر سکے۔ ایسی کتابیں اکثر اوقات مختصر نظم کی شکل میں ہوتی تھیں، تاکہ لوگ آسانی سے یاد کر سکیں۔ جاہل طبقہ کے لیے یہ طریقۂ تعلیم مسلمانوں نے ہندوستان کی باقی زبانوں میں بھی اختیار کیا ہے۔ پنجابی میں ایسی تعلیم کا سلسلہ بہت وسیع ہے اگرچہ بہ تحقیق معلوم نہیں کہ یہ سلسلہ کس زمانہ سے شروع ہوتا ہے، لیکن اسکے قدیم ہونے میں کوئی شک نہیں۔ کیونکہ اکبری عہد کی ایسی تالیف اب بھی موجود ہے۔ ان میں مولانا عبدی ابن محمد ساکن باتو کا رسالہ ہندی سب سے مقدم ہے جو ۹۷۷ھ میں تصنیف کیا گیا ہے ؎

نوے در ہے ستاتوں جاں گزرے وچ شمار — پیچھے ہجرت مصطفےٰ تدن تھیا طیار

مولوی عبداللہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں جو جہانگیر کے عہد سے شروع کرکے شاہجہاں کے آخری ایام تک برابر چالیس سال تک تصنیف و تالیف میں مصروف رہا، شرعیات ان کا میدان ہے اور اسی میں تمام عمر گذار دی۔ ان کی پہلی تصنیف تحفہ ۱۰۲۵ھ میں اور آخری کتاب خیر العاشقین ۱۰۶۵ھ میں ختم ہوتی ہے۔ خلاصہ ۱۰۲۴ھ میں انواع العلوم ۱۰۴۳ھ میں۔ خیر العاشقین کلاں ۱۰۵۳ھ میں اور سراجی ۱۰۵۷ھ میں نظم ہوئی۔ مولانا عبداللہ کے حالات زندگی سے ہم ناواقف ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں

کہ انھوں نے علوم دین اور فقہ کی زبردست خدمت کی ہے۔ مولوی عبداللہ کے مقلدین میں علامان ناجی (علامان ناجی کذا) اور درویش محمد ہیں۔ فقہی رسائل دونوں نے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ علامان بن درویش محمد نے "مسائل فقہ" لکھے مولانا عبدالکریم نے سنہ ۱۰۸۶ھ میں نجات المومنین تصنیف کی سنہ ۱۱۵۴ھ میں فقیر شاہ نے نور نامہ کو نظم کیا۔

عالمگیر کے عہد سے بچوں کی تعلیم کے لیے متعدد کتب نصاب کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جن میں ذریعہ تعلیم پنجابی زبان ہے۔ کہرل رائے سنامی نے سنہ ۱۱۰۵ھ میں ایزد باری اور امید نے سنہ ۱۱۰۶ھ میں اللہ باری تالیف کیں۔ فارسی نار عبدالرحمن بن محمد قاسم قصوری کی یادگار ہے۔ رزاق باری اور واحد باری کا ذکر وارث شاہ علیہ الرحمۃ اپنی مثنوی ہیر رانجھا میں کرتے ہیں۔ نصاب ضروری کے مالک خدا بخش ہیں سنہ ۱۲۰۰ھ میں گنیش داس صنعت باری پر قلم اٹھاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب نے بچوں اور غیر تعلیمیافتہ گروہ کا انتظام اور مقامات سے بہتر کیا۔

نیم مذہبی تصنیفات میں احوال آخرت۔ معراج نامے۔ نور نامے۔ وفات نامے جنگ نامے وغیرہ قسم کی کتابوں کا بہت وسیع سلسلہ موجود ہے۔ طب میں بھی بعض کتابیں تصنیف اور بعض ترجمہ ہوئیں۔ مثلاً دار الشفا۔ ترجمہ قانونچہ و مجربات اکبری وغیرہ۔

قصص و افسانے کے سلسلہ میں ہیر و رانجھا کا قصہ بہت مشہور ہے۔ مقبل نے محمد شاہی عہد میں اور وارث شاہ علیہ الرحمۃ نے سنہ ۱۱۹۰ھ میں اس افسانہ کو نظم کر کے ایک غیر فانی شہرت حاصل کرلی ہے۔ ان کے مقلدین میں فضل شاہ نے زیادہ نام پیدا کیا۔ سوہنی مہینوال کے قصہ پر سید فضل شاہ۔ مشتاق رضا۔ اور غمناک نے طبع آزمائی کی ہے۔ سسی و پنوں کو ہاشم۔ سید فضل شاہ۔ مولوی غلام رسول۔ احمد یار اور بوٹا نے علیحدہ علیحدہ نظم کیا ہے۔ فضل شاہ نے لیلیٰ مجنوں کی نظم لکھ کر اپنا نام کیا ہے یوسف زلیخا

کا قصہ پنجاب میں بہت مقبول رہا ہے۔ متعدد شعرا نے اس کو نظم کا جامہ پہنایا مثلاً پیرانند تا، محمد سعید اور مولوی غلام رسول۔ لیکن سب سے قدیم عبدالحکیم کی یوسف زلیخا ہے جو سنہ ۱۲۱۸ھ میں حلیۂ نظم پہنتی ہے۔ اور راقم سطور نے آیندہ ابواب میں اس سے بہت امداد لی ہے۔ عبدالحکیم اوچ تحصیل احمد پور کے باشندے ہیں جو بہاولپور کے علاقے میں واقع ہے۔ عبدالحکیم نے یہ مثنوی اپنے علاقہ کی زبان میں جو ملتانی کے نام سے مشہور ہے لکھی ہے اور نواب بہاول خان کے نام پر معنون کی ہے۔

صوفی شعرا میں حضرت بلھے شاہ متوفی سنہ ۱۱۷۱ھ اور علی حیدر متوفی سنہ ۱۱۹۱ھ شہرت خاص رکھتے ہیں۔ بلھے شاہ کی کافیاں صوفی حلقوں میں بے حد مقبول ہیں پنجابی میں قصص الانبیا اور شاہنامہ جیسی کتابیں بھی ترجمہ ہو چکی ہیں۔ جنگ نامے پنجابی ادبیات کی ایک اور صنف ہیں۔ جن میں شہید کربلا اور ان کی جنگوں کا ذکر ہے۔ ان میں مقبل کا جنگ نامہ سب سے قدیم ہے۔ جو سنہ ۲۹ جلوس محمد شاہی مطابق سنہ ۱۱۸۹ھ میں لباس نظم پہنتا ہے۔ اس کے علاوہ بارہ ماسے اور سی حرفیاں پنجابی ادب کی خصوصی شاخ ہیں۔ جو اب بالکل متروک ہیں۔ سی حرفی گجراتی اردو میں بھی ملتی ہے۔ اور شاہ علی جیو گام دھنی کے جواہر اسرار اللہ میں موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظمیں بھی بارہ ماسوں کی طرح قدیم ہیں۔

پنجابی اور اُردو

گذشتہ صفحات میں اشارہ کیا جاچکا ہے کہ پنجابی اور اردو اپنی صرف و نحو میں ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ یہاں اس بحث پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی جاتی ہے۔

(۱) مصدر کا قاعدہ دونوں زبانوں میں ایک ہے۔ یعنی علامت "نا" امر کے آخر میں اضافہ کر دی جاتی ہے۔ قدیم زمانہ میں اس کا رسم الخط دونوں زبانوں میں "ناں" تھا۔ بارہویں صدی کے اختتام کے قریب ایسے نون غنہ کو ترک کر دیا جاتا ہے اور دیگر الفاظ سے بھی خارج کر دیا جاتا ہے مثلاً سیں، کوں، بیں وغیرہ جو بعد میں سے۔ کو اور سینی بن جاتے ہیں۔

(۲) تذکیر و تانیث کے قواعد دونوں زبانوں میں ایک ہیں۔ یعنی

(۲) اکثر ایسے الفاظ جو "الف" پر ختم ہوتے ہیں تانیث کی حالت میں "ی" پر ختم ہوتے ہیں۔ مثلاً بکرا۔ بکری گھوڑا۔ گھوڑی۔ چنگا۔ چنگی۔ کالا۔ کالی۔

(۳) جب اسم مذکر حروف علت کے سوا حرف صحیح پر ختم ہو تو دونوں زبانوں میں تانیث کے لیے "نی" یا "انی" اضافہ کر دیتے ہیں۔

مذکر	مؤنث پنجابی	مونث اردو
مغل	مغلانی	مغلانی
لوہار	لہارن۔ لوہاری۔ لوہارئی	لوہاری۔ لوہارن۔
دیور	دیرانی	دورانی
اونٹ	اونٹنی	اونٹنی

مذکر	مونث پنجابی	مونث اردو
نٹ	نٹنی	نٹنی
فقیر	فقیرنی	فقیرنی
زمیندار	زمیندارنی	زمیندارنی
ڈوم	ڈومنی	ڈومنی
سید	سید زادی	سیدانی

(ب) اگر مذکر "ی" پر ختم ہو تو مؤنث میں "ی" "نون" سے بدل جاتی ہے۔

مذکر	مونث پنجابی	مؤنث اردو
میراثی	میراثن	میراثن
تیلی	تیلن	تیلن
قریشی	قریشن	"
موچی	موچن - موچیانی	موچن
بھائی	بھین	بہن
قصائی	قصائن	قصائن
جوگی	جوگن	جوگن
درزی	درزیانی - درزن	درزن
نائی	نائن	نائن
قاضی	قضیانی	قضیانی
دھوبی	دھوبن	دھوبن
کھتری	کھترانی	

"نی" لاحقۂ تانیث جو ہم زمیندارنی - فقیرنی - ڈومنی - وغیرہ میں دیکھتے ہیں

درحقیقت پنجابی میں عام علامت تانیث ہے۔ جو عورت کو خطاب کے لیے ابتدا میں بھی لائی جاسکتی ہے۔ مثلاً نی کرڑیے" (اے لڑکی) نی شیر محمد دی ماں" (اے شیر محمد کی ماں)

(۳) اعلام و اسما، اور اسمائے صفات دونوں زبانوں میں الف پر ختم ہوتے ہیں۔ جب کہ برج بھاشا میں واو مجہول پر ختم ہوتے ہیں۔

پنجابی	اردو	
منڈا	لڑکا	
گھوڑا	گھوڑا	
کتا	کتا	
نیولا	نیولا	خالق باری میں نیول ملتا ہے۔ مصرع "کرڈم چھوڑا سو نیول" لیکن اردو نے اپنا قاعدہ مستمرہ جاری کر کے نیولا بنا دیا۔
چنگا	اچھا	
نکا	چھوٹا	
ڈوا	چھوٹا	
کھبا	الٹا	
سجا	سیدھا	
اچا	اونچا	

(۴) اسما، صفات مذکر و تانیث اور جمع و واحد میں اپنے موصوف کی حالت کے مطابق ہوتے ہیں۔ مثلاً

اُردو (۱) اونچا گھوڑا (۲) میرا لڑکا (۳) چھوٹی لڑکی (۴) بڑے لڑکے (۵) دوڑنے گھوڑے سے (۶) چھوٹی لڑکیاں

پنجابی (۱) اچا گھوڑا (۲) میرا منڈا (۳) نکی کڑی (۴) ڈے منڈے (۵) ڈوڑدے

گھوڑے نول (۶) نکیاں کڑیاں

برج میں اس موقع پر اونچو گھوڑا اور میرو چھورا لائیں گے۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اردو اور پنجابی فقروں میں اسمائے صفات ان کے موصوفوں کے مطابق ہیں یعنی جب موصوف غیر منصرف ہے۔ تو اس کا اسم صفت بھی غیر منصرف رہا۔ جیسے پہلے تین جملوں میں دیکھا جاتا ہے۔ چوتھے اور پانچویں جملہ میں چونکہ موصوف منصرف ہو گئے ہیں۔ یعنی اپنی اصلی حالت لڑکا اور گھوڑا کو چھوڑ کر لڑکے اور گھوڑے بن گئے ہیں۔ اس لیے ان کے اسماء صفات بھی منصرف ہو کر اپنے موصوفوں کی حالت قبول کر کے بڑے اور دوڑتے بن گئے۔ اہل برج اس موقع پر "بڑے لڑکا" اور "دوڑتے گھوڑا سے" لائیں گے۔ جو اردو اور پنجابی کے خلاف ہے۔ یہ فرق اگرچہ بظاہر خفیف ہے۔ لیکن نہایت اہم ہے۔ چھٹے فقرے میں دیکھا جاتا ہے کہ پنجابی میں جب کہ صفت و موصوف باہم متحد ہیں اردو میں باہم مطابق نہیں۔ چھوٹی واحد ہے۔ اور لڑکیاں جمع ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُردو میں یہ بے ضابطگی میر و سودا کے عہد سے شروع ہوئی ہے۔ اُردوئے قدیم میں "چھوٹیاں لڑکیاں" ہی بولتے تھے جو پنجابی کے عین مطابق ہے۔ احمد گجراتی سے

موہیا دوں سے پالیاں سو بالیاں نکھیاں
دفا شرم انو تھے سکیاں سب سکھیاں

(۵) خبر تذکیر و تانیث، واحد و جمع میں اپنے مبتدا کے موافق آتی ہے۔

اُردو۔ (۱) یہ بات بھلی نہیں (۲) یہ باتیں بھلی نہیں

پنجابی (۱) یہ گل چنگی نہیں (۲) ایہ گلاں چنگیاں نہیں

اردو کے دوسرے جملہ میں دیکھا جاتا ہے کہ خبر اپنے مبتدا کے مطابق نہیں باتیں جمع ہیں۔ اور بھلی واحد۔ جبکہ پنجابی میں مبتدا اور خبر دونوں جمع ہیں

یہ جدت طرازی اسی زمانۂ اصلاح سے تعلق رکھتی ہے جس کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ پرانی اردو میں یہ جملہ یوں لکھا جاتا "یہ باتیں بھلیاں نہیں" بلکہ یہ باتاں بھلیاں نہیں۔ جو پنجابی ہے بالکل مرادف ہے۔ سودا کہتے ہیں ؎

دوانہ ہو گیا سودا تو آخر ریختہ پڑھ پڑھ
نہ میں کہتا تھا اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں

(۶) فعل تذکیر و تانیث واحد و جمع میں اپنے فاعل کے مطابق ہے۔

اُردو (۱) گھوڑا آیا (۲) گھوڑے آئے (۳) عورت آئی (۴) عورتیں آئیں۔

پنجابی (۱) گھوڑا آیا (۲) گھوڑے آئے (۳) بڈھی آئی (۴) بڈھیاں آئیں۔

چوتھے جملے میں بڈھیاں غیر منصرف ہے۔ جو بالکل درست ہے اردو کے جملہ میں ایسے عورتاں سے منصرف کرکے عورتیں بنا لیا گیا ہے۔ پرانی اُردو میں یہی جملہ یوں لکھتے "عورتاں آئیاں" ایک مثال سودا کے کلام میں موجود ہے ؎

گھی نکلیں ہیں لخت دل سے تار اشک کی لڑیاں
یہ انکھیاں کیوں مرے جینے لگیں ہار ہو پڑیاں

(۷) اضافت اپنے فاعل کی تذکیر و تانیث اور واحد و جمع کے مطابق ہوتی ہے

اُردو۔ اس میں کوٹھریاں رنگ برنگی ہیں۔ بعض چاندی کی۔ بعض یاقوت سرخ کی اور بعض زمرد کی۔ اور بعض زبرجد کی۔ اور بعض جواہرات سفید کی۔

پنجابی۔ اودے وچہ کوٹھریاں رنگ برنگیاں ہن۔ بعضیاں چاندی دیاں بعضیاں یاقوت سُرخ دیاں نے بعضیاں زمرد دیاں نے بعض زبرجدیاں نے بعضیاں چٹے جواہرات دیاں نے۔

یہاں اعتراض وارد ہوتا ہے کہ کوٹھریاں جمع میں ہیں اور اضافت کی واحد" ہیں لیکن یہاں پھر اردو نے اپنے پرانے قواعد کو توڑنے کی کوشش کی ہے۔ بارھویں صدی

ہجری میں بھی یوں لکھا جاتا تھا۔

"اور اس میں کوٹھریاں رنگ برنگی ہیں بعض چاندی کیاں۔ بعض یاقوت سرخ کیاں۔ اور بعض زمرد کیاں اور بعض زبرجد کیاں اور بعض جواہرات سفید کیاں۔" (منقول از کتاب ہزار مسائل)

مثال دیگر:۔

اردو:۔ یوں نو ہزار باتاں۔ اللہ کی ہور محمدؐ کیاں ہو یاں (از معراج العاشقین حضرت گیسو دراز)

پنجابی:۔ وچ نوے ہزار باتاں اللہ دیا ہو۔ محمدؐ دیاں ہو یاں۔

مثال دیگر:۔

اُردو:۔ قیامت کی نشانیاں کتنی ہیں اور کیسی ہیں یا رسول اللہ"

پنجابی:۔ قیامت دیاں نشانیاں کتنیاں تے کیہاں نے یا رسول اللہ"

قدما کی زبان میں یہ جملہ یوں ہے۔

قیامت کیاں نشانیاں کتنیاں ہیں اور کیسیاں ہیں یا رسول اللہ (از ہزار مسائل) محمد امین دکنی ؒ

گلن کی گردشاں ہیں گئیں طرح کیاں
کدھیں غم کیا ہیں اور کدھیں فرخ کیاں (یوسف زلیخا)

(۸) ماضی مطلق دونوں زبانوں میں ایک ہے۔

اردو۔ وہ آیا۔ وہ آئے۔ تو آیا۔ تم آئے۔ وہ آئی۔ وہ آئیں۔ تو آئی تم آئیں۔ میں آئی۔ ہم آئیں۔

پنجابی۔ اوہ آیا۔ اوہ آئے۔ توں آیا۔ تسی آئے۔ میں آیا۔ اسی آئے وہ آئی۔ اوہ آئیاں۔ توں آئی۔ تسی آئیاں۔ میں آئی۔ اسی آئیاں۔

جمع مؤنث کے صیغوں میں جو فرق پنجابی اور اردو میں ملاحظ ہوتا ہے وہ متاخرین کی اصلاح کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ جس نے قدما کے قاعدوں کو بالکل درہم برہم کرہ یا وہ ان صیغوں کو یوں بولتے تھے۔

محمد امین دکنی ؎

مصر میں خوب صورت بیبیاں تھیں او سنیاں زلیخا کی سو باتاں

(۹) ماضی قریب فعل امدادی کی تصریف سے بنتی ہے۔ یہاں پنجابی اور اردو میں کس قدر اختلاف ہے۔

مذکر صیغہ { اردو:۔ وہ آیا ہے۔ وہ آئے ہیں۔ تو آیا ہے۔ تم آئے ہو۔ میں آیا ہوں۔ ہم آئے ہیں
پنجابی:۔ اوہ آیا اے۔ اوہ آئے نے۔ تو آیا ایں۔ تسی آئے او۔ میں آیا آں
اسی آئے آں۔

صیغہ { اردو:۔ وہ آئی ہے۔ وہ آئی ہیں۔ تو آئی ہے۔ تم آئی ہو۔ میں آئی ہوں۔
ہم آئی ہیں۔

مؤنث { پنجابی:۔ وہ آئی اے۔ اوہ آئیاں نے۔ تو آئی ایں۔ تسیں آئیاں او۔ میں
آئی آں۔ اسی آئیاں آں۔

(۱۰) ماضی بعید بھی توابع کی تصریف سے بنتی ہے۔

اُردو۔ وہ آیا تھا۔ وہ آئے تھے۔ تم آئے تھے۔ میں آیا تھا۔ ہم آئے تھے۔

صیغۂ مذکر { پنجابی۔ اوہ آیا سی۔ اوہ آئے سن۔ تو آیا سیں۔ تسی آئے سو۔ میں
آیا ساں۔ اسی آئے ساں

صیغۂ مؤنث { اردو:۔ وہ آئی تھی۔ وہ آئی تھیں۔ میں آئی تھی۔ ہم آئی تھیں۔
پنجابی:۔ او آئی سی۔ اوہ آئیاں سن۔ تو آئی سیں۔ تسی آئیاں سو۔ میں
آئی ساں۔ اسی آئیاں ساں۔

قدیم اردو میں اس ماضی کی تعریف یوں تھی۔

وسے آئیں تہیا یا آئیاں تہیاں۔

محمد امین دکنی۔

نشانیاں دکھیاں تھا سو بتایاں تھے سب وائی کے آگے کہہ سنائیاں

دیگر محمد امین دکنی۔

یکھی جنت کی حلبوں کیاں چوٹیاں تھیاں نٹاسو تیاں کی اس میں گو نتھیاں تھیاں

(۱۱) ماضی ناتمام میں بڑا فرق یہ ہے کہ پنجابی میں جہاں وہاں ہے اردو میں سے بنا گئی ہے۔

مذکر:

اُردو:۔ وہ مارتا تھا۔ وہ مارتے تھے۔ تو مارتا تھا۔ تم مارتے تھے۔ میں مارتا تھا۔ ہم مارتے تھے۔

پنجابی:۔ اوہ ماردا سی۔ اوہ ماردے سن۔ توں ماردا سیں۔ تُسی ماردے سیو۔ میں ماردا ساں۔ اسی ماردے ساں۔

اردو:۔

مؤنث:

وہ مارتی تھی۔ وہ مارتی تھیں۔ تو مارتی تھی۔ تم مارتی تھیں۔ میں مارتی تھی۔ ہم مارتی تھیں۔

ساں۔ میں ماردی ساں۔ اسی ماردیاں ساں۔

(۱۲) ماضی احتمالی دونوں زبانوں میں بالکل ایک ہے۔

مذکر:

اردو:۔ وہ کھاتا ہو۔ وہ کھاتے ہوں۔ تو کھاتا ہو۔ تم کھاتے ہو۔ میں کھاتا ہوں۔ ہم کھاتے ہوں۔

پنجابی:۔ وہ کھاندا ہووے۔ اوکھاندے ہون۔ توکھاندا ہوویں۔ تُسی کھاندے ہوؤ۔ میں کھاندا ہوواں۔ اسی کھاندے ہوئے۔

مونث
اردو:۔ وہ کھاتی ہو۔ وہ کھاتی ہوں۔ تو کھاتی ہو۔ تم کھاتی ہو۔ میں کھاتی ہوں۔ ہم کھاتی ہوں۔
پنجابی:۔ اوہ کھاندی ہووے۔ او کھاندیاں ہوون۔ تو کھاندی ہوویں۔ تسی کھاندیاں ہوو۔ میں کھاندی ہوواں۔ اسی کھاندیاں ہوئیے۔

(۱۳) مضارع دونوں زبانوں میں ایک ہے۔

مذکر
اردو:۔ وہ آئے وہ آئیں۔ تو آئے۔ تم آؤ۔ میں آؤں۔ ہم آئیں۔
پنجابی:۔ اوہ آوے۔ اوہ آون۔ تو آویں۔ تسی آؤ۔ میں آواں۔ اسی آییے۔
اردو:۔ وہ آئے۔ وہ آئیں۔ تو آئے۔ تم آؤ۔ میں آؤں۔ ہم آئیں۔

پرانی اردو میں بھی آوے۔ اور آویں ہی مستعمل تھا۔ آنا دراصل آونا تھا اس سے مضارع آوے اور آویں تھا۔

(۱۴) فعل حال کی تعریف دونوں زبانوں میں ایک ہی اصول پر ہے۔ ماضی ناتمام کی طرح یہاں بھی دال اور تے آپس میں بدلتی ہیں۔

مذکر
اردو:۔ وہ کرتا ہے۔ وہ کرتے ہیں۔ تو کرتا ہے۔ تم کرتے ہو۔ میں کرتا ہوں۔ ہم کرتے ہیں۔
پنجابی:۔ اوہ کردا اے۔ اوہ کردے نے۔ تو کردا ایں۔ تسی کردے او۔ میں کرداں آں۔ اسی کردے آں۔

مونث
اردو:۔ وہ کرتی ہے۔ وہ کرتی ہیں۔ تو کرتی ہو۔ میں کرتی ہوں۔ ہم کرتی ہیں۔
پنجابی:۔ اوہ کردی اے۔ اوہ کردیاں نے۔ تو کردی ایں۔ تسی کردیاں او۔ میں کردی آں۔

پرانی اردو میں مونث کی گردان زیادہ قریب تھی۔

اردو قدیم:۔

وہ کرتی ہے۔ وہ کرتیاں ہیں تو کرتی ہے۔ تم کرتیاں ہو۔ میں کرتی ہوں ہم کرتیاں ہیں۔

مثال:۔

"واسطے مردوں کے لیے حصہ اس چیز سے کمانے ہیں اور واسطے عورتوں کے حصہ ہے اس چیز سے کماتیاں۔" (ترجمہ قرآن از شاہ رفیع الدین صاحب)

مثال:۔

ایسی ایسی اڈجھڑیاں باہم چلتیاں ہیں کہ دیکھنے والوں کی ماری ہیبت کے جانیں نکلیناں ہیں (آرائش محفل تالیف ۱۲۲۰ھ صـ۲۲)

(۱۵) مستقبل کا اصول دونوں زبانوں میں ایک ہے۔ یعنی واحد جمع میں گا اور گے کے اضافہ سے بنتا ہے۔

اُردو:۔ وہ آئے گا۔ وہ آئینگے۔ تو آئیگا۔ تم آؤگے۔ میں آؤں گا۔ ہم آئیں گے۔
پنجابی:۔ اوہ آوسگا۔ تو آوینگا۔ تسی آؤگے۔ میں آوانگا۔ اسی آوانگے۔

قدیم اردو میں آویگا اور آوینگے ہی بولتے تھے لیکن فصحائے متاخرین جنکی اصطلاحات کا کسی قدر تماشہ ہم گزشتہ سطور میں دیکھ چکے ہیں۔ آئیگا اور آئینگے کہنا پسند کرتے ہیں جمع مخاطب کی واؤ شاید انھیں نظر نہیں آئی۔ ورنہ وہ بھی اصلاح کی قربان گاہ پر چڑھادی جاتی اور ہم آج "تم آئیں گے" بولتے ہوتے۔ کم از کم اس صورت میں یکسانیت تو ہاتھ سے نہ جاتی۔

اردو:۔ وہ آئیگی۔ وہ آئینگی۔ تو آئیگی۔ تم آؤگی۔ میں آؤں گی۔ وہ آئینگی
پنجابی:۔ اوہ آویگی۔ اوہ اونگیاں۔ تو آوینگی۔ تسی آؤگیاں۔ میں آؤں گی
اسی آواں گیاں۔

قدیم اردو میں یوں گردان ہوتی تھی۔

وہ آدیگی۔ وہ آوینگیاں۔ تو آئیگی۔ تم آؤگیاں۔ میں آؤں گی۔ ہم آوینگیاں۔

مثال:-

اور جنت والے لوگ جس چیز پر نظر کریں گے۔ پیالیاں اس چیز کیاں بھر کر اوپر اس نیک بخت بندے کے لگیں گیاں۔ اور آپ میں ہٹ جائیں گیاں

دیگر:-

بعد اس کے حوریں بہشت گیاں اپنے ہاتھ سیں مالش کر کر اٹھاوینگیاں و عجز و انکسار سے دعا مانگیاں۔ (ہزار مسائل)

محمد امین دکنی:-

نہی معلوم تقدیر اس کے تئیں ہاں کہ کیا کیا مشکلیں آکل پڑینگیاں

(۱۶) امر کا قاعدہ اردو پنجابی میں بالکل ایک ہے۔

اردو:- دیکھ۔ کھا۔ لا۔ دے۔ پی۔ نکل۔ جا۔

پنجابی:- دیکھ۔ کھا۔ لا۔ دے۔ پی۔ نکل۔ جا۔

جمع مخاطب میں تعظیماً دونوں زبانوں میں ایک واؤ اضافہ کر دیا جاتا ہے۔

اردو:- جاؤ۔ کھاؤ۔ آؤ۔ اٹھو۔ چلو

پنجابی:- جاؤ۔ کھاؤ۔ آؤ۔ اٹھو۔ چلو

(پ) مصدر بمعنی امر دونوں زبانوں میں مستعمل ہے۔

اردو:- پڑھنا۔ سرکنا۔ آنا۔ جانا۔ یاد رکھنا۔ بھول نہ جانا۔ سلام کہنا وغیرہ۔

پنجابی:- پڑھناں۔ سرکناں۔ آوناں۔ جاونا۔ یاد رکھناں

عبد الحکیم ؎

ہیک طور ہیں تھوں یاد رکھناں کمینے نے اصیلاں نوں پرکھناں

(ب) اردو میں امر کے بعد "یے" بڑھا کر مضارع اور امر کا مفہوم ادا کرتے ہیں۔

یہ دستور پنجابی میں بھی موجود ہے۔

اردو۔ مصرع ؎

سنتا ہی نہیں میری دیوانہ کو کیا کہیئے

غالب ؎

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار اور جو مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

میر صاحب ؎

داد فریاد جا بجا کریئے شاید اس کے بھی دل میں جا کریئے

پنجابی۔ وارث شاہ

جدوں عشق دے کم نوں ہتھ لایئے پہلاں بد انام دہایئے جی
پھر نبی رسول پیغمبراں نوں دم دم درود پہنچایئے جی

(ج) اس صورت میں بعض اوقات "ی" "جیم" سے بدل جاتی ہے۔ اور "جے" بنا لیا جاتا ہے۔ یہ شکل بھی دونوں زبانوں میں موجود ہے۔

اردو۔ میر تقی میر ؎

ملا یا رب کہیں اس صید افگن سر بسر کیں کو کہ افشاں کیجیئے خون اپنے سر اس کے دامن دیں کو

پنجابی۔ عبدالحکیم۔

اکھن یارو کائی تدبیر کیجیئے کدی باہر ہریکے یار دیکھیے (یوسف زلیخا مہ ۲۲)

دکنی اردو میں یہی "جے" نون غنہ کے ساتھ بھی ملتی ہے

محمد امین ؎

ابی گردن اوپر ناخون لیجیں ہے یہ مطلب پدر سوں دور کیجیں

ایضاً

پچھیں سونگا اپن اس کر کہ لیجیں سمجھ کر دل بہتر یو کام کیجیں

مغربی مصنفین کہتے ہیں کہ "بے" پنجابی میں اردو سے آئی ہے لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ پنجابی کی مضارع اور ماضی احتمالی میں یہ شکل پہلے سے موجود ہے اور صیغۂ جمع متکلم میں ملتی ہے پھر اسے اردو سے لینے کی کیا ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابتدا میں یہ صرف جمع متکلم کا صیغہ تھا۔ بعد میں اس کا استعمال جمع مخاطب اور واحد مخاطب پر بھی تعظیماً ہونے لگا۔

(۱۷) "گا" پنجابی میں حال کے معنی بھی دیتا ہے۔ اردو میں اگرچہ اب تحریر میں متروک ہے۔ لیکن عوام بولتے ہیں۔ پرانے کلام میں موجود ہے۔

اردو:۔ وہ ہیگا۔ وہ ہیںگے۔ تو ہیگا۔ تم ہوں گے۔ میں ہوں گا۔ ہم ہیں گے

پنجابی:۔ اوہ ہیگا۔ اوہ ہیںگے۔ (ہینگے) توں ہیگا۔ تسی ہوگے۔ میں ہانگا۔ ہم ہینگے (ہانگے)

اردو:۔ وہ ہیگی۔ وہ ہینگی۔ تو ہیگی۔ تم ہوگی۔ میں ہوں گی۔ ہم ہینگی۔

پنجابی:۔ اوہ ہیگی۔ اوہ ہینگیاں۔ تو ہینگی۔ تم ہوگیاں۔ میں ہانگی۔ ہم ہاگیاں

میر تقی میر

ابر اٹھا تھا کعبہ سے اور جھوم پڑا میخانہ پر
بادکشوں کا جھرمٹ ہیگا شیشہ اور پیمانے پر

(۱۸) دعائیہ اردو اور پنجابی میں ایک ہی طریق پر ہے۔

اردو:۔ تجھے سانپ ڈسے

پنجابی:۔ تینوں سپ لڑے۔

(۱۹) لازمی و متعدی کا دونوں زبانوں میں وہی اصول ہے۔ اور متعدی بالواسطہ کا بھی وہی قاعدہ ہے۔

اُردو:۔ سیکھنا۔ سکھانا۔ سکھلانا۔ اٹھنا۔ اٹھانا۔ اٹھوانا۔ جگنا۔ جگانا۔ جگوانا
گلنا۔ گلانا۔ گلوانا۔

پنجابی:۔ سکھنا۔ سکھادنا۔ سکھلادنا (سکھالنا)۔ اٹھادنا۔ اٹھوادنا۔ جگنا۔ جگادنا
جگوادنا۔ گلنا۔ گالنا۔ گلوادنا۔

اُردو:۔ ٹوٹنا۔ توڑنا۔ تڑوانا۔ جلنا۔ جلوانا۔ پگھلنا۔ پگھلانا۔ پگھلوانا۔

پنجابی:۔ ٹٹنا۔ توڑنا۔ تروڑوادنا۔ جلنا جالنا۔ جلانا۔ پگھلنا۔ پگھالنا
پگھلوانا۔

اُردو میں بھی " جالنا۔ بالنا " وغیرہ کا رواج تھا۔ جواب متروک ہے
احمد دکنی۔

کیتا توں جلے ہور جالے مجھے   تیا کیا گلے ہور گالے منجے

(۲۰) معروف و مجہول کا وہی طریقہ ہے۔ پنجابی میں بھی" جانے" کی تعریف سے
مجہول بنایا جاتا ہے۔

اُردو:۔ لڑکی ماری گئی۔ لڑکا مارا گیا۔

پنجابی:۔ کڑی ماری گئی۔ منڈا مارا گیا۔

(۲۱) ندائیہ میں دونوں زبانیں متفق ہیں۔

اردو:۔ اے لڑکو۔ او لڑکیو۔ اے لڑکے۔ اے بھائیو۔ او بیرحم۔ او گدھے

پنجابی:۔ اے یا او منڈیو۔ اے یا نی کڑیو۔ او منڈیا۔ اے بھراؤ۔ او
بیرحم۔ او کھوتیا۔

(۲۲) نفی کے وہی معمولی کلمے۔ مثلاً نہ۔ نا۔ ناں۔ نہیں۔ نیں۔ ناہی۔ ناہیں پنجابی
میں بھی آتے ہیں جو ایک زمانے میں اردو میں بھی مستعمل تھے۔

جس موقعہ پر اردو میں نہ کرو اور نہ جاؤ کہیں گے۔ ایسی جگہ اہل پنجاب ناکرو

اور نہ جاؤ کہیں گے۔ مثلاً عبد الحکیم کہتے ہیں ؎

ولیکن ایہ خیانت نا کریساں   ایہو کا مغنے اپنے نہ لیساں

دیگر ؎

اسی گل نے مرا دل نا کرڑ دسسی   جو بیٹھوں ایہ سخن مولی نہ ہوسی

گویا "نا" زیادہ تر تاکید کے لیئے آتا ہے دکنی میں بھی "نا" موجود ہے۔

احمد دکنی قطب شاہی ؎

جو بندیاں تھے نا ہوئے گنہہ کا ظہور   تو کس داہ ہوئے نام تیرا غفور

دیگر ؎

رہا یوں سکی ساڈ موحیط ہو سئے   جو نا دودھ پیوے تو خوشی سو سوے

پنجابی میں اسکی ایک شکل "ناں" بھی ہے جو دکنی اردو میں بھی ملتی ہے

محمد امین دکنی ؎

یوسف کی خلق میں کیوں ہوا ناں   اے قائل باگہ میرا کیوں ہوا ناں

دیگر ؎

اکیلی ایک ساعت چھوڑنی ناں   شفقت دل ستی دے توڑتی ناں

(۲۳) امدادی افعال کے ذریعہ سے مختلف مقاصد کے اظہار کے لیے افعال مرکب بنا لینے کا طریقہ دونوں زبانوں میں رائج ہے۔ اردو میں اسکے لیے افعال آنا۔ ہونا۔ چکنا۔ رہنا۔ لگنا۔ چکنا۔ بیٹھنا۔ پڑنا۔ دینا۔ لینا۔ ڈالنا۔ جانا۔ کرنا چلنا۔ کھانا وغیرہ زیادہ مستعمل ہیں۔ ان میں سے اکثر افعال پنجابی میں بھی یہی مطلب دیتے ہیں۔ میں بعض کی مثالیں دیتا ہوں۔

ا۔ سکنا۔ وارث شاہ ؎

کی صفت ہزارے دی کر سکاں گویا بہشت زمین تے آیا ئے

(۲) عبدالحکیم سے

بہشتاں نوں بنا بیٹھے ٹکانہ

(۳) بھیج جانا۔ (۴) بن کم کر چکیاں ہاں (۵) بالک رودن (۶) اوہسدا ازہندا اے (۷) منڈا چلا گیا۔

عربی و فارسی الفاظ کی ترکیب سے جس طرح اردو میں بے شمار مصادر بنا لیے گئے ہیں۔ پنجابی میں بھی اسی طرح بنائے جاتے ہیں۔ مثلاً روشن کرنا۔ قربان کرنا۔ خاموش کرنا۔ ہوش آنا۔ مقصود پانا۔ داغ پانا۔ گرفتاری ہونا۔ حیران ہونا۔ سیر کرنا۔ آرام پانا۔ شور کرنا۔ فرمان دینا وغیرہ۔

گزشتہ سطور کے مطالعے سے ہم پر یہ امر واضح ہو گیا ہے کہ اردو اور پنجابی کی صرف کا ڈول تمام تر ایک ہی منصوبہ کے زیر اثر طیار ہوا ہے۔ ان کی تذکیر و تانیث اور جمع اور افعال کی تصریف کا اتحاد اسی ایک نتیجہ کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ اردو اور پنجابی زبانوں کی ولادت گاہ ایک ہی مقام ہے۔ دونوں نے ایک ہی جگہ تربیت پائی ہے اور جب سیانی ہو گئی ہیں تب ان میں جدائی واقع ہوئی ہے۔ ان زبانوں میں جو اختلاف دیکھا جاتا ہے وہ اکثر اس وقت واقع ہوا ہے جب اردو کی پرورش شعراء اور تعلیم یافتہ طبقہ نے دہلی اور لکھنؤ میں شروع کی ہے۔ انھوں نے اپنی دانست میں اردو کی اصلاح کی۔ مگر اکثر موقعوں پر دیکھا جاتا ہے کہ ان کی اصلاح اور ترمیم کے اصول نے ایک صرفی کے نقطۂ نظر سے زبان کے قواعد میں ابتری اور برہمی پیدا کر دی ہے۔ قدیمی اصول جن پر زبان کی تعمیر ہوئی تھی۔ جامع۔ مفید اور کار آمد تھے پرانی جمع کے قاعدہ کو انھوں نے بالکل بے کار اور باطل کر دیا۔ قلم زبان سے حروف علت و نون غنہ کے اخراج میں ہم ان سے متفق ہو سکتے ہیں۔ لیکن افعال:

اسماء سے جمع مؤنث کے ترک کرنے میں ہرگز ہرگز حق بجانب نہیں۔ اس نے زبان سے موسیقیت اور خوش آہنگی کے ایک بڑے عنصر کو برباد کر دیا گیا۔ کیا کوئی شخص میرزا دردا کے ان اشعار کی خوشنوائی سے انکار کر سکتا ہے۔ جو پرانی طرز میں لکھے گئے ہیں ؎

خاک و خون میں صحبتیں کیا کیا نہ رلیاں دیکھیاں — اے فلک باتیں تیری کوئی بھلیاں دیکھیاں
وہ رہا دست تاسف کے تئیں ملتا ہوا — جن نے وہ انکھیاں خمار آلودیاں دیکھیاں

اُردو میں قدیم زمانہ میں مرفوعی منصوبی اور مجروری حالتوں کے لحاظ سے تین شکلیں رائج ہوئیں۔ یعنی غماں۔ غموں۔ غمیں۔ پاساں۔ پاسوں۔ پاسیں۔ فکراں۔ فکروں۔ فکریں۔ بچھاں۔ بچھوں۔ بچھیں۔ راتاں۔ راتوں۔ راتیں۔ کدہاں۔ کدہوں۔ جدہاں۔ جدہوں۔ جدہیں۔ وغیرہ۔

لیکن بعد میں ان کے استعمال میں بے قاعدگی ہونے لگی اور حالت نصبی و مرفوعی و جارہ میں لوگ خلط ملط کرنے لگے۔ حتّٰی کہ قاعدہ بالکل ٹوٹ گیا۔ آج مؤنث کے علاوہ مذکر اسماء کے ساتھ کبھی یہ تینوں حالتیں نہیں ملتیں۔ جیسے لڑکیاں۔ لڑکیں۔ اسی طرح ہم کی شکل ہماں۔ ہموں اور ہمیں ہونی چاہیے۔ لیکن ہماں نہ آج ملتا ہے نہ پرانے شعراء میں۔ ہموں متاخرین نے ترک کر دیا۔ لیکن پرانے شعراء میں ملتا ہے۔ محمد امین کہتے ہیں ؎

تو ہم اک باگ ماریں گے دس مل — ہموں کو کیا تمھیں بوجھے ہو کاہل

دیگر ؎

ہموں نے دیکھ اس کو گھٹا دکھائی — بدن اوپر چھریاں ہاتھوں لگائی

ہمیں خدا کے فضل سے آج بھی زندہ سلامت ہے۔ علیٰ ہذا۔ غماں غموں اور غمیں میں متاخرین نے غماں اور غمیں دونوں کو متروک الاستعمال کر دیا۔ غموں آج تک

جیتا ہے۔ غمال گذشتہ صدی میں ترک ہوا جسکی مثال ضرورت نہیں۔ رہا غمیں
اس کی مثال سنیئے محمد امین سے

تو ادل پی پچھوں دے دے امین کو امین پی کر بھلا دے سب غمیں کو
غمی جا دے نکل خرمی اے تری امداد سیتی مرتبہ پائے

(۱) تا کچھ عرصہ قبل ترک ہوا ہے۔ راتوں اور راتیں آج بھی حتیٰ د قائم ہیں مگر
پارسال۔ پاسوں۔ پاسیں۔ آج بالکل مردود ہیں۔ ان کی یادگار پاس رہ گیا ہے
اسی طرح کدہاں۔ کدہوں کدہیں۔ جدہاں۔ جدہوں۔ جدہیں اردو سے ہمیشہ
کے لیے رخصت ہو گئے۔ ان امور سے امر منکشف ہوتا ہے کہ زبان کا دائرہ روز
بروز تنگ اور محدود ہوتا جارہا ہے۔

آمدم برسر مطلب۔ ابھی تک ہم نے صرفیانہ طریق پر دونوں زبانوں کا مطالعہ
کیا ہے ذیل میں ہم ایسے مواد پر نظر ڈالیں گے جو دوسری زبانوں کے مقابلہ
میں اردو اور پنجابی میں عام ہے۔ ہم نے اس غرض سے مروجہ اردو سے اعراض
کر کے ایسے نمونوں کو لیا ہے جو قدیم اردو سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کا اکثر حصہ آج
متروک الاستعمال قرار دیا گیا ہے۔ دوسری طرف وہی مواد پنجابی زبان میں بجنسہ
یا کسی قدر تغیر کے ساتھ آج بھی موجود ہے۔ اس مطلب کے لیے میں نے دکنی اردو کو لیا
ہے جس کے ادبیات کی قدامت اردو میں مسلم ہے۔

(۱) سب سے پیشتر ان زبانوں کی وحدت و جمعیت کے متعلق ہمیں کسی قدر اور
جاننے کی ضرورت ہے۔ ان زبانوں کی جمع کا اثر تمام جملہ پر محیط ہے وہ نہ صرف
جملہ کے فاعل بلکہ اسکے متعلقات یعنی اسمائے صفات۔ اضافات۔ حالیہ ضمائر
افعال اور ان کے توابعات تک پر آمر ہوتا ہے۔ اس کی طاقت کے اندازہ
کے لیے ہم ذیل کا جملہ ناظرین کو پیش کرتے ہیں۔

مرنے والی لڑکیوں کی مائیں روتی روتی کہتی تھیں۔
پنجابی میں یہی فقرہ۔ آج یوں لکھا جائے گا۔
مرن والیاں کڑیاں دیاں ماداں روندیاں کہندیاں سن۔
اردوئے قدیم میں اس طرح لکھا جاتا۔
مرنے والی لڑکیاں کیاں مائیاں روتیاں روتیاں کہتیاں تھیاں۔
کیا پورا جملہ جمع کا گلدستہ بن گیا ہے۔ میں بعض مثالیں اور یہاں درج کرتا ہوں۔
عبدالحکیم پنجابی ؎

کیتوسو قید نے زخمی ہزاراں نے قیدیاں زخمیاں لایاں قطاراں

...بگرسہ

...بی سریاں غلاماں سسی ہزاراں جو گھڑیاں ہر طرف لایاں قطاراں

احمد دکنی قطب شاہی سہ

جو ڈال کو ٹلی سو کو ٹلا نہال سو کوٹلیاں کلیاں ٹک کھلیاں اب تشکال
گیا تھیاں آسمان و پردے ڈالیاں انو پر تے فرشتے خشل چڑیاں

...لیکھا سہ

...ی اور بوت جہاں جہاں باجتیاں تھیاں نفیراں کی آواراں گاجتیاں تھیاں

...س قاعدہ کی دکن اور پنجاب کے ساتھ خصوصیت نہ تھی۔ بلکہ دہلی کے فصحا بھی اسی ...نگ میں لکھتے تھے۔ میں یہاں سودا کا ایک اور شعر نقل کرتا ہوں۔
محمد امین دکنی سہ

جب لبوں پر یار کے مسی کی دھڑیاں دیکھیاں
جوں زحل کی ساعتیں اس دل پہ گڑیاں دیکھیاں

(۲) پنجابی میں آ۔ وا۔ کھا وغیرہ امر کے علاوہ ایک اور امر ہے جو معمولی امر

کے آخر میں "ہیں" یا "دیں" کے لانے سے بنتا ہے۔ جیسے آدیں۔ جادیں۔ لادیں کھادیں۔ ڈالیں وغیرہ پنجابی شاعر عبدالحکیم کہتے ہیں ؎

الٰہی عزت اپنی رسائیں شفیع ساڈا رسول لئد کرائیں

دیگر ؎

جدو کنعاں شہر اندر رسد مادیں کھڑ کھڑ دات دیسے مائیں جادیں

جہاں تک معلوم ہوا ہے امر کی یہ شکل خاص پنجابی کے ساتھ مخصوص ہے اور دوسری زبانوں میں نہیں ملتی۔ لیکن بہت کم لوگ اس امر سے واقف ہیں کہ قدیم اردو میں بھی یہ شکل موجود تھی۔ چنانچہ محمد امین دکنی ؎

ایں دل میں خدا کا عشق راکھیں مجازی عشق کون سب کاڑ نا کھیں

دیگر ؎

مرے محبوب کو عزت سوں لا میں براق جنتی اوپر بٹھائیں (یوسف زلیخا)

محمد خوب اپنی مثنوی خوب ترنگ تالیف ۹۸۶ھ میں لکھتے ہیں۔

جو مجنوں تھا پہلی شاں وہ مجنوں مت کریں گماں

دیگر ؎

یہ لیلیٰ کا پہلا چال خوب سمجھیں نہیں آتال

شاہ میرانجی شمس العشاق متوفی ۹۰۲ھ ۔

ایسا کیرا کرب نرا کہیں جے توں ہوسی سورا

مان راکھ مرشد ملا دسے جس ہے گیان کپورا (اردو حصہ بست و ششم ۱۹۲۸ء)

(۳) "گا" کے مستقبل کے علاوہ جو پنجابی اور اردو میں عام ہے۔ پنجابی میں ایک اور مستقبل ہے۔ جو "سی" کی تصریف سے بنتا ہے۔ اس کا تعلق زیادہ تر لہندا یا ملتانی سے ہے۔ اس مستقبل کا صیغہ واحد غائب دکنی میں کہیں استعمال ہوتا دیا ہے

چنانچہ احمد دکنی قطب شاہی ؎

کدہیں سیج سنگ سنگ ملسی نہ منجہ کدہیں من کمل پھول کھل سی نہ منجہ (ملی مجم)

ولی دکنی ؎

کہاں ہے زہر کا تاثیر اس میں
نہ چل سی کچھ مرا تدبیر اس میں (روضۃ الشہدا ص ۹۴)

بقول مولوی عبدالحق صاحب کتاب سبرس مولانا وجہی نے ۱۰۴۵ھ کے لگ بھگ طیار کی ہے۔ اس میں فقرہ ذیل ملتا ہے۔

جس میں عشق کا کچھ درد اس کتاب کو سینے پر تے ہلا سی کرنا۔ اس کتاب بغیر اپنا وقت بہلا سی نا۔

مولوی عبدالحق صاحب نے رسالہ اردو حصہ بست ششم میں میراں جی شمس العشاق کی تصنیفات پر ایک مضمون لکھا ہے اس میں شعر ذیل ملتا ہے۔

نوں جس کو بہاوے جوڑ ناجا سی یہ گن چھوڑ (ص ۱۹۶)

"سی" کی جس قدر شاخیں ملتی ہیں۔ مثلاً گجراتی۔ مارواڑی۔ جے پوری۔ نیماڑی اور ملتانی جس کی تصریف حسب ذیل ہے۔

گجراتی۔

ہوں مارس۔ تو مارسے۔ تے مارسے۔ ہم ماری سوں تھے مارسو۔ تیو مارسے

مارواڑی جیسلمری:۔

ہوں مارس۔ تو مارس۔ او مارسے۔ مھے مارساں تھے مارسو۔ تیو مارسے۔

جے پوری:۔

ہوں مارشوں۔ تو مارشی۔ او مارشی۔ نہے مارساں۔ بھے مارشو۔ او مارشی۔

(بعض علاقوں میں سین مہملہ کے ساتھ بولا جاتا ہے)

تیمادی:۔

ہوں مارسں۔ وہ مارسے۔ ہم مارساں۔ تم مارسو۔ وہ مارسے۔

ملتانی:۔

میں مریساں۔ تو مریسیں۔ او مریسی۔ اساں مریسوں۔ توساں مریسو۔ او مریسن۔ میں رسیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ہی قسم کا مستقبل دکنی زبان میں کہاں سے لیا گیا ہے۔ ہماری نظریں قدرتاً گجراتی زبان پر پڑتی ہیں جو ہمسایہ زبان ہے لیکن گجراتی میں یہ صیغہ یہ یائے مجہول ہے (یا "شے" یہ ہائے مجہول جیسا کہ سورت میں بولتے ہیں) اور دکنی میں یہ یائے معروف ہے۔ اس لیے گجراتی سے ماخوذ نہیں بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راجپوتانہ سے آیا ہے۔ کیونکہ مولوی عبدالحق صاحب نے اسکی جو اور شکلیں دی ہیں یہ ہیں۔

ہمیں ناکرسیں۔ نادیکھسوں۔ کرسوں۔ کہسوں (صفحہ ۵۴۲) رسالہ اردو حصہ بست و ہفتم۔)

اور جواہر اسرار اللہ علیجیو گام دہنی میں یہ شکلیں ہیں:۔

واحد غائب:۔

کرسیو۔ کرے گا (کھوٹے گھونگٹ گل لادے تھندا کرسیو تپتل سینال، کرسیو باتاں باتیں کرے گا۔ جاسی جائے گا۔ ملاسی۔ ملائے گا۔

واحد حاضر:۔

دیکھسی توں۔ تو دیکھے۔ تو کرسی۔ تو کرے گا۔

واحد متکلم:۔

جاں ندیسوں۔ جانے نہ دوں گا۔ دہر سو۔ دہر دنگا۔ ملے سوں۔ ملوں گا۔
وں سو۔ ملونگا۔ کردں ہو۔ کروں گا۔ ہیں سو۔ میں ہوں۔

احمد دکنی:-

مجھے نت من مت موں سشادی شراب
برہ کی خماری سے ہیں سو خراب

(۳) "کھڑا" اردو میں عام طور پہ آتا ہے اس سے کھڑا ہونا اور کھڑا رہنا وغیرہ
مصادر بنالیے گئے ہیں اور محاورے بھی بنائے گئے ہیں۔ اہل لغات اس کا
ماخذ پراکرت کا "کھنڈداد" بتاتے ہیں اس توجیہ کے بجائے میں یہ مناسب سمجھتا
ہوں کہ پنجابی مصدر "کھڑنا" کی ماضی یا اسم مفعول مان لیا جائے "کھڑنا" کے
معنی پنجابی میں چلنا اور ٹھہرنا ہے۔ پچھلے معنی کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

عبدالحکیم سے

لہیا بک سسن اساڈی گاں کھڑ گے
کہیا کوئی نہیں ہیں نال کھڑ کے

دیگر سے

ابی ساریاں غلامی ہزاران
جو کھڑیاں ہر طرف لایا قطاراں

دکنی میں اکبری عہد کے شعرا میں یہ مصدر موجود ہے۔ احمد دکنی سے

کہاں قیس سوں تجھ نسبت کھڑے
جو انہی ہماری شرم بہیں پڑے

دیگر سے

اگر اپنی حد سے پرکت پڑے
پچھانے جارہاں کام آکر کھڑے

افسوس ہے کہ اب عقبہ اور کار آمد مصدر ہماری زبان سے متروک ہو گیا۔
(۵) "تھا" اس غریب کو لغات نگاروں نے مصدر "ہونا" کا پسر خوانده بنا
دیا ہے۔ ان کا بنا دیا ہے کہ یہ "ہونا" کی ماضی ہے۔ جب یہ کہا جائے کہ ہونا کی
ماضی "ہوا" ہے۔ تو وہ کہتے ہیں کہ ہاں وہ بھی ہے۔ اور بھی سنسکرت اور

پراکرت کی شکلوں کی انتہا بھی دی جاسکتی ہے ہم یہ کیا قبول یا جا سکتا ہے لیکن ایک موٹی سی بات یہ ہے کہ کیا یہ ضروری ہے کہ ہر لفظ سنسکرت کے ماخذ سے نکالا جائے اب میں بجائے اس کے کہ "تھا" کو "ہونا" کے گھ بانڈ سمجھوں اور پھر ہونا کو سنسکرت کے "بھو" سے استخراج کروں یہ زیادہ موزوں سمجھتا ہوں کہ اس کو ملتانی زبان کے مصدر "تھیونا" (بمعنی ہونا) کی ماضی مان لوں۔ تھیونا کی ماضی تھیا آتی ہے۔ اردو والوں نے تھیا سے شمام سمجھ کر اڑا دیا اور تھا بنا لیا۔ تھیا اس قدر قدیم ہے کہ ہندی کا سب سے قدیم جملہ جو ہماری تاریخ میں ملتا ہے اس میں موجود ہے۔ وہ جملہ یہ ہے۔

"برکت شیخ تھیا اک مارک تھیا" (تاریخ فیروز شاہی من شمس سراج عفیف ص۲۲۱)

اس جملہ میں ایک خوبی یہ ہے کہ اسے سندھی بھی کہا جاسکتا ہے پنجابی بھی اور اُردو بھی۔ سندھ پر محمد تغلق ۷۵۲ھ میں حملہ کر ہی رہا تھا کہ فوت ہوگیا۔ فیروز شاہ نے اپنی تخت نشینی کے بعد پھر سندھ پر حملہ کیا۔ لیکن فوج میں قحط اور جانوروں میں وبا پھیل گئی اس بنا پر وہ سندھ کا محاصرہ چھوڑ کر براہ ریگستان گجرات روانہ ہوگیا اس وقت ہمارا مورخ لکھتا ہے کہ سندھیوں نے یہ جملہ کہا۔ اس جملہ کا مطلب ہے کہ شیخ کی برکت سے ہمارا ایک دشمن مرگیا۔ اور ایک بھاگ گیا۔

پنجابی سے دو ایک مثالیں ملاحظہ ہوں۔

مولوی عبداللہ سے

اول صفت ثنا نبیوں رب تھیں بعد رسول
پڑھو صلوٰۃ اتارہ ہیجو دائم تھیو قبول (نص فرائض ص۵)

دیگر سے
حضرت سایہ زمیں نہ پوندا حکمت بجھ کیا
مت سایہ نے کوئی پیر دھرے سایہ منع تھیا (نص فرائض ص۶)

(۶) پنجابی میں بعض مصادر کی ماضی خلاف قاعدہ آیا کرتی ہے مثلاً کرنے لینے دینے اور رہنے کی ماضی کیتا۔ دیتا۔ لیتا اور رہیتا بھی آتی ہے جو واحد جمع اور تانیث کی صورت میں ملتی ہے۔ برج بھاشا راجستانی اور اودھی میں بالکل غیر مکمل ہے لیکن قدیم اردو میں کثرت کے ساتھ ملتی ہے پنجابی کی مثالیں دینا فضول ہے اس لیے کہ آج بھی اس ماضی کا رواج ہے۔ لیکن میں اردو کی مثالیں دیتا ہوں۔ احمد دکنی سے

اگیانی دے گیان سبتیں جواب   دیتا ہو رکتیا ادب سوں خطاب

دیگر سے

فرشتے جو آدم کو سجدہ کرتے   سو یہ ماں اُدم بچن نہے لینے (لیلیٰ مجنوں)

محمد امین سے

نبی جاگے انھوں نے عرض کیتی   بڑائی رب نے تم کون آج دیتی

دیگر سے

جو کچھ تم لے لیا سو ہم نے لیتا   جو کچھ تم نے کیا سو ہم نے کیتا (یوسف زلیخا)

برج بھاشا و دیگر زبانوں میں اس کے مقابلے میں کیتا۔ دینا اور کینو دینو وغیرہ ملتا ہے۔ مثلاً سورداس سے

دھنپتی ہوڑ کرت آپس میں شام کھلونا کینو ری
سورداس پربھو برہم سناتن ست ہتکاری دودسوری

اور محمد جائسی سے

سو ہنسکے راج رجائیں دینہاں   میں درسن کارن تپ کنہاں

لطف یہ ہے کہ یہ شکل بھی اردو میں رائج ہے اگرچہ دکنی میں نہیں ملتی محمد افضل جھنجانوی سے

بہت مدت ہوئی آ ونکینا — نہ کاگت ہی کسی کوں لکھ دینا (بکٹ کہانی)

(۱)، پنجابی میں قاعدہ ہے کہ غیر زبان کے آخر میں اکثر یائے زائدہ اضافہ کردیا کرتے ہیں جس کے بظاہر کوئی معنی نہیں ہوتے۔ جیسے نظر سے نظری اور حیات سے حیاتی۔ چنانچہ عبدالحکیم ؎

میں تیرے دامن اندر دست پایا — تیرے جیہا کوئی نظری نہ آیا

دیگر ؎

اہی یک رات خوش وانگوں حیاتی — پیا وچ زندگی عالم سماتی

دکنی میں بھی یہ دستور موجود ہے۔ محمد قلی قطب شاہ متوفی سنہ ۱۰۲۰ھ

کہو رات کن سات کیتی ہیں باتاں — کہ چوتا ہے من تھے رنگ خماری

احمد دکنی قطب شاہی شاعر دربار محمد قلی قطب شاہ ؎

مجھے نت من مت سوں شادی شراب — رہ کی خماری تھے ہیں سو خراب (لیلیٰ مجنوں)

محمد امین ؎

غمی دے کر خوشی کون مارکاڑے — زمانہ یوں ہیٹ عالم کو بارے

ایضاً۔ ہماری موت اوران کی حیاتی — اگر ہوتی تو مجھ کوں اے خوش آتی

"۔ غروری کا پیالہ جن پیا ہے — انے اپنے سراد پر دکھ دیا ہے

اگر یہ موت مجھ دیتا الٰہی — انے یوسف کے تیں دیتا پناہی

(یوسف زلیخا)

ولی دکنی:۔

یہ خاک کربلا کی ہے نشانی — تو مہرخ ہوئیگا جس بن نہانی

(جنگ نامہ شہید اعظم)

یہ قاعدہ اردو میں بہت دیر تک رہا ہے حتیٰ کہ خواجہ آتش کے ہاں بھی ملتا ہے چنانچہ

؎ بہار گلستاں کی آمد آمد ہے — خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے

اور اب بالکل متروک ہے مجھے معلوم نہیں کہ اہل اردو اس "ی" کی کیا توجیہہ بیان

کہوتے ہیں۔

(۸) مانگا تانگا اور مانگے تانگے ایک محاورہ ہے۔ اور اردو میں بالعموم مستعمل ہے اس کے لیے اہل لغت کہتے ہیں کہ:۔

"مانگا تانگا۔ (۵) صفت:۔ اول بمعنی مانگا ہوا۔ دوم تابع مہمل۔ قرض لیا ہوا ادھار لیا ہوا۔ مستعمال لیا ہوا۔ عاریتاً لیا ہوا۔" (فرہنگ آصفیہ)

اور تانگے مانگے کے لیے کہا ہے:۔

"تانگے مانگے:۔ ۵۔ تابع فعل۔ مانگے مونگے۔ مانگ تانگ کر مستعار لے لوا کر ادھار لے لوا کر۔ جیسے مانگے تانگے کام چلے تو بیاہ کرے بلا۔ یعنی کام جب ہی چلتا ہے جب اپنی گرہ سے صرف کیا جائے۔" (فرہنگ آصفیہ)

ہمارے لغت نگار تانگا اور تانگے کو تابع مہمل کہتے ہیں۔ اور مجھے نہیں معلوم ان کے پاس اسکی کیا وجوہ ہیں۔ میں نے کئی دوستوں سے جن کا پایہ اردو میں بلند ہے دریافت کیا۔ بعض نے کہا کہ تانگا مہمل ہے اور بعض نے کہا کہ عبارت میں موسیقیت پیدا کرنے کے لیے ایک ہموزن مصنوعی لفظ گھڑ لیا گیا ہے۔ قصہ مختصر اردو میں ایسے بیسیوں الفاظ ہیں جن کو ہمارے اہل لغات نے بے معنی سمجھ کر تابع مہمل کی ذیل میں داخل کر دیا ہے۔

جب ہم پنجابی زبان پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ با معنی ہے اور مصدر تانگھنا سے مشتق ہے اور مانگھنا کا مرادف ہے۔ عبدالحکیم سے

نہیں لیکن کسے دی تانگ اوسنوں — عزیز مصر لائی سانگ اوسنوں
دیگر سے۔ سنائی عشق تیری مانگ وسنوں — رہے ہر دم تساڈی تانگ اوسنوں

اور فعل کی مثال ہیں یہ شعر:۔

زلیخا جے زلف دی تار تانگے — کیے یوسف پھری اے کاں تانگے (احمد یار)

(۹) اسی طرح چپ چپاتے اور چپ چپاتا ہے۔ جس میں چپاتے کو اہل اردو تابع مہمل مانتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ چپاتا محض حسن کلام کے لیے بڑھا دیا گیا ہے اور بے معنی ہے لیکن جب پنجابی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بامعنی لفظ ہے کیونکہ اس زبان میں برخلاف اردو کے وہ علیحدہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ عبدالحکیم ؎

جدن یعقوب اس گل نوں پھانا ۔ عذر آکھن کنوں ہویا چپاتا

چپاتا۔ چپ کا مترادف ہے۔

(۱۰) دن دہاڑے ایک اور محاورہ ہے۔ اہل اردو دہاڑے کو بھی تابع مہمل مانتے ہیں اور حسب معمول غلطی پر ہیں۔ دہاڑا در حقیقت پنجابی لفظ ہے اور دن کے معنی دیتا ہے اور اردو کے برخلاف تنہا مستعمل ہوتا ہے۔ عبدالحکیم ؎

آیا چوتھے دہاڑے قافلہ گھبر ۔ شہر مدین کنوں اس کھوہ دے نیڑ

(۱۱) اسی طرح ہلنا جلنا۔ اور ہل جل وغیرہ ہیں۔ اس میں اردو خواں جلنے کو ہلنے کا تابع مانتے ہیں جس کے کوئی معنی نہیں بتاتے۔ حالانکہ پنجابی میں جُلنا چلنے کے معنی میں آتا ہے اور آج بھی مستعمل ہے۔ قدمائے اردو اس لفظ سے واقف تھے۔ امیر خسرو فرماتے ہیں ؎

من کر بر سر نمی نہادم گل ۔ یار بر سر نہاد و گفتا جُل

یہ محاورے ہمیں ان ایام کی یاد دلاتے ہیں جبکہ مسلمان لاہور سے کوچ کرکے دہلی جاکر آباد ہو گئے ہیں۔ اور اپنی زبان میں دہلی کی زبان کا پیوند لگا رہے ہیں کیونکہ یہ محاورے ہندی الفاظ اور ان کے مرادف پنجابی الفاظ سے مل کر بنتے ہیں اسی قسم کے اور محاورے بھی ہیں۔ جیسے برتن بھانڈا یا باسن۔ بھانڈا گورا۔ چٹا۔ بھلا چنگا۔ موٹا جھوٹا۔ سنڈا مسٹنڈا۔

(۱۲) یائے مخلوط قدیم زبانوں میں اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں ملتی ہے چنانچہ اردو میں متروک ہے اور پنجابی میں اب بھی بدستور موجود ہے اردو میں اب وہ صرف دو چار الفاظ میں ملتی ہے۔ جیسے کیا اور کیوں وغیرہ یائے مخلوط افعال و الفاظ میں اکثر آتی تھی۔ اور حرف ماقبل کے ساتھ مخلوط ہو کر تلفظ میں آتی تھی۔ مثلاً لکیا۔ منگیا۔ ہویا۔ پڑیا۔ رہیا۔ جلیا۔ چڑیا (چڑھا) کہیا۔ لیائی۔ چلیا۔ بڑیاں کا (بڑوں کا) جانیا۔ چھوٹیا۔ لکھیا۔ مانیا۔ سنگیار یا (سنگھارا) دیکھیا وغیرہ۔

اس قاعدہ کا دونوں زبانوں میں اس قدر زور رہا کہ غیر زبانوں کے الفاظ پر بھی اس کا اجرا ہونے لگا۔ مثلاً دینا۔ دریا۔ اور خیال کی "ی" حرف سابق کے ساتھ ضم ہو کر بولی جاتی تھی۔ عبدالحکیم پنجابی ؎

دنے راتیں گذاریں اسطرح نال ‏ نہ ہو دس دور دسوں یار وا خیال

احمد دکنی ؎

جو لیلی دیکھی مائی تھے یو غضب ‏ اوٹھی وکہ دریا آگ کی موج تب

دیگر ؎

یہی ہے میرا حال اب سرو کال ‏ میرے حال کا خیال سٹ دیوا تال

اور محمد امین دکنی ؎

دیتے دیتے جب اس کا مال کھوٹا ‏ خلق سیتی تب اس کا خیال چھوٹا

بلکہ خیال کا لفظ خود میر نے اسی تلفظ کے ساتھ استعمال کیا ہے ؎

عشق برسے ہی خیال پڑا ہے چین گیا آرام گیا
دل کا جانا ٹھہر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

میر حسن صاحب نے حسب روایت مولانا آزاد خیال کی "ی" کے متعلق یہ عذر پیش کیا ہے:۔

"آپ بموجب ان کتابوں کے کہیں گئے کہ خیالی کی "ہ" کو ظاہر کر دیکھو "کہیں گئے" ہی " تقطیع میں گرتی ہے۔ مگر یہاں اس کے سوا جواب نہیں کہ بجا دیا نہیں ہے۔ (آب حیات)

(۱۴) پنجابی زبان کی ایک عالمگیر خصوصیت یہ ہے کہ تمام ایسے الفاظ کو جن میں ثانی حرف علت ہو، بہ تخفیف حرف علت تلفظ کیا جاتا ہے۔ مثلاً۔ کان۔ ناک۔ ہاتھ اور لات پنجابی لہجہ میں کن۔ نک۔ ہتھ اور لت بن جاتے ہیں۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ ایسے الفاظ میں برج بھاشا میں پہلے حرف کے بعد حرف علت اضافہ کر دیا جاتا۔ مثلاً پک پانی۔ بھاشا میں جا کر پاک بن گئی۔ اردو میں جو پنجابی اور بھاشا کے بین بین ہے اس قاعدہ کا اثر بہت نمایاں ہے۔ اردو دونوں زبانوں کی مقلد ہے کبھی برج کی تقلید کرتی ہے اور کبھی پنجابی اور کبھی دونوں کی۔ مثلاً اردو بھی جگنا بھی بولتے ہیں اور جاگنا بھی۔ لیکن اکثر موقعوں پہ دیکھا جاتا ہے کہ اردو کا میلان زیادہ تر پنجابی قاعدہ کی طرف ہے۔

بھاشا	پنجابی	اردو	بھاشا	پنجابی	اردو
بھیانک	بھنکل	بھیکل	کھیال	کھیڈ کھیل	کھیل
چاچا	چچا۔ چاچا۔	چچا	ہاسا۔ ہانسی	ہاسا	ہنسی
کاپوت	کپوتر	کپوت	چاکھنا	چکھنا	چکھنا
راہے	رہو	رہے	ماکھی	مکھی	مکھی
باندر	باندر	بندر	سانپ۔ سرپ	سپ	سانپ
باجنا	بجنا	بجنا	دہاتورہ	دھتورا	دھتورہ
پاٹی	پٹی	پٹی	کاچا	کچا	کچا
بھانگ	بھنگ	بھنگ	ناہر	نہر	متروک ہے

بھاشہ	پنجابی	اردو	بھاشہ	پنجابی	اردو
اچھر	مچھّر	مچھّر	پاتھر	پتھر	پتھر
باکا	پکّا	پکّا	کاندھا	کندھا	کندھا
جھاڑو	جھڈّو	جھوڑو	آگ	آگ	آگ
کھاٹا	کھٹّا	کھٹّا	جھوٹ	جھو	جھوٹ
سارنج.ساچ	سچ	سچ	ناکڑی	نکڑی	نکڑی
گاندھی	گندھی	گندھی	پاگ	پگ	پگڑی
گھانٹی	گھنٹی	گھنٹی	کانچلی	”	کینچلی
بادل	بدّل	بادل،بدّل	بلائی	بلّی	بلی
ہاڈی	ہڈی	ہڈی	آگے	اگے	آگے
پاچھے	پچھّے	پیچھے	ماٹی	مٹی	مٹی
لادنا	لدنا	لادنا.لدنا	کھٹ	”	کھٹ. کھاتے
کھاند	کھنڈ	کھانڈ	بھانڈ	پھنڈ	پھانڈ
مانگنا	منگنا	مانگنا	مونگ	منگ	مونگ
ٹوٹنا	ٹٹنا	ٹوٹنا	پاکنا	پکنا	پکنا
جاواسہ	جوانسہ	جوانسہ	لاکڑی	لکڑی	لکڑی
ساجی	سجّی	سجّی	اچھا	اچھا	اچھا
کھیچڑی	کھچڑی	کھچڑی	کانکر	کنکر	کنکر
آنڈا	انڈا	انڈا	چاول	چول	چاول
ماٹ	مٹ	ماٹ	چالنی	”	چلنی
چاکی	چکی	چکی	کال	کل	کل

بھاشا	پنجابی	اردو	بھاشا	پنجابی	اردو
پانسلی	پسلی	پسلی	پوتلی	پتلی	پتلی
چھاج	چھج	چھاج	آنب۔آم	انب	آم
جاموں	جمّوں	جاموں	ٹھیکری	ٹھکری	ٹھکری
پھول	پھُل	پھول	ٹیکا	ٹکّا	ٹیکا
تاتا	تتّا	تتّا	ڈھانکنی	ڈھکنی	ڈھکنی
چولھا	چلھا	چولھا	تال	تل ۔ ٹلا	تال ۔ تالاب
گاڈی	گڈی	گاڈی	جاٹ	جٹ	جاٹ
ماسہ	مسّا	مسّا	موکی	مکّی	مکی
ہاٹ	ہٹ	ہاٹ	مول	مُل	مول
ادکھلی	اُکھلی	اوکھلی	جھاگ	جھگ	جھاگ
ریچھ	رچھ	ریچھ	کانگھی	کنگھی	کنگھی
اون	اُن	اون	آنگن	×	آنگن
بوڈھا	بڈھا	بڈھا	کام	کم	کام

(۱۴) اے ، ایہ اور اوہ اسمائے اشارہ ، قریب و بعید کے لیے پنجابی کے ساتھ مخصوص ہیں اور آج بھی رات دن بولے جاتے ہیں ۔ دکنی اردو میں دونوں موجود ہیں اور وہی مقصد ادا کرتے ہیں ۔ پنجابی کی مثالیں دینے کی ضرورت نہیں دکنی کی ذیل میں عرض ہیں۔

محمد امین سے

کدھیں روتی کدھیں ہنستی رتی اد ۔ کدھیں چپ اور کدھیں باناں کتی اد

دیگر۔ کدھیں ہنستے کے تئیں غمگیں کرے اد ۔ کدھیں غمگیں کے دل شادی بھرے اد

دیگرے

نہیں بھڑنے ایسے کچھ لاگتی یار   کدہوں لے یار ہے کدہوں اے اغیار

دیگرے

گجے اک گال میرے دیکھ تازہ   نہیں لے گال کچھ محتاج غازہ

(۱۵) حالت مجروری میں پنجابی میں کسی لفظ کے آخر "دن" بڑھادیتے ہیں مثلاً پچھوں، ہاتھوں یعنی پیچھے سے اور ہاتھ سے۔ عبدالحکیم سے

پچھوں اس تھیں کرائی بیہوش ہو کے   سوتی نادذہ توڑے اٹے دہو کے

دکنی میں بھی یہ قاعدہ موجود ہے۔ مثلاً محمد امین سے

بنی کا حال دیکھا آکے نظروں   کمر گئی ٹوٹ اس دہشت کی فکروں

حالت ظرفیہ میں "ین" لفظ کے آخر میں پنجابی میں لگا دیا جاتا ہے۔ مثلاً عبدالحکیم سے

رہا ہر فرد بے بہرہ اجایا   دے یوسف رہا بختیں سوایا

دکنی اردو میں بھی یہی دستور تھا۔ محمد امین سے

بہت آرام تھا ساری خلق کوں   نماری کوئی اس راتیں پلک کوں

(۱۶) بعض خلاف قیاس جمع دکنی میں ملتی ہے جو پنجابی کے بہت مطابق ہے مثلاً سات کی جمع ستیں۔ دو کی جمع دوہوں۔ اور برس کی جمع براں پنجابی میں یہ جمع یوں آتی ہے۔ ستے دوہوں اور دریاں۔ احمد دکنی جو محمد قلی قطب شاہ کے دربار کے شاعر ہیں لکھتے ہیں سے

جو احمد کرے اس دہر ین سنگار   سو اب شہ تھے پائے ستیں سنگار

دیگرے

رتن شعر کے ہب دوہوں جگ امول   دوہوں جگ چھپاؤں رتن رول دل

اور محمد امین دکنی سے

دوزخ کی اگن کوں رب نے دھوئی — کدیں لاکھوں ہواں عجل میں ڈبوئی

(۱۷) جب ہم مصدر کو منصرف کرنا چاہتے ہیں تو اردو میں قاعدہ ہے کہ مصدر کے آخری حرف الف کو "ی" سے بدل دیتے ہیں۔ مثلاً نکلنا سے نکلنے جانا سے جانے وغیرہ بنا لیتے ہیں۔ یہ قاعدہ پنجابی میں بھی موجود ہے۔ مثلاً عبداللہ سے

لب اوس دے تر کھیوں خون کھاونے نوں — کرے لب خندہ دل دے چاونے نوں

لیکن پنجابی میں زیادہ رائج طریقہ یہ ہے کہ مصدر کے آخری الف کو اس مطلب سے گرا دیا جاتا ہے مثلاً کہن لگیا کہنے لگا۔ ون لگیا۔ رونے لگا۔ مارن لگیا۔ مارنے لگا وغیرہ۔ عبدالحلیم سے

چھپنے اس دے لگے گوہر وساون — تصدق سر زلیخا دے کراون

دیگر سے

پاکنعاں دے وچہ کالی ظاہر — لگی تکن خش دی جان باہر

اب قدیم اردو اس قاعدہ میں بالکل پنجاب سے ہمنوا ہے۔ محمد افضل جھنجھانوی متوفی ۱۰۴۳ھ

اگر غم ہے تجھے میری اگن کے — کرو کچھ فکر پیارے سے ملن کا (بکٹ کہانی)

ولی دکنی سے

کروں کیا وقت میں ہے اب ملن کا — کچھ فرصت ہے اب باتاں کرن کا

دیگر سے

لگا دل جوں لوا لا جل میں کاپن — لگی جوں نرہوں ناری منہ کو ڈھاپن

محمد امین سے

رہی اس بات سوں عاجز ہو دائی — زلیخا کے اگل ہو الن پسنائی

(۱۸) اکثر ایسے مصادر ہیں جو پنجابی اور اردو میں مشترک ہیں لیکن یہاں بعض ایسے مصادر کا ذکر کیا جائے گا جو فی زمانہ اردو میں متروک ہیں اور پنجابی میں رائج ہیں۔ (الف) اُکھنا و کہنا اور بیان کرنا اور دریافت کرنا۔ پنجابی میں

رائج ہے۔ لیکن پرانی اردو میں یہ مثال۔ محمد امین دکنی سے

حقیقت سب تری میں تجھ کون آکھی نہیں اس ہی بہتر چھانی میں راکھی

(ب) سڑنا۔ پنجابی میں جلنے کے معنوں میں آتا ہے۔ پرانی اردو میں رائج تھا محمد افضل جھنجھانوی متوفی ۱۰۳۵ھ سے

ارے آساں بنجانوں عشق کرناں تمن اس آگ موں ہرگز نہ سڑناں (بکٹ کہانی)

(ج) ٹورنا و ضرورت ہونا۔ پنجابی میں بالعموم آتا ہے۔ پرانی اردو میں موجود تھا۔ احمد دکنی سے

کرے ایک نیکی تو دے دس ثواب جو لوڑے زیادہ پے دے حجاب (لیلیٰ مجنوں)

(د) انپڑنا۔ پہونچنا۔ دکنی کی مثال۔ احمد دکنی سے

جو قاصد کرے ہاتھ نامہ جڑیا جو نوفل کے نیڑے ترت انپڑیا

(ہ) پچھاننا و پہچاننا پنجابی میں آج بھی پے کے بعد چھ لکھتے ہیں۔ پرانی دکنی اس بارہ میں پنجابی کے دوش بدوش ہے۔ محمد امین سے

ستارے سعد اور سب نحس جانوں سورج اور چاند کی گردش پچھانوں

دیگر سو پڑے جس کے سو سر او پر سو جانے مگر حق تعالیٰ سب پچھانے

شاہ میران جی شمس العشاق فرماتے ہیں۔

"ہور یگانہ ہوا سالک انپڑتوں۔ باج توبہ بندگی کرتا یوں ہے۔ جوں چھلال کا پانی چھوٹ ہے۔ اسے بندگی بی جھوٹ ہے۔ خدا کا پچھانت باج۔"

(رسالہ اردو حصہ بست و ششم صفحہ ۱۹۹)

(و) سٹنا۔ پھینکنا۔ ڈالنا اور چھوڑنا پنجابی میں آج بھی موجود ہے اور بطور فعل و امدادی فعل رائج ہے۔ لیکن احمد دکنی:۔

سو جیوں عشق کے بند میں جا پڑیا نپٹ گیاں سنکر چنگل پکڑیاں

دیگر ؎

مجھے لوگ کہتے کہ ست ٹیرے پرت پرت چھوڑ دینی کیسے ہے سکت

محمد قلی قطب شاہ ؎

پنکھی میٹے ہیں سب پہاں رو رو بھرا ہے سمند ذال

چھوڑے ہیں سب اپنے گھراں دیکھ تو زاری دارے دلے

(س) لبھانا۔ تلاش کرنا۔ دریافت کرنا۔ عبدالحکیم پنجابی کہتے ہیں ؎

کہا یک جو کوئی کہو ہا لبھاندیں اسی ورچ چاہ یوسف نو سٹادیں

دکنی میں انہی معنوں میں آتا ہے۔ محمد امین ؎

یقیں جو کوئی اللہ بن لبھائے مراداں دے کبھی جگ میں پنائے

(ح) لانا۔ لگانا۔ آج بھی پنجابی میں ملتا ہے۔ اور دکنی سے یہ مثال

احمد دکنی ؎

بہیدوں کے ناموس کوں آگ لائی سہن برس کا سگ مائی لائی

اور محمد افضل جھنجھانوی ؎

سکھی کیسی سکھی رہی پیہ بنا یا گوئل نے انب پر چھڑ شوڑ لایا

(ی) پانا: ڈالنا۔ پنجابی میں آج بھی موجود ہے۔ اور پرانی اردو سے

یہ مثالیں۔ محمد امین ؎

خدانے یوں انھوں کے دل میں پایا عزیز مصر نام اپنا بتایا

دیگر ؎

تمھیں دل اس فکر کے زیچ نہ پاؤ اٹھو جیوں آئے ہو تیوں پھر کے جاؤ

(ک) لڑنا۔ پنجابی میں سانپ ڈسنے کے لیے آتا ہے۔ آج بھی کثرت سے بولا

جاتا ہے۔ دکنی میں انہی معنوں میں آتا ہے۔ احمد دکنی کہتے ہیں ؎

جیسے کیس کالی سنبولی لرٹے — ناتر سے سبھ جگ منتر پڑھے (لیلی مجنوں)

(ل) نسا پنجابی میں بھاگنے کے معنی دیتا ہے کسی قدر اختلاف کے ساتھ دکنی میں بھی ملتا ہے۔ احمد دکنی کہتے ہیں ؎

جو لیدان آئے فقیراں دراس — چلی سب فقیری چھوڑ ناس

محمد امین دکنی ؎

بلا کر لائے چاکر شاہ کے پاس — کہا ماپا چرا کر جاتے ہیں ناس

ولی دکنی ؎

دونوں ہاتاں اپس کے کھو گئے اہ — فسنگ تھا سوں لگا ہے سگ بھاؤ

میں اسی قدر پر اکتفا کرتا ہوں۔ یہ یاد رہے کہ ان مصادر میں سے بعض ممکن ہے کہ برج یا گجراتی دادہی میں سال ہوں۔ لیکن سب بحیثیت مجموعی نہیں ملتے۔ اسلئے ہم اس قیاس میں حق بجانب ہیں کہ اردو نے ان مصادر کو برج یا دیگر زبانوں سے لیا ہے بلکہ ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ یہ اس ذخیرہ زبان سے تعلق رکھتے ہیں جو مسلمان ابتدا میں پنجاب سے لے کر دہلی آئے ہیں۔

(۱۹) میں یہاں بعض ایسے الفاظ کا ذکر کروں گا جو پنجابی اردو میں مشترک ہیں اگرچہ اردو میں اب مستعمل نہیں۔

(الف) دل۔ پنجابی میں طرف کے معنی دیتا ہے۔ دکنی میں اسکی ترکیب سے دولاں بمعنی دو طرفہ آتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ جو اکبر کا معاصر ہے اپنے ایک قصیدے میں لکھتا ہے ؎

دسے فانوس کے درمیانے تھوں یوں جوت دیوے کا
سو تیوں دستا دو لاں میں تھے میویاں کا برن سارا

(ب) نال۔ ساتھ۔ پنجابی میں آج بھی موجود ہے۔ اردو میں بالعموم رائج

تھا۔ محمد افضل متوفی ۱۰۵۵ھ سے

بس یہ تخت پر ناریاں رہے — پیا کے تاں اٹھی ساریاں رے

محمد امین دکنی سے

ہنسے بولے خوشی ہو کے ہموں نال — تمھوں سکو لیمی رکھے خوش و خوشحال

دیگر سے

انے بھی سات خوشے نبل کنچال — انے کی سات سو کھے ہجر اوں تال

(۳) کان۔ پنجابی میں بمعنی واسطے آتا ہے اور دکنی میں بھی یہی معنی دیتا ہے۔ عبدالحکیم پنجابی سے

سونہر ال لے اسے تائیں لبا گھراہ — جیں ہاں حیران اوسے کان ارشاد

اور دکنی قطب شاہی سے

سو کچھ جن مانس کوں کیتا عطا — جو سب کچھ اچھی کان پیدا کیتا

دیگر سے

جنت میں سدا برہ کا دکھ دکھوں — جسے کان جھگڑا رہ کیوں دکھوں

(۴) کیچڑ کو پنجابی میں چکڑ کہتے ہیں۔ دکنی میں بھی چکڑ آتا ہے اور قطب شاہی دکنی

بڑھے جو رکت ہو چکڑ میں جا پڑے — جو سٹے کاٹ سو تم پڑے

دیگر سے

بچھاڑی جو کھاکر ابی پڑیا — کٹ ہو رہاتی چکڑ میں پڑیا

(۵) گھیو۔ پنجابی میں گھی کو کہتے ہیں۔ پرانی اردو میں بھی یہ لفظ آتا تھا
میر جعفر زٹلی عہد عالمگیر بادشاہ عالم کے مصنف تھا۔ ان کے ہاں یہ لفظ
استعمال ہوا ہے چنانچہ سے

ترے گھیو کو سمجھائیے۔ اکھتے ہیو کر — جھپا جھپ چڑھ کو یہ نیہ کا خطا

(ز) چوہڑا بمعنی خاکروب پنجابی لفظ ہے۔ میر جعفر کے یہاں یہ لفظ بھی ملتا ہے۔

دبے پر کیا چوہڑے کو سلام نہ پوچھا حلال اور نہ پوچھا حرام

(ح) کھیر۔ ملتانی میں دودھ کے معنی میں آتا ہے۔ قدیم اساتذۂ دکن بھی اسی معنی میں لاتے ہیں۔ میراں جی شمس العشاق سہ

تھا دیکھنیں لاگا بالک للکہ نہ آوے کھیر جس کے انگو بھرم نہ جاوے اس کجوں کہنا پیر
راج دہن کو دیویں مان کر تیوں فقیر جرم نہ چاکھے ناک جز دہ کیا بوجھیں کھیر

(۲۰) یہاں الفاظ مذکور ہیں جو پنجابی لہجہ میں اردو میں مستعمل رہے ہیں۔

(الف) منگنا پنجابی لہجہ میں ہے اردو میں ہم مانگنا کہتے ہیں۔ دکن میں یہی لہجہ رائج ہے۔ احمد دکنی سہ

سرفراز کرتے منگیا توں منجے خداوند اس کا جزا دے تجھے

اور محمد امین دکنی سہ

زلیخا نے شکر رب کا کیا تب جو میں تجھ کن منگا سو مجھ دیا سب

(ب) بندنا۔ باندھنا پنجابی لہجہ میں بندنا یا بنھنا ہے۔ اہل دکن بھی بندنا بولتے تھے مثلاً معراج العاشقین۔

"کعبہ کو نیت بندنا میراج"۔

(پ) ہنسنا پنجابی میں تخفیف نون غنہ آتا ہے۔ یعنی ہسنا۔ اہل دکن بھی ہنسنا بولتے ہیں۔ محمد امین دکنی سہ

سو تب یعقوب کے یوں دل میں آیا یوسف کو نیند بھیتر کن ہنسایا
دیگر سہ یوسف جاگے تو تب پوچھا پدر نے سپن بھیتر ہنسایا تجکوں کن نے

(ت) ٹٹنا۔ ٹوٹنا۔ پہلا پنجابی ہے اور دوسرا اردو۔ اہل دکن نے دونو طرح سے لکھا ہے۔ احمد دکنی۔

پرت جوڑ وہ دوسے دل جو جوڑے   نہ ٹوٹے جو آکاس ٹنکر پڑے

(ٹ) پٹی۔ پاٹی بمعنی تختی ولوح۔ دکنی پنجابی لہجہ میں پٹ لکھتے ہیں۔ احمد دکنی

پرت حرت تین تین سب کر یٹی   کہا گہ د میں دھر سکھے وہ پٹی

ہتھ۔ ہاتھ اہل دکن پنجابی طرز میں بھی لکھتے ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ سے

حضرت نبی کے گیسواں دونوں اماماں ہے پگال

جبریل جھلاوے اپ ہتاں آدات ساری ولے دلے

(ج) ٹُھکار۔ بھوکا۔ محمد قلی پنجابی لہجہ میں باندھتا ہے سے

دو نور دیدے بی بی کے آخر دیکھو کیوں دکھ دیکھے

لہو میں پڑے پیاسے ٹُھکے دیکھو یہ خواری والے دلے

(چ) ڈبنا۔ ڈوبنا۔ دکنی پنجابی لہجہ سے بھی واقف ہیں۔ احمد دکنی سے

جو ڈبتا نکلتا دسے جگ میں سور   سو مشرق کھڑا ہو دیں نزدیک دور

(ح) بھیں۔ بہن۔ دکنی بھیں ہی لکھتے ہیں۔ محمد امین سے

چلے تب بھیں کے گھر کیو خوش حالی   بھینیں دو کہ دیکھ اس صاحب نے نالی

(خ) حکیم یوسفی دسویں صدی ہجری کے مشہور مصنف ہیں۔ طب ان کا میدان ہیں جن میں کئی تصنیفات یادگار چھوڑیں۔

جناب سید مسعود حسن رضوی ایم۔ اے لکچرار لکھنؤ یونیورسٹی اپنے مضمون اردو کے منظوم لغت (خیاباں لکھنؤ بابت جنوری ۱۹۲۷ء) میں حکیم یوسفی کے ایک قصیدہ کا ذکر کرتے ہیں جو قصیدہ در لغات ہندی کے نام سے موسوم ہے۔ اس قصیدہ میں کل چوالیس ابیات ہیں جن میں سے چند سید صاحب نے اپنے مضمون میں نقل کیے ہیں۔ وہاں سے میں دو شعر یہاں نقل کرتا ہوں سے

جب دکن آمد زبان گوش داری رشی دان   موج را مہجوان بوقت دکان کو دو بسرہ کہ

ہست پیشانی منہ کیسہ تپتی بست اسست ہست ٭ کہ دہ رہتی پھل رہ ان شہ بیت بنشیں دگ نگر

ان اشعار میں یہ الفاظ پنجابی لہجہ میں ہیں۔

کن ۔ مت چیتی ہست ۔ منہ ۔ دک ۔ کان ۔ ماتھا ۔ چھاتی ۔ منہ ۔ دیکھ ۔

(د) ہور ۔ اور یہ لفظ عاطفہ آج بھی پنجابی میں مستعمل ہے اردو سے خارج ہو گیا ہے۔ لیکن قدمائے اردو کے استعمال میں عام طور پر تھا۔ محمد قلی قطب شاہ متوفی ۱۰۲۰ھ سے

سمد رہے ایک ہور ندیاں ہیں سو ہزاراں ٭ آتا سو کردراں ہیں دے ٹیک رس رہے

(ڈ) لوک ۔ لوگ ۔ پنجابی میں کاف ہے اور اردو میں گاف۔ لیکن اردوئے قدیم میں کاف ہی تھا۔ چنانچہ شاہ برہان الدین متوفی ۹۹۰ھ سے

جے ہو دیں لوک عوام ٭ بلے مرشد بے قیام

احمد دکنی سے

جو لیلیٰ کے نو کان سنی یہ خبر ٭ سنوار ی صد رنگ سنگار گھر

(ذ) جوک ۔ جونگ ۔ اہل دکن پنجابی لہجہ میں لکھتے رہے ہیں۔ محمد امین دکنی سے

لگے بھوکیں سے مرنے دے سبھی لوگ ٭ مریں یو نکے کہ جیوں بھوکے مریں جوک

(ر) پنجابی اور اردو میں بعض حروف آپس میں تبدیل ہو جایا کرتے ہیں۔ مثلاً

پنجابی کی "دال" اردو میں "بے" سے بدل جاتی ہے۔

پنجابی	اُردو	پنجابی	اُردو	پنجابی	اُردو
دیچھنا	بیچنا	دچھانا	بچھانا	دیڑی	بیری
ڈال	بال	ڈٹا	بٹہ	درتا	برتا
درتا دا	برتا دا	دیاج	بیاج	دیھٹ	بھیٹ
واگاں	باگاں جمع باگ	ڈیہڑ	بھیڑ	نہچارہ	بچارہ، بیچارہ

پنجابی	اردو	پنجابی	اردو	پنجابی	اردو
وچار	بچار	وجلی	بجلی	دکھ	بکھ
وکاڑ	بکاڑ	وسنا	بسنا	ویاہ	بیاہ
وگاڑ	بگاڑ	واری	باری	ورقا	برقا
والی	بالی	وچ	بیچ	وچنا	بکنا
وکاؤ	بکاؤ	ولا	بل	ویر	بیر
وساکھ	بیساکھ	وسرنا	بسرنا	وس	بس (زہر)
وات	بات	وٹی	بتی		

(ز) پنجابی کی "ہے" اردو میں "سین" سے بدل جاتی ہے۔

پنجابی	اردو	پنجابی	اردو	پنجابی	اردو
کیہا	کیسا	جیہا	جیسا	کہیں	کسی
اوہ	اوس	ایہہ	اس	ورہ	برس
تریہہ	ترس	ورہیا	برسا	ودھدا اے	بڑھتا ہے
سوہرا	سسرا	پچاہر	پچھتا	تیہہ	تیس
ویہہ	بیس	چالیہہ	چالیس	گاہ	گھاس
		سرہوں	سرسوں		

(ژ) پنجابی کی "ہے" اردو میں "الف" سے بدل جاتی ہے۔

پنجابی	اردو	پنجابی	اردو	پنجابی	اردو
ہک	ایک	ہور	اور	ہسوار	اسوار

(س) پنجابی کی "ڈال" اردو میں "ٹے" سے بدل جاتی ہے۔

پنجابی	اردو	پنجابی	اردو
ڈباگا	تاگا	ڈڈا	ٹڈا

بعض الفاظ میں حروف مقدم مؤخر ہو جاتے ہیں ۔

پنجابی	اردو	پنجابی	اردو	پنجابی	اردو
کوڑا	کڑوا	پھڑنا	پڑھنا	چکڑ	کیچڑ
پچھان	پہچان	بھین	بہن	اناچک	اچانک
		سہرند	سرہند		

قدیم اُردو پر پنجاب کا اثر

اُردو پر قدیم زبانوں میں پنجابی لہجہ غالب تھا۔ اس کا ثبوت دینا موجودہ حالات میں بہت دشوار ہے اسلیے کہ ان ابتدائی زبانوں کے جبکہ مسلمان لاہور سے ہجرت کر کے دہلی میں آباد ہوئے ہیں نیز اسکے بعد کی تین صدیوں تک کے کوئی کتابی نمونے ہم کو نہیں ملتے نہ ہم کو یہ علم ہے کہ اس عہد کی برج اور پنجابی میں کیا فرق تھا الغرض برج اور پنجابی اور اردو کے نمونوں کی عدم حاضری سے ہمارا کام بہت مشکل ہو گیا ہے۔ یہ یقینی ہے کہ جب مسلمانوں کا کثیر گروہ قطب الدین ایبک کے ساتھ شمال سے ہجرت کر کے دہلی آیا ہے تو اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی زبان ضرور لے کر گیا ہے۔ آیا یہ زبان موجودہ پنجابی کے مماثل تھی۔ اس کی کوئی شاخ تھی جواب معدوم ہے۔ ہم اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ بہرحال یہ زبان برج اور اسکی ہمسائیگی میں ایک عرصۂ دراز تک رہنے سہنے کے باعث بدلنی شروع ہوئی ہے۔

برج اور موجودہ پنجابی کا اصولی فرق گزشتہ سطور پر میں دکھا چکا ہوں پنجابی کے الفاظ "حرف علت" کو جب کہ حرف ثانی واقع ہو گرا دیا جاتا ہے اس اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب ہم فارسی کی تصنیفات اور تاریخوں کی ورق گردانی کرتے ہیں جن میں اتفاقیہ ہندی الفاظ آجاتے ہیں اور ان الفاظ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ خلجیوں اور تغلقوں کے عہد میں پنجابی کا دہلی کی زبان پر خاصا اثر تھا۔ مثلاً پہلا ہندی لفظ جس پر ہماری نظر پڑتی ہے "لک" یعنی لاکھ ہے چنانچہ

فارسی خواں اب تک لک ہی بولتے ہیں۔ قطب الدین ایبک کو لک داتا کہا
جاتا تھا اب لک پنجابی لہجہ میں ہے۔

اردو میں چارپائی کو ہم کھاٹ کہتے ہیں۔ پنجابی لہجہ میں اگر اس کو لکھا جائے
تو کھٹ ہوگا۔ اب مولانا ابراہیم فاروقی صاحب شرفنامہ نویں صدی ہجری کے
مصنف جو بنگالہ کے رہنے والے ہیں لکھتے ہیں۔

"کت۔ بالفتح تخت میاں بافتہ ہندکھت نامند"۔

مولانا فخر الدین مبارک شاہ غزنوی جو ہندوستان میں فارسی لغات
نگاروں کے باوا آدم تھا۔ اور عہد علاء الدین خلجی کے شاعر ہیں۔ اپنی فرہنگ
میں اسی لغت کے لیے کہتے ہیں۔

"کت۔ تخت ہندواں باشد میاں بافتہ"۔

تاریخ سیر الاولیا میں جو تغلقوں کے عہد کی تصنیف ہے۔ یہ لفظ ہمیں پانچ بار
ملتا ہے اور ہر بار کھٹ کی شکل میں ملتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان
ایام میں اہل دہلی کھاٹ کہتے تھے۔ یعنی پنجابی لہجہ میں بولتے تھے۔

پاگ بمعنی پگڑی۔ ایک اور کھاٹ کا لفظ ہے۔ اسکی پنجابی شکل "پگ"
ہے۔ اب امیر خسرو دہلوی باوجودیکہ دہلی میں پرورش پاتے ہیں اور مسلمان
کو دہلی میں آباد ہوئے اس وقت ایک صدی گزر گئی ہے تاکہ پگڑی کو پنجابی
شکل میں "پگ" لکھتے ہیں۔ چنانچہ ؎

اے دہلی وائے بتاں سادہ — پگ بستہ و چیرہ کج نہادہ

ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروزشاہی میں ص ۲۴۱ پر ملک فخر الدین کھنڈا
اور ملک رکن الدین انبہ کے نام نظر آتے ہیں ان ناموں میں کھنڈا اور انبہ عرفی یا
تمیزی نام ہیں۔ اس عہد میں کچھ اسی قسم کے عرف ہوا کرتے تھے چنانچہ ایک امیر سرنا نام

نام سے منسوب تھا دوسرا امیر "نور بانڈا" کہلاتا تھا اب بھاشہ کھنڈ کو کھانڈ اور رانبہ کو انب کہتے ہیں لیکن ان امرا کے ناموں کے ساتھ کھنڈا اور رانبہ مذکور ہونے سے واضح ہوتا ہے کہ اس عہد کے مسلمان کھانڈ کو کھنڈا اور آنب کو انب پنجابی لہجہ میں کہتے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان ایام میں دہلی کے مسلمانوں میں پنجاب کا لہجہ غالب تھا کھنڈا اور رنبہ کا ماخذ ایک ہی معلوم ہوتا ہے۔

ہم برج بھاشہ کے لہجہ کے مطابق اردو میں نقال کو بھانڈ کہتے ہیں لیکن ہمارے اسلاف پنجاب کے لہجہ میں بھنڈ کہتے تھے اور اس بھانڈپن کا مفہوم ادا کرنے کے لئے "بھنڈائی" بنا لیا ہے۔ چنانچہ ضیاء برنی کہتا ہے:۔

"از سخن مسخرگان، بھنڈائی بھنڈا و بوالعجبی بازیگران و بے شرمی یاد داشتان که از اطراف ممالک بدرگاه رسیده بودند و در اطراف سراچہائے سلطانی بازی می کردند و ہنرہائے خود می نمودند او سخن نمی داند و یاد داشتنی و بھنڈائی را نہایت میرسانیدند"۔ (تاریخ فیروز شاہی ص ۱۶۲)

یہ الفاظ ثابت کرتے ہیں کہ ان ایام میں دہلی پر پنجابی لہجہ غالب تھا۔

اسی مصنف کے ہاں ایک اور مقام پر یہ عبارت ہے۔

"چندیں صفہ و صحن و برج و بند ایستاده بودند و چھر انداخته دچاه ہا کا وایدہ دمہ ہائے سبوہا پر آب و آفتابہ ہائے گلیں مرتب داشتہ و بوریا ہا فراز کرده"

مٹ پنجابی میں ماٹ یا گول کو کہتے ہیں۔

ضیاء برنی کے ہاں یہ فقرہ بھی آتا ہے:۔

"و آخر کار عمداً از لرزه در اندام افتاده و دلش در باک شده زہره ترقیدن گرفت از شدت و غلبہ ہراس پگہ در گردن انداخته و بھر خلق را بر سینہ کرده در پیش درگاه سلطانی آمد"۔ (تاریخ فیروز شاہی ص ۵۲۳)

ہم دیکھتے ہیں کہ برنی بھی امیر خسرو کی طرح پگڑی کو پگ ہی لکھ رہا ہے۔ یہ یاد رہے کہ پگ بھاشہ میں پانو کے معنی میں مستعمل ہے۔

اسی تاریخ میں ایک اور موقعہ پر یہ فقرہ آتا ہے:۔

"دو رختاں و کھری و جموں و ثمر ماننہ منہ۔ وی ڈنڈال سنبل بلبل و گل نہال خواہند کرد۔" (صفحہ ۵۶)

برنی یہاں "جموں" پنجابی طرز میں لکھ رہے ہیں ہم آج کل بھاشہ کی تقلید میں جامن یا جاموں لیتے ہیں۔

تاریخ فیروز شاہی میں شمس سراج عفیف فیروز شاہ خلجی کے شکار کے ذکر میں فقرہ ذیل لکھتا ہے:۔

"تا سپچنیں اگر در تلے و دہندسے ماہی بودسے، شہنشاہ فرمودے کہ آں ڈھباے گراں کہ بالائے پیل بار کردہ مے بردند ان را جدا در آں تل و دہند اندازند" (صفحہ ۳۲۸)

اس فقرہ میں تل اور دہند پنجابی ہیں۔ "تل" تال یعنی تالاب کی شکل ہے خالق باری میں تال ہے۔

رایت تو اہیرہ بود اسپر است ڈھال نیز آب ندی حوض و گرہر داست تال

دھند ملتانی لفظ ہے جو بڑے اور گہرے تالاب یا جھیل کے معنی دیتا ہے۔ اب یہ لفظ ایسا ہے کہ آج پنجاب میں بھی عام طور پر لوگ اس سے واقف نہیں ہیں اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ دہلی میں ان ایام میں بولا جا رہا تھا تو ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ پنجاب کا اثر دہلی پر کس قدر زبردست ہوگا۔

ہم آج کل دو جہ کو جونک بانون غنہ بولتے ہیں۔ پنجابی تکلم کے مطابق جیسا کہ اس سے قبل عرض کر چکا ہوں یہ لفظ جونک ہے۔ اہل دکن بھی جوک کہتے تھے۔ دکن کے علاوہ باقی اردو خواں دنیا بھی جوک ہی کہتی تھی۔ چنانچہ صاحب شرف نامہ ابراہیم فاروقی قرن نہم ہجری کے بنگالی مصنف کہتے ہیں:۔

"دیوچہ ۔ ہندش جونک گویند"

آج ہم جونک بولتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ بعد میں بلاشبہ کے اثرات میں ہم نے یہ لہجہ اختیار کیا ہے۔

صاحب شرف نامہ کلاوہ کی تشریح میں کہتے ہیں۔

کلابہ : کلاوہ" ہند" اٹی " نامند "

اب اٹی پنجابی ہے، برج میں انٹی ہے اردو میں اٹیا دونوں لہجے رائج ہیں یعنی اٹی بھی کہتے ہیں اور انٹی بھی البتہ برج کے لہجے میں اتنی اصلاح کر دی ہے کہ انٹی کے مد کو ترک کر دیا ہے۔ گاڑی کو پنجابی گڈی کہتے ہیں صاحب شرفنامہ کہتے ہیں۔

"گردون، چرخ، ہند گڈی خوانند"۔

یہاں پھر صاحب شرفنامہ پنجابی لہجہ میں لکھ رہے ہیں۔ اسی طرح گڑیا کے واسطے مصنف کہتے ہیں

"لعبت ، لعبت دختر کان دال صورت کہ از جامہ سازند. ہند گڈی گویند"

گڈی پنجابی میں گڑیا کو کہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس عہد میں عام مسلمان اس لفظ کو پنجابی لہجہ میں بول رہے تھے۔

"چقندر کے ذکر میں بھی مصنف فرماتے ہیں۔

"سبزہ ایست مثل ترب کہ آنرا شلغم گویند۔ ہندش گانگو نامند"۔

اہل پنجاب آج بھی شلغم کو "گونگلو" کہتے ہیں، یہ یاد رہے کہ صاحب شرفنامہ بنگالہ کے رہنے والے ہیں اور انھیں پنجاب سے کوئی تعلق نہیں ہے بنگالہ میں شلغم کو آجکل شلگم ہی کہتے ہیں جب اس عہد کے مسلمان عام طور پر گانگو کہہ رہے ہیں۔ تو کیا یہ پنجاب کا اثر اردو پر ظاہر نہیں کرتا۔ بعد کے اثرات میں ہم نے گونگلو کہنا ترک کر دیا ہے۔ اور شلغم کہنے لگے۔

بنو ماش کے ذکر میں بھی مصنف حوالہ قلم کرتے ہیں:۔

"بنو ماش بالضم" نام غلہ کہ بہندش منگ نامند۔"

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں :۔

"مزدور آشامے است کہ مریض را دہند چنانچہ دریں ولایت مثلاً از برنج و منگ آشام سازند و در خراساں از شکر و نار دہند۔"

اس عہد تک گویا مونگ کو پنجابی طرز میں مسلمان منگ کہتے رہے۔ لیکن صاحب مؤید الفضلا، جو دسویں صدی ہجری کے مصنف ہیں اس کو صاف مونگ لکھتے ہیں اور جب سے اب تک ہم مونگ ہی بولتے آئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس لفظ کے متعلق دسویں صدی میں مقامی لہجہ اختیار کیا گیا ہے۔

اہل پنجاب سیسہ کو سکا کہتے ہیں۔ چنانچہ نصاب ضروری :۔

از زیر قلعی سیتر ہے سکہ ستطر ٹھلا بارنگ نکانا

اور آج ہم اردو میں سیسہ بولتے ہیں۔ چنانچہ اسمائے فارسی :۔

آنک سرب سیسہ کو جانو رانگے کو ارزیر کہا تو

لیکن حکیم یوسفی جو دسویں صدی ہجری کے پہلے ربع کے مصنف ہیں اپنی تصنیف ریاض الادویہ میں آنک کا ہندی مرادف سکہ بتلاتے ہیں۔ ان کے کچھ عرصہ بعد صاحب مؤید الفضلا آنک کی تشریح کے وقت دونوں لفظ یعنی سکہ و سیسہ دیتے ہیں اب ظاہر ہے کہ اہل اردو اہل پنجاب کی طرح ابتدا میں سکہ کہتے رہے بعد میں سکہ کہنے لگے اور سیسہ ہی آخر کار غالب رہا۔

اردو میں برج لہجہ سے پنجابی لہجہ کا سخت مقابلہ رہا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی وقت میں ایک لفظ دونوں لہجوں میں بولا جاتا رہا ہے۔ مثلاً بادل اور بدل، بازار اور بزار، چھاج اور چھج۔ صاحب شرفنامہ ۸۶۲ھ تا ۸۷۹ھ آذخ کے بیان میں لکھتے ہیں کہ

"ہندمنا خوانند"

لیکن صاحب مؤید الفضلا ۹۲۵ھ اسی لفظ کے ذکر میں کہتے ہیں کہ "ہند ماسہ گویند"

اور ہم آج متا ہی بولتے ہیں یہاں گویا پنجابی لہجہ غالب ہے۔ تاریخ فیروز شاہی جموں لیجیے پنجابی آیا ہے۔ لیکن صاحب مؤید الفضلا! لوسیہ کے بیان میں اس کا ہندی مرادف جامن دیتے ہیں چنانچہ آج بھی جامن یا جامون بولا جاتا ہے۔ یہاں دیکھا جاتا ہے کہ برج کا لہجہ غالب رہا۔ اسی طرح اشترخار کے ذکر میں صاحب شرفنامہ کہتے ہیں :۔

"وہندا ور اجوانسہ گویند"۔ لیکن مصنف مؤید الفضلا کا بیان ہے کہ "ہندش جانوا سہ گویند"۔ ہم آج جوانسہ یا جواسہ کہتے ہیں اور پنجابی لہجہ کے مقلد ہیں"۔ لفظ درائے کے متعلق صاحب ادات الفضلا ۸۲۲ھ کا بیان ہے کہ اہل ہند آنرا گھنٹی گویند"۔ لیکن صاحب شرفنامہ ۸۶۲ھ ۸۷۹ھ کا قول ہے کہ "درامیے جرس ہندش گھانٹی خوانند"۔ ہم آج گھنٹی کہتے ہیں۔ صاحب شرفنامہ کے ہاں اور ایسے الفاظ ملتے ہیں جو برج لہجہ میں ہیں۔ مثلاً تسمہ کے بیان میں "پاٹی" استخار کے ذکر میں ساجھا شترک کی تشریح میں بچکلی اور شستی کے بیان میں ساھنا "ٹراپ" چاپاتی"۔ آج ہم ان الفاظ کا تلفظ پنجابی لہجہ کے موافق پٹی۔ سجی۔ ہچکلی سمنی۔ اور چپاتی کرتے ہیں۔

حکیم یوسفی نے ریاض الادویہ میں پنجابی اور ہندی الفاظ جو ہندی اور پنجابی میں مشترک مانے جاسکتے ہیں۔ یہ الفاظ بھی دیتے ہیں۔

"لافی۔ انب۔ تماں۔ کورنج۔ آنڈہ۔ آملی۔ آرنڈ۔ ماکھی۔ کانچلی۔ بلانی۔ ہاڈر۔ ساجی ان میں پہلے چار تو خالص پنجابی ہیں۔ باقی تمام برج کے لہجہ میں ہیں جن کو آج ہم انڈا املی۔ ارنڈ۔ مکھی۔ کینچلی۔ بلی۔ ہڈی۔ سجی: لہجہ پنجاب ادا کرتے ہیں۔

میں خالق باری سے اور مثالیں دیتا ہوں مثلاً۔

"ماٹی۔ پاتھر۔ چاپسلی ـــــ کال۔ تانا۔ ڈھاکنی۔ چاکہ۔ ماکھی۔ ماپچھر۔ کانکر۔ ہانسی۔ پوتلی۔ پانسلی۔"

جنھیں آج ہم پنجابی لہجہ میں مٹی۔ پتھر۔ چلنی۔ کل۔ تنا۔ ڈھکنی۔ چلھہ۔ مکھی۔ مچھر۔ کنکر۔ ہنسی

پسلی ۔ پسلی کہتے ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بالکل ممکن ہے کہ پرانی برج میں اور پنجابی میں کوئی فرق نہ ہو اور آج برج میں حروف علت کا اظہار بعد کی نشو ونما ہو۔ اس کے متعلق ہم اتنا جانتے ہیں کہ پنجابی میں یہ "قاعدہ یعنی حروف علت کی تخفیف تقریباً مسلمانوں کی ہند میں آمد کے وقت بھی موجود تھا۔ عرب سیاحوں نے بعض ہندی الفاظ کا ذکر کیا ہے جن میں آنبہ اور زط بھی شامل ہے۔ پنجاب میں آنبہ آج بھی بولا جاتا ہے باقی رہا زط یہ پنجابی لفظ جٹ کی معرب شکل ہے اردو میں برج کی تقلید میں جاٹ بولتے ہیں۔ یہ ایک جنگجو قوم کا نام ہے جو ان ایام میں سندھ و پنجاب میں کثرت سے آباد تھی۔ ایرانی بتقلید پنجاب جت کہتے ہیں۔ چنانچہ ابوالفرج رونی :-

کرد افغان و جت برغبت و حرص پژہ زد موکب مواد ملک

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ قدیم زمانوں میں پنجاب کا اثر اُردو پر بہت نمایاں تھا لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ یہ اثر رفتہ رفتہ زائل ہوتا گیا۔

سطور آیندہ میں برج بھاشا کی بعض خصوصیات درج کی جاتی ہیں۔ تاکہ قارئین کرام اردو پنجابی اور برج زبانوں کے فرق کو معلوم کر سکیں۔ اور یہ رائے قائم کر سکیں کہ آیا اُردو زبان پنجابی کے قریب ہے یا برج کے۔

برج بھاشا

دراصل ضلع متھرا کی زبان ہے جہاں سے نکل کر اس نے بہت وسعت اختیار کر لی ہے یعنی جنوب میں تمام ضلع آگرہ، اکثر علاقہ ریاست بھرت پور، دھول پور اور قرولی مغربی علاقہ ریاست گوالیار اور مشرقی علاقہ ریاست جے پور میں پھیلی ہوئی ہے۔ شمالاً گڑگاؤں کے مشرقی حصہ میں، شمال مشرق میں دوآبہ، بلند شہر، علی گڈھ، ایٹہ مین پوری میں گنگا پار، بدایوں، بریلی اور ترائی پرگنہ نینی تال میں بولی جاتی ہے اور مختلف مقامات پر مختلف نام رکھ دیئے گئے ہیں۔ مثلاً مشرقی علاقہ میں جہاں قنوجی زبان سے اس کا اتصال ہوتا ہے۔ انتربیدی کہا جاتا ہے۔ گوالیار کے شمالی مشرق گوشہ میں جو دھپور کے متوازی ہے اور جہاں سکرواڑ، راجپوت آباد ہیں سکرواڑی قرولی کے میدانی علاقہ اور بعض علاقہ گوالیار میں جمل یا رجادوبانی کہتے ہیں اسلیئے کہ اس علاقہ میں اس نام کی راجپوت قوم آباد ہے۔ بھرت پور کے جنوبی علاقہ قرولی خاص اور مشرقی علاقہ جے پور میں جو ڈانگ کے نام سے موسوم ہے۔ ڈانگی کہتے ہیں۔ ادھر اسکی مقامی تین تقسیمیں ہیں یعنی ڈونگر واڑہ، کالی مال۔ اور ڈھانگ۔ علاقہ نینی تال میں اس کا نام بھُکسا ہے قدیم زمانہ سے برج بھاشا نے شاعری کی گود میں پرورش پائی ہے اور ہندوستان کے بعض مشہور شاعر اسی زبان میں لکھتے رہے ہیں۔ دُھلنا کھ۔ سورداس۔ نابھ داس دیودت اور بہاری لال بے حد مشہور ہیں۔ (گریرسن)

اہل مغرب نے اس زبان کی حد بندی شاید درست کی ہو۔ لیکن مسلمانوں نے اس کو بہت وسعت دیدی تھی۔ داس کو بھاکا یا بھاشہ کے نام سے یاد کرتے

رہے اور بھاکھا کی ذیل میں انھوں نے قنوجی۔ اودھی اور بندیلی کو بھی داخل کر لیا تھا
بلکہ اس کا میدان اس سے بھی وسیع تر تھا یعنی شرقی اور مغربی ہندی اس کے احاطہ میں
آجاتی تھی۔ مسلمانوں کا یہ نقطۂ نظر عجیب رہا ہے۔ وہ ہندوستان کی ہر زبان کو ہندی
کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ عام اس سے کہ پنجابی ہو یا برج یا پوربی۔ اردو ہو یا
مارواڑی اور بنگالی۔ آج ہندوؤں نے بھی ہندی کے ذیل میں برج۔ قنوجی۔
اودھی۔ بندیلی۔ مارواڑی وغیرہ زبانوں کو شامل کر لیا ہے۔ بھاشہ شاعری کی زبان
تھی اور اس میں ہر ہندی شاعر عام اس سے کہ وہ اودھی ہو یا گجراتی، مالوی یا
بہاری شعر لکھتا تھا اگرچہ اسکے اشعار میں اسکی وطنی زبان کی خصوصیات زیادہ غالب
ہوتی تھیں ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ مسلمانوں کے لیے جہاں فارسی شاعری اور ادب کی
زبان تھی اسی طرح بھاشہ موسیقی اور شعر کی زبان تھی۔ اہل اسلام کی شعر دوستی نے بھاکا کی
شاعری کو بہت کچھ تقویت دی ہے۔ انہی کے زمانہ سے اس زبان میں شعر و ادب پیدا ہوئے
ہیں۔ گویا اہل اسلام کے پاس تین زبانیں تھیں۔ اول فارسی جس میں وہ شعر و ادب تاریخ
و انشا لکھتے رہے دوسری اردو جس کو اپنے ساتھ پنجاب سے لے گئے۔ تیسری بھاکا یا
بھاشا جس میں موسیقی اور شعر لکھتے رہے۔ خلجیوں اور تغلقوں کے عہد میں فارسی پر زوال
آنے لگا۔ آیندہ قرون میں عام توجہ بھاشہ کی طرف منعطف ہو گئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں
میں عام ہندی گو شعرا پیدا ہو گئے۔ بھاشہ میں کثرت سے شعرا ہوئے ہیں جن میں صوفی
و غیر صوفی شامل ہیں۔ لیکن موجودہ نسلوں کی عدم اعتنا سے ان کے کلام کا اکثر حصہ ضائع
ہو گیا اور جو کچھ باقی ہے وہ بھی عنقریب معدوم ہو جائے گا برج بھاشہ کوئی قدیم نام
نہیں ہے۔ قدما اس کو گوالیاری کے نام سے یاد کرتے تھے۔

برج کی بعض خصوصیات

برج میں مصدر "بو" یا "دو" یا "نو" آخر میں لگانے سے بنتا ہے۔ مثلاً ہوئیو

ہونا۔ پوچھو۔ پوچھنا۔ چلو۔ چلنا۔ اسمائے افعال۔ اور اسمائے صفات کے آخر میں ایک واؤ مجہول اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ جس موقع پر اردو اور پنجابی میں الف لگتا ہے۔ مثلاً اپنو۔ اپنا۔ تمھارو۔ تمھارا۔ چلیو۔ چلا۔ یا واؤ معروف بڑھا دیا جاتا ہے۔ جیسے بسنت بسنتو۔ غلام سے غلامو۔ شیطان سے شیطانو۔ مستقبل کے اردو اور پنجابی لاحقہ "گا" کے بجائے "گو" آتا ہے۔ مثلاً مارونگو۔ ماروں گا۔ لیکن زیادہ رائج شکل "مار ہوں سا" یا "مارسے ہوں" "ماروں گا"۔ "مارسے ہیں"۔ "ہم ماریں گے"۔ "مارسے" یا "مارسے" (وہ) ماریں گے۔ ظاہر ہے کہ جس طرح "مصدر کی علامت" نو" اسی طرح مستقبل کی علامت "گو" اردو سے لی گئی ہے۔ ہے کی گردان اردو ہے۔ اور پنجابی میں یکساں ہے۔ صرف یہ فرق ہے کہ واحد متکلم میں برج میں "ہوں" یا واؤ مجہول سے "ہوں" یا واؤ معروف "ہوں" اور پنجابی میں واو الف سے بدل کر "ہاں" بن گیا۔ اور جمع واحد میں "ہن" بن گیا۔

تھا کی تصریف میں پنجابی اور اردو کسی قدر [illegible] لیکن برج میں مختلف ہیں۔ یعنی واحد مذکر "ہو" واحد مؤنث "ہی"۔ جمع مذکر "ہے" اور جمع مؤنث ہیں"۔

ماضی ناتمام میں "ہو" بجائے "تھا" لاتے ہیں۔ مثلاً "مارتا تھا" کے بجائے "میں مارتو ہو" وغیرہ کہتے ہیں۔ حال و استقبال میں بہت کم فرق ہے "ہوں ماروں ہوں" یعنی مارتا ہوں وغیرہ یا "ہوں مارتا ہوں" وغیرہ لاتے ہیں۔ جمع کے لیے بالعموم اسم کے آخر میں ایک نون اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً موتی۔ اور۔ دن۔ گھاٹ۔ کان۔ ہاتھ۔ چور۔ گوالی۔ اور گائے کی جمع موتن۔ اورن۔ دنن۔ گھاٹن۔ کانن۔ ہاتھن۔ چورن۔ گوالن اور گاین ہے۔ مصرع۔ کانن۔ میں موتن کو جھگڑا گل پھولن کا ہار۔ ظرف کے لیے ایک "یا" اسم کے آخر میں لاتے ہیں۔ جیسے گھر سے گھرے یعنی گھر میں۔ میں "فی" اور "نون" بعض جگہ آخر میں لگا دیتے ہیں۔ مثلاً ھوتین۔ بھوکی اور بھوکنوا یعنی بھوک سے

علامات جارہ میں کا اور کے کی جگہ "کو" آتا ہے۔ مثلاً گل چھولن کو ہار یعنی گلے میں پھولوں کے ہار گھوڑوں کو یعنی گھوڑوں کا۔ مجہول کا کم رواج ہے۔ لاحقہ نے اکثر اوقات افعال لازمی کے ساتھ (برخلاف اردو اور پنجابی کے) مستعمل ہوتا ہے۔ مثلاً گھوڑے بیٹا نے چلیو یعنی گھوڑا بیٹا چلنے کے استعمال میں بے ضابطگی سے ظاہر ہے کہ وہ اردو اثرات میں برج میں پہونچتا ہے۔ واو اکثر اوقات میم سے بدل جاتی ہے۔ جیسے جہاں۔ نہاں۔ چرامنو۔ چراوتا یعنی چرانا۔ آمنو۔ اوتا۔ یعنی آتا۔ مناامن۔ مناون یعنی منانا۔ جائیں۔ جاویں روتی۔ رووتی یعنی روتی۔ باسن۔ باون۔ مالدہ۔ والدہ۔ اردو کے اثرات میں اسمائی تصریف کا استعمال برج میں ہونے لگے ہے۔ لیکن بے قاعدہ اور غلط۔ مثلاً اردو میں جہاں چھوٹے لڑکے کا کہیں گے۔ اہل برج اسکی جگہ "لوہڑے چھورا کو" کہیں گے۔ اس میں بے قاعدگی یہ ہے کہ اہل اردو اسم کی تصریف کی خاطر اس کے اسمائے صفات و دیگر متعلقات کو بنجابی کی طرح متصرف کرتے ہیں۔ یہاں برج میں اسم "چھورا" کو منصرف نہیں کیا۔ اور اسم صفات لوہڑے کو منصرف کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اہل اردو اسی جملے کو لوہڑے چھوڑے کا کہیں گے اس سے ہمیں قیاس لگا لینا چاہیے کہ تصریف کا قاعدہ اردو سے لیا ہے۔ یہی حالت کنواں میں سوں اور کالے گھوڑا کو زین کی ہے۔ اردو میں جمع الف اور نون کے اضافہ سے بنتی ہے۔ برج نے بھی اس قاعدہ کو اردو سے لیا ہے۔ لیکن اس کا استعمال بہت کم ہوتا ہے۔ افعال کا پیچیدہ طریقہ جو اردو اور پنجابی میں افعال مرکبہ یا توابعات کے الحاق سے ہوتا ہے۔ برج اس سے بڑی حد تک آزاد ہے۔

اردو کی "لام" برج میں "رے" بدل جاتی ہے۔ مثلاً جلنا۔ جرنا۔ یہ بھی یاد رہے کہ "ڑے" اردو میں کثرت سے آتی ہے۔ اسکے برج میں بہت کم مستعمل ہے اردو کی "ڑے" یا "ر" "رائے" جہلہ سے بدل جاتی ہے۔ مثلاً لڑی۔ لری۔ لڑائی

لڑائی۔ جڑی۔ جوڑی۔ پھاڑنا۔ پھاڑنا۔ یا "دال" سے بدلتی ہے جیسے بڑا۔ بڈا۔ گاڈی۔ گاڑی۔ گوڑ۔ گوڈ۔ گاڑنا۔ گاڈنا۔

شہر دہلی میں اگرچہ اردو بولی جاتی ہے لیکن آس پاس کے دیہات میں میہریانی زبان موجود ہے۔ جو درحقیقت اردوے قدیم کی ایک شکل ہے یہ نظریہ کہ اردو برج سے نکلی ہے اس عقیدہ پر مبنی ہے کہ قدیم زبانوں میں دہلی میں برج زبان بولی جاتی ہے لیکن آج دہلی برج کے علاقہ سے فاصلہ پر واقع ہے۔ مسلمان عہد سے پیشتر ممکن ہے کہ دہلی میں برج کا رواج ہو۔ لیکن اردو پر برج کے اثرات کی توجیہہ اور طرح کی جاسکتی ہے۔ سکندر لودھی کے عہد سے شاہجہاں کے زمانہ تک آگرہ لودھیوں۔ سوروں اور مغلوں کا پایہ تخت تھا۔ جو عین برج کے علاقہ میں واقع ہے۔

مسلمان اور ہندی زبانیں

امیر خسرو اپنی مثنوی نہ سپہر میں ہندوستان کی مفصلہ ذیل زبانوں کا شمار کرتے ہیں۔
(۱) سندھی (۲) لاہوری (۳) کشمیری (۴) ڈوگری (۵) دہیور سمندری (۶) ملنگی۔
(۷) گجراتی (۸) معبری (۹) گوڑی منسوب بہ گوڑ۔ قدما گوڑ کو لکھنوتی کہتے تھے۔ پٹھان گوڑ۔
مغلوں نے جنت آباد نام دیا۔ (۱۰) بنگالی (۱۱) اودھی (۱۲) دہلوی (۱۳) سنسکرت
جو عربی کے سوا تمام زبانوں سے افضل ہے۔

کسی قدر ترمیم کے ساتھ یہ تقسیم آج بھی صحیح مانی جا سکتی ہے۔ ان زبانوں کو ہندوستان کی قدیم پراکرتوں کی یادگار مانا جاتا ہے۔ لیکن ان میں ادب و شعر مفقود تھے۔ البتہ گیت اور سرود کا رواج تھا۔ جو عوام کی زبان زد تھے۔ اور یہ مسلمان ہیں جنھوں نے سب سے پیشتر ان زبانوں کی طرف توجہ دی ہے اور شاعری کا ان میں رواج دیا۔

مسلمانوں کی آمد سے پیشتر سنسکرت زبان ہندوؤں کی مذہبی۔ علمی۔ درباری اور ادبی زبان تھی۔ برہمن راجاؤں کے درباروں میں حاوی تھے اور مذہب و علوم الٰہی کی حفاظت میں موجود درباروں میں سنسکرت اور سنسکرت بولنے والوں کا گذر تھا عوام الناس میں تعلیم عام نہیں تھی اور نہ اس دیوبانی کی تحصیل کی ان کو اجازت تھی وہ صرف برہمنوں کی میراث تھی۔ رعایا میں تجارت پیشہ لوگ اپنے لیے اسی قدر تعلیم ضروری سمجھتے تھے کہ بہی کھاتہ اور حساب جان سکیں۔ ورنہ باقی رعایا جاہل مطلق تھی۔ دیسی زبانیں جن کے بولنے والوں کی تعداد کروڑوں تھی عام کس مپرسی کی حالت میں تھیں۔ نہ ان میں ادب تھا نہ شعر۔ برہمن جو ملک کا تعلیم یافتہ طبقہ تھا سنسکرت کے ہوتے ہوئے عام پراکراتوں کی طرف کیوں توجہ کرتا۔ ان زبانوں کی ترقی یا ان علوم

وہ تنزل کا رواج اس فرقہ کے عین مقاصد کے مخالف تھا۔ راجا در پرجا پر اس کا اقتدار اس قدر عظیم تھا کہ دنیا کا کوئی مذہب اسکی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ برہمن کے بغیر دین و دنیا کا ہر کام بند تھا۔ اسکی صدارت کے بغیر عبادت اور پرستش دشوار تھی۔ بہوت۔ زیست شادی غمی میں اسکی شرکت لازمی تھی۔ ان کا معالج وہ تھا۔ نجومی وہ تھا۔ وزیر وہ تھا مشیر وہ تھا۔ مدبر وہ تھا اور مقنن وہ تھا قصہ مختصر یہ کہ کونین میں نجات انسانی کا مختار کار وہی تھا۔ ادھر راجا قبضے میں تھے اور ادھر دیوتاؤں پر تصرف تھا۔ برہمنوں نے نہ صرف جماعتی آزادی کو معطل کر دیا تھا نہ صرف عوام الناس پر تعلیم کا دروازہ بند کر دیا تھا بلکہ ضمیر انسانی کی حریت کو بھی اپنے طاقتور قوانین سے ہمیشہ کے لیے مفلوج کر دیا تھا صدیاں اس ابدی سکوت اور سکون میں گذر گئیں۔ آخر بودھ جی مہاراج آئے اور انھوں نے اپنے مت کی تلقین عوام الناس کی زبان میں شروع کی۔ اس طرح پالی زبان نے کچھ عرصہ میں بے حد ترقی کر لی۔ اور بدھ مت والوں کی مذہبی زبان بن گئی۔ کئی صدی بعد برہمنوں نے اپنا کھویا ہوا اقتدار پھر حاصل کر لیا اور بدھ مت کا ہندوستان سے اخراج کر دیا۔ اور ایک مرتبہ اور ہندوستان میں برہمنوں کا دور دورہ ہو گیا۔

سنسکرت اور برہمنوں کے اقتدار کے زمانہ میں ظاہر ہے کہ کوئی دیسی زبان ترقی نہیں کر سکتی تھی اور نہ اس کے لیے کوئی ایسا موقع تھا لیکن مسلمانوں کی آمد عظیم الشان تغیرات کا پیش خیمہ ہے جن کے آنے پر اقتصادی، معاشی، تمدنی اور لسانی انقلاب رونما ہوئے مسلمان فاتحانہ حیثیت سے آئے۔ اور بہت جلد اس سرزمین کو اپنا وطن تصور کرنے لگے۔ انھوں نے ممالک خارجہ کی تجارت کا دروازہ اس ملک میں کھول دیا۔ بیسیوں نئی صنعتیں مثلاً کاغذ سازی، پشمینہ سازی، زین سازی، نعلبندی، باغبانی، فن حلوائی، قالین سازی، پارچہ بافی، طب یونانی، فن تعمیر، کاشی کاری، آئینہ سازی بیلداری، دار سازی، کشتی گری، شال بافی وغیرہ وغیرہ کی ترویج دی۔ زندگی کے ہر

شعبہ اور فن کو نمایاں ترقی دی۔ فنون لطیفہ کی سرپرستی کی۔ مختلف کھانوں اور اچاروں کا رواج دیا۔ قسم قسم کے عطریات کی ایجاد کی۔ شعروادب پرستی مسلمانوں کی قومی خصوصیت ہے چنانچہ جب وہ ہندوستان میں آباد ہوگئے اور ملکی زبان سمجھنے اور بولنے لگے تو ان کی یہ قومی خصوصیت بڑے کار آئی۔ اور وہ اس ملک کی زبان میں دلچسپی لینے لگے۔ ہندوستان کے شمال و مغرب کی زبانیں جن میں پشتو۔ کشمیری۔ سندھی اور پنجابی شامل ہیں۔ اکثر مسلمان شعراء کی مرہون منت ہیں۔ برج اور دھی۔ گجراتی اور بنگالی زبانوں میں ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں نے بھی ایک معقول حصہ لیا ہے۔

میرا یہ بیان کہ ہندی زبانوں کے ادبیات مسلمانوں کے ہندوستان میں قیام کا نتیجہ ہیں ایسے حلقوں میں جہاں برج کی شاعری اور پرتھی راج راسا کی قدامت میں یقین کیا جاتا ہے ناقابل قبول ہوگا۔ کیونکہ ایک عرصہ سے برج اور راسا کا نام ہماری روایات میں گونج رہا ہے۔ لیکن اگر واقعات کو اچھی طرح پر تولا جائے اور اس امر کو بھی مدنظر رکھا جائے کہ ہندو قوم تاریخ میں ہمیشہ کمزور رہی ہے اور آج بھی اسکی تحقیقات قدیم ادبیات ہندی کے متعلق الجھی اور پریشان ہونے کے علاوہ زیادہ تر ظنی واقعات پر پہنچا ہے۔ تو میرے مطالبات کا سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

یہاں میں اپنے دعوی کی تائید میں جناب دنیش چندر سین بی۔ اے کی تاریخ ادبیات بنگال سے ایک اقتباس جو زیادہ تر خلاصہ کی شکل میں ہے۔ ناظرین کو پیش کرتا ہے۔

"بنگالی زبان کے ادبی پایہ تک ارتقا حاصل کرنے کے متعدد اسباب ہیں ان میں سب سے پیش پیش بلاشائبہ اشتباہ مسلمانوں کی فتح بنگال ہے۔ اگر ہندو راجا بدستور سابق مختار اور حکمران رہتے تو بنگالی زبان کے لیے دربار تک رسائی حاصل کرنا ایک دشوار امر تھا۔ ان پٹھانوں نے تیرھویں صدی میں بنگال کو تسخیر کرلیا۔ ان کے سلاطین نے بنگالی زبان سیکھی اور اپنی کثیر التعداد ہندو رعایا

کے ساتھ جن پر حکمرانی کرنے کے لیے وہ آئے تھے۔ قریبی تعلقات قائم کرلیے
جب ان سلاطین نے سنسکرت کے مشہور رزمیوں رامائن اور مہابھارت
کا ذکر سنا۔ جو ہندوؤں کی مذہبی اور منزلی زندگی کی تشکیل میں عجیب
غریب اثر رکھتے تھے۔ تو قدرتاً ان کو شوق ہوا کہ ان نظموں کے موضوع
سے آگاہی حاصل کریں۔ انھوں نے چند عالموں کو بنگالی زبان میں ان
کے ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ جس زبان کو وہ اب بولتے اور جانتے تھے
مہابھارت کا بنگالی ترجمہ ناصر شاہ والی گوڑ کے حکم سے ہوا جس نے ۱۳۲۵ء
تک پورے چالیس سال سلطنت کی تھی۔" (صفحہ ۱۱۵)

جب بنگالی زبان کے ادبیات کا رنگ زیادہ مسلمانوں کے ساتھ سے رکھا جاتا ہے
جس کا ہم کو اب تک کوئی علم نہیں تھا۔ تو یقین کرلینا چاہیے کہ دوسرے علاقوں میں جو اہل
اسلام کے زیر نگیں تھے، انھوں نے دیسی زبانوں کی ترویج میں ضرور حصہ لیا۔ اس کا ثبوت
پیش کرنا کوئی دشوار نہیں ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ بھاشہ کے ہندی میں مسلمانوں
کے نام ہندو شعرا سے اقدم ہیں۔ ہندی کا پہلا بڑا شاعر کبیر ہے جو نویں صدی ہجری
سے تعلق رکھتا ہے۔ ہندو شعرا زیادہ تر دسویں ہجری میں پیدا ہوئے ہیں جیسے
تلسی داس اور سور داس۔ کبیر سے پیشتر بھی مسلمان شعرا موجود تھے۔

مسلمانوں میں ہندی شعرا کے سرتاج خواجہ مسعود سعد سلمان المتوفی ۵۱۵ھ ہیں
ان کا ہندی کلام اگرچہ دستبرد زمانہ سے محفوظ نہیں رہا لیکن بارہ ماسہ سب سے پیشتر
انھی نے لکھا ہے۔ چنانچہ فارسی میں ان کا مشہور یہ دوازدہ ماسہ اب تک محفوظ ہے
چونکہ پنجاب سے مسلمانوں کے تعلقات دہلی کے مقابلہ میں زیادہ قدیم ہیں اسلیے مسلمانوں نے
اسی ملک کی زبان میں سب سے پہلے شعر گوئی کی بنا رکھی۔ مشائخ صوفیہ نے سب سے پیشتر
دہلی و پنجاب میں ہندی کی سرپرستی کی ہے۔ ان کا تعلق عوام الناس سے براہ راست تھا

اس لئے دیسی زبانوں کی تربیت انہی سے شروع ہوتی ہے۔ ان اہل اللہ میں ہم بعض مشہور بزرگوں کے نام دیکھتے ہیں مثلاً شیخ فریدالدین مسعود متوفی ۶۶۴ھ شیخ نظام الدین اولیا متوفی ۷۲۵ھ۔ امیر خسرو متوفی ۷۲۵ھ۔ شیخ شرف الدین بو علی قلندر پانی پتی متوفی ۷۲۴ھ انھوں نے شیخ نظام الدین اولیا سے ہندی دوہروں میں مشاعرات کیے ہیں اور مبارز خاں کے ارادہ سفر کے وقت ذیل کا ہندی دوہا مع اس کے ترجمہ فارسی کے خان کے پاس بھیجا تھا۔

سجن سکارے جائیگے اور نین مریں گے روئے ۔۔۔ بدھنا اسی رین کر بھور کدہی نہ ہوئے

شعر فارسی:-

من شنیدم یار من فردا رود در راہ شتاب ۔۔۔ یا الٰہی تا قیامت بر نیاید آفتاب

اسی جماعت نے ہندی موسیقی کی تہذیب ترقی میں بھی بڑا حصہ لیا ہے جہاں فارسی موسیقی اور ترانہ کے وہ دلدادہ تھے۔ ہندی موسیقی سے بھی ان کی خانقاہیں خالی نہیں تھیں وہ سنسکرت تک کے نغمات سننے کے عادی تھے شیخ بہاء الدین ذکریا ملتانی متوفی ۶۶۶ھ اس فن میں مہارت کامل رکھتے تھے۔ ملتانی دھناسری انہی کی ایجاد ہے۔ امیر خسرو نے فارسی اور ہندی موسیقی کو پیوند دیا۔ سلطان حسین شاہ جونپوری ۹۰۵ھ نے سترہ راگ ایجاد کیے۔ نایک بخشو نے بہادری راگ۔ نائکی کلیان اور نائکی کانہڑا وضع کیے۔ درباری کانہڑا میاں تان سین کی یادگار ہے۔ شیخ عطاء اللہ الملقب بہ شیخ رتن فن موسیقی میں ممتاز پایہ رکھتے تھے۔ شیخ بہاء الدین برناوی متوفی ۱۰۳۸ھ اس فن میں کامل و اکمل تھے۔ ساز خیال اور ساز کھڑاس کے موجد ہیں۔ ابراہیم عادل شاہ متوفی ۱۰۳۵ھ فن موسیقی میں نائکی درجہ رکھتا تھا۔ باز بہادر والی مالوہ اس فن میں بے نظیر مانا گیا تھا۔ موسیقی میں مسلمانوں نے اس قدر ترقی کی تھی کہ اس فن پر جس قدر نفیس کتابیں لکھی گئی ہیں اکثر مسلمان مصنفین نے لکھی

ہیں۔ بنگالی میں اس فن کی تمام تر تصنیفات مسلمان دماغوں کا نتیجہ ہیں۔

سلاطین و امراء و عمال نے ہندی کی سرپرستی میں کچھ کم حصہ نہیں لیا۔ یہ ناصر الدین لکھنوتی متوفی سنہ ۷۲۵ھ بنگالی میں مہابھارت کا ترجمہ کراتا ہے اسی عہد میں فیروز شاہ خلجی متوفی سنہ ۶۹۵ھ سنسکرت سے بعض کتابیں ترجمہ کراتا ہے۔ سلطان زین العابدین والی کشمیر متوفی سنہ ۸۷۸ھ کئی زبانوں میں ماہر تھا۔ تبتی زبان بھی بے تکلف بولتا تھا۔ ایک طرف جہاں اس نے مہابھارت اور راج ترنگنی کا ترجمہ کرایا۔ دوسری طرف فارسی عربی کتابوں کا بھی کشمیری زبان میں ترجمہ کرا دیا۔ ودیاپتی شاعر غیاث الدین والی بنگال کا مداح ہے ہندی زبانوں کی سرپرستی میں علاء الدین حسین شاہ والی بنگالی متوفی سنہ ۹۲۵ھ کا نام آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ اس کا دربار ہندی اور بنگالی شعراء سے آباد تھا قطبن نے اپنی تصنیف مرگاوتی جس کا ذکر آئندہ آئے گا سنہ ۹۰۹ھ میں اسی بادشاہ کے نام پر معنون کی ہے۔ اور مالا دھر واسو ساکن کانگرام اسی بادشاہ کے حکم سے بھاگوت کا بنگالی زبان میں ترجمہ کرتا ہے۔ ابھی اس نے دو باب ہی ترجمہ کئے تھے کہ بادشاہ نے شاعر کو سنہ ۱۴۸۰ء میں گنراج کا خطاب دے دیا۔ اسی حسین شاہ کے سپہ سالار پراگل خاں کے حکم سے جو ناظم چٹاگانگ بھی تھا۔ کوندر پرمیسور نے مہابھارت کا دوسرا ترجمہ بنگالی زبان میں کیا۔ ترجمہ ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ اس کا انتقال ہو گیا اس کے فرزند چھوٹے خاں نے جو باپ کا قائم مقام ہوتا ہے سری کرنا نندی کو اسی کام پہ مقرر کیا اور ترجمہ ختم ہو گیا۔

قاضی محمود گجراتی متوفی سنہ ۹۴۲ھ ہندی کے زبردست شاعر تھے۔ ان کے اشعار مجالس حال و قال کو ایک عرصہ دراز تک گرماتے رہے۔ ملک محمد جائسی نے شیر شاہ سوری پر پدماوت لکھی۔ اور دوسری متعدد تصنیفات اپنی یادگار چھوڑیں۔ شیخ دانیال چشتی آٹھویں صدی ہجری میں پیدا ہوتے ہیں اور ایک سو گیارہ سال عمر

پا کر ۹۹۴ھ میں رحلت کرتے ہیں ہندی کے اعلیٰ شاعر تھے۔ شیخ عثمان غازیپوری نے چتراولی کا عشقیہ افسانہ لکھا۔ قطبن۔ محمد جائسی اور شیخ عثمان غازی پوری نے عام مذاق تصنیفیں لکھکر ہندی شاعروں کو عالمگیر مقبولیت کی شاہراہ پر گامزن کر دیا تھا لیکن افسوس ہے کہ بعد کے آنے والے شعرا نے اس کو مذہبی رنگ میں رنگ دیا۔ تلسی داس اور سور داس نے زبان کو مذہبی تنگنا میں محصور کر کے مناقب سری رامچندر و سری کرشن کیلئے وقف کر دیا۔ پیچھے شاعر جو آئے اور جن میں اکثر ہندو تھے تلسی داس اور سورداس ہی کے نقش قدم پر جاہ و پیما ہوئے اور نتیجہ یہ نکلا کہ ہندی شاعری مذہب کی جکڑ بندیوں سے کبھی آزاد نہ ہو سکی اور پھر گزشت کرشن و رامچندر کے بیان پر اسکی تمام جد و جہد ختم ہو گئی۔

اکبر کے دربار میں متعدد بلند شاعر موجود تھے جن کی تنخواہیں اور جاگیریں تھیں اس کا فرزند شہزادہ دانیال ہندی کا قابل شاعر تھا۔ عبد الرحیم خانخاناں فن شعر میں بلند پایہ رکھتے تھے۔ ان کا دربار فارسی اور ہندی شعرا کا مرجع تھا۔ نرہری اور بابا کوی اکبر کے دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ بابا کوی کو جس کا نام نہور یا پہلا نام تھا۔ بادشاہ نے راؤ کا خطاب اور جاگیر عطا کی تھی "کلی چرتر" اسی نے عبد الرحیم خانخاناں کے اشارہ سے لکھی تھی۔ تان سین نے اپنی کتاب سنگیت سار اسی عہد میں تالیف کی۔

کیشو مسر اور پوکھر دونوں جہانگیر کے دربار کے شعرا کے زمرہ میں داخل تھے اسی عہد میں طاہر نے کتاب کوک ساز ۱۰۳۰ھ میں تصنیف کی بندر داس کو الیا کی اور ہرژمنی شاہجہان کے عہد کے شعرا میں ہیں۔ ہرژمنی نے شاہجہاں کے ارشاد سے اردشی نام کی منظوم لغت تیار کی۔ سندر داس کو شاہجہاں نے مہاکوی راجہ کا خطاب دیا تھا۔ دیدک میں ایک کتاب پران کھو نامی ۱۰۶۴ھ میں وجود میں آئی جگناتھ کلاونت کو شاہجہاں نے خطاب "کبرایے" عنایت کیا۔ بادشاہ کے نام پر بارہ دیہ پد اس نے مختلف نغموں میں تیار کیے جو بادشاہ کو بہت پسند آئے۔ شاہی حکم سے وہ روپے میں تولا گیا۔ اس کا وزن چار ہزار پانچ سو روپیہ

ہوا اور یہی روپیہ اس کو انعام میں مل گیا۔

شیخ پیر محمد سلون متوفی ۱۰۷۴ھ ہندی و فارسی میں عمدہ اشعار لکھتے تھے۔ شیخ جنید موہانی چشتی ۱۰۸۸ھ عربی فارسی و ہندی کے اعلیٰ شاعر تھے۔ داراشکوہ کے ہاں متعدد ہندی خواں ملازم تھے جن کا کام ہندی زبان میں ترجمے کرنا تھا۔ "سار سنگرہ" جو دوہوں کی بیاض ہے اسی کے حکم سے مدون ہوئی۔

سترھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں دولت قاضی نے "لور چندرانی" بنگالی نظم لکھنی شروع کی۔ قاضی کی بے وقت وفات کی وجہ سے یہ نظم نہ ہو سکی۔ علاول ایک اور مسلمان شاعر نے ۱۶۵۶ء میں اسکی تکمیل کی۔ عبدالحکیم نے قصہ یوسف زلیخا کو اسی زبان میں نظم کیا۔ دولت وزیر بہرام نے لیلیٰ مجنوں کی مثنوی لکھی۔ محمد اکبر نے "یمین جلال" ایک عشقیہ افسانہ پر قلم اٹھایا۔ کبیر محمد نے "رنگ مالا" شمشیر علی نے "ریحوان سہالا" (رضوان شاہ) اور شمس الدین صدیقی نے "بھاؤ لابھ" تصنیف کیں۔ بنگالی زبان میں بیشمار مصنفین گزرے ہیں۔ جنھوں نے مسلمانی بنگالی میں بھی یادگار چھوڑی ہیں۔

عالمگیر کا دربار اگرچہ شاعروں سے خالی نظر آتا ہے لیکن اس کا لاڈلا فرزند اعظم شاہ ہندی زبان سے بے حد الفت رکھتا تھا۔ نواز ایک مسلمان شاعر نے اعظم خاں کی خواہش پر ۱۱۰۰ھ میں شکنتلا ناٹک لکھی۔ اسی شہزادہ کے فرمان سے مختلف کویوں نے مل کر بہاری شاعر مشہور "ست سئی" کی تدوین کی یہ نسخہ اشاعت اعظم شاہ کے نام سے مشہور ہے۔

دیو شاعری شاہ عالم اول ۱۱۲۴ھ کے دربار سے متعلق تھا ایک اور شاعر عالم نامی اس بادشاہ کا ملازم خاص تھا۔ ہندوؤں کی روایت ہے کہ عالم دراصل برہمن تھا کسی مسلمان عورت کے عشق میں مبتلا ہو کر مسلمان ہو گیا۔ عالم نے ایک تصنیف "عالم کیلی" لکھی جس میں رادھا اور کرشنا کے واقعات درج ہیں۔ اپنی یادگار چھوڑی ہے۔ قاسم بسر وا عبد کیشو داس کی "رسک پریا" پر ایک نفیس شرح لکھی۔

سری پت، بھٹ گجراتی ایودھیا برہمن تھا۔ اس نے سید ہمت خاں نواب الہ آباد کے نام پر "ہمت پرکاش" ہندی ویدک میں بعہد عالمگیر ۱۶۷۶ء میں نظم کی اور شاعر بلبیرانے ہمت خاں مذکور کی فرمائش پر فن عروض میں کتاب "پنگل منوہرن" سمت ۱۷۱۰ بکرمی میں تصنیف کی سید محمد سعید المخاطب بہ سید میراں بھیک چشتی صابری عہد عالمگیر کے بزرگ ہیں ان کا انتقال ۱۱۳۱ھ میں ہوتا ہے۔ ہندی زبان کے قابل شاعر تھے۔ قوال ان کے اشعار ابھی تک گاتے ہیں۔ انہی کے مرید محبوب عالم عرف شیخ جیون ہیں۔ ہریانہ کی زبان میں ان کی تصنیف دردنامہ محمد ہے۔ محشر نامہ بھی انہی کی یادگار ہے۔

یعقوب خاں نے بندیلی زبان میں کتاب "رس بھوشن لکھی" "کھ سکھ" میرزا عبدالرحمن نے عہد فرخ سیر میں تالیف کی۔ سید پہاڑ عرف سید حمزہ "رس رتناگار" ایک طبی تالیف کے مصنف ہیں۔ شیخ سلمان ایک معراج نامہ موسوم بہ "خالق نامہ" کے ناظم ہیں۔ شیخ خوش محمد قادری نوشاہی متوفی ۱۱۲۰ھ فارسی و ہندی کے مقبول شاعر تھے۔

خود محمد شاہ بادشاہ دہلوی متوفی ۱۱۶۱ھ ہندی زبان کا شاعر تھا۔ اسکی تصنیفات سے ایک بارہ ماسہ ابتک موجود ہے۔ اعظم خاں نے اسکے حکم سے "سنگار درپن" سمت ۱۷۸۶ بکرمی میں تالیف کی۔ آنند گھن شاعر محمد شاہ کا ملازم تھا۔ امیر خاں محمد شاہی دیوی کوی کا مربی تھا صورت مسر اسی عہد میں نصر اللہ خاں محمد شاہی کا ملازم عالم فیض اور اکرم، غلام نبی اور انور خاں بھی ہندی شعرا کے زمرہ میں منسلک ہیں لیکن ہم ان کے زمانوں سے ناواقف ہیں۔ فیض غالباً محمد معظم فیض ہیں۔ جو فارسی ہندی کے زبردست شاعر تھے۔ اور سنسکرت کے فاضل۔ انھوں نے لیلاوتی کا سنسکرت سے دوبارہ ترجمہ کیا ہے۔ ڈیڈ وانہ کے رہنے والے ہیں۔ اور قاضیوں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا زمانہ عہد محمد شاہی ہے۔ ان کا فارسی دیوان اور کچھ مثنوی طبع ہو چکی ہیں۔

آخر میں "رس خان" کا نام بھی داخل کیا جاتا ہے جس کو ہندو و مذہباً ہندو بیان کرتے ہیں۔ کبھی اس کو ایک ساہوکار کے بچہ کا عاشق کہتے ہیں۔ کبھی کسی ہندو عورت کا شیدا بیان کرتے ہیں۔ اسی طرح اسے بعض سید کہتے ہیں اور بعض پٹھان شاہی خاندان کا اس کو ممبر بتایا جاتا ہے۔ کہتے ہیں رس خان ایک روز بھاگوت پڑھ رہا تھا اسکے دل میں خیال آیا کہ جس شخص پر ہزاروں گوپیاں عاشق تھیں اس سے عشق کرنا چاہیئے۔ ایک روایت یہ ہے کہ اسکی معشوقہ نے طعنہ دیا کہ جیسا تم مجھے چاہتے ہو اگر اس کو چاہتے جس کی ہزاروں گوپیاں عاشق تھیں تو تم کتنے پاک ہو جاتے۔ قصہ مختصر رس خان نے کرشن کا مقام دریافت کیا۔ اس سے کہا گیا کہ وہ برج میں رہتا ہے اس پر وہ برج چلا گیا۔ وہاں کرشن نے اپنے دیدار اسے دیئے۔ اسی طرح رس خان کرشن کا نام لیوا ہو گیا۔ اس کا زمانہ حیات اسکی نظم پریم پاٹکا سے معلوم ہوتا ہے کہ سمت ۱۶۷۱ بکرمی تھا۔ رس خان کے زمرہ میں علی خان۔ شیخ نبی۔ میر احمد تاج خاں اور پیرزادی بی بی کے نام بھی شامل کئے جا سکتے ہیں۔ ان کے واقعات حیات ہندی بھگت مالاؤں میں مل سکتے ہیں۔ ہندوؤں نے ان کو اپنی جماعت میں تسلیم کر لیا ہے۔

پرتھی راج راسا

"سنبھا چندر کا" میں ہندی شعرا کے ذکر میں لکھا ہے۔

"کہا جاتا ہے کہ گیارھوں شتک کے انت تک اپبھرنش کا پرچار تھا۔ اسکے اوپرانت وہ ہندی کے رنگ میں ڈھلنے لگی۔ کوئی چند ہندی بھاشا کے آدکوی ہیں۔ ان کے پہلے بھی کچھ کوی ہوتے ہیں۔ جن میں کھومان۔ قطب علی، سائیں دان، چارن، پشپ اکرم کوی کا نام وشیش اُلیکھ کئے گئے ہیں پرنتو ہندی بھاشا کے آدیم پر اور کوی چند برائی ہیں۔ ان کے پہلے کے کوئی کے نہ تو کوئی کاوی کہلانے یوگ ادھم گرنتھ ملتے ہیں اور نہ ان کی بھاشا ٹکسالی اتھوا استوک ہندی کہی جا سکتی ہے۔"

اس بیان کی رُو سے چند بردائی کو ہندی کا سب سے پہلا شاعر مانا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ چند پرتھی راج کا وزیر اور شاعر تھا، اور پرتھی راج راسا اسی کی طرف منسوب ہے۔ ۵۸۸ھ میں پرتھی راج تھانیسر کے میدان میں سلطان معز الدین محمد سام سے شکست کھا کر مارا جاتا ہے اور مسلمانوں کا قبضہ اجمیر و دہلی پر ہو جاتا ہے۔ راسا اس عہد کی تصنیف بتائی جاتی ہے لیکن راسا ایک مشتبہ تصنیف ہے اس کے متعلق بہت کچھ اختلاف آرا ہے۔ بعض اس کو چند کی اصلی تصنیف مانتے ہیں۔ اور بعض ایک مجہول تالیف خیال کرتے ہیں۔ باخبر اصحاب کی یہ رائے ہے کہ راسا سولھویں یا سترھویں صدی میں کسی نے چند کے نام پر تصنیف کر دی ہے۔ چنانچہ مہامہو پادھیا کبیراج شیامل دان جی کی یہی رائے ہے (ہندی نورتن صفحہ ۵۲) برخلاف اسکے ہندی نورتن اسکی اصلیت کے حق میں ہے۔

راسا سے واقف کاروں کی یہ رائے ہے کہ اس میں دس فی صدی فارسی اور عربی الفاظ موجود ہیں۔ جو بجائے خود بدگمانی کے لیے ایک زبردست دلیل ہے کیونکہ اجنبی زبانوں کے الفاظ کی اس کثرت کے ساتھ دہلی اجمیر کی زبان میں آمیزش ایسے ابتدائی زمانہ میں قریب قریب ناممکن ہے۔ اسکے بیانات بھی اس قدر لغویت سے لبریز ہیں کہ یہ کتاب بحیثیت کتاب تاریخ ہمارے احترام کی مستحق نہیں۔ مثلاً یہ بیان کہ شہاب الدین کا بھائی حسین نامی تھا۔ شہاب الدین کی بیوی سے ناجائز تعلقات رکھتا تھا۔ جب شہاب الدین کو ان تعلقات کی خبر ہوئی تو حسین اپنی پیاری جان لے کر پرتھی راج کے پاس بھاگ آیا۔ یا یہ کہ پرتھی راج نے شہاب الدین کو مختلف موقعوں پر سات مرتبہ شکستیں دیں گرفتار کیا۔ اور روپیہ لے کر چھوڑ دیا۔ نیز یہ کہ [illegible] الدین پرتھی راج کا مطیع و محکوم تھا۔ یہ بیانات اس قدر لغو ہیں کہ ہمیں انکی تردید میں کوئی وقت نہیں ضائع کرنا چاہیے۔ صرف اس قدر جاننا کافی ہے کہ حسین نام کا کوئی شخص معز الدین محمد بن سام کا بھائی نہیں تھا۔ اس کا صرف ایک بھائی تھا جو غیاث الدین محمد بن سام کے نام سے غور کا بادشاہ تھا۔ اور معز الدین محمد بن سام اسکے نائب اور سپہ سالار کی حیثیت رکھتا تھا۔ اسی طرح یہ خیال کہ پرتھی راج نے سلطان موصوف کو سات مرتبہ شکستیں دیں۔ اگرچہ ابو الفضل نے ہندو بیانات کی تقلید میں لکھ دیا ہے قرین عقل و قیاس نہیں کیونکہ جب ہم شہاب الدین کے کارناموں کو سالوار دیکھتے ہیں تو ان فرضی شکستوں کے لیے اسکی سوانح حیات میں کوئی گنجائش نظر نہیں آتی اس لیے یہ بیان بھی صداقت سے معرا ہے۔

راسا میں آتشیں اسلحوں کا ذکر بھی موجود ہے۔ جو راسا کے مفروضہ زمانہ سے کئی صدی بعد ہندوستان میں رائج ہوئے ہیں۔ ڈسن صاحب کہتے ہیں کہ:-

راسا کے ۱۵۰ ویں چھند میں تاتار خاں شہاب الدین کو مسلح ہونے اور آتشیں اسلحہ کی

تیاری کے لیے کہتا ہے ۔ ۲۵۷ ویں چھند میں توپوں اور ان کی
آوازوں کا ذکر آتا ہے ۔ ۴۱۲ ویں چھند میں راۓ گووند کا قتل زنبورک
کے ذریعہ سے جو شترنال کا دوسرا نام ہے ۔ بیان کیا جاتا ہے ۔

ہمیں ان بیانات کی اتنی ہی وقعت کرنی چاہیے جتنی پی چھوٹو کے امیر خسرو کو حقہ پلانے کے قصہ کی ۔ سلطان معز الدین کے عہد میں توپیں تھیں اور نہ زنبورک نہ اس کے عہد میں تاتار خاں کے نام یا خطاب کا کوئی شخص تھا ۔ تاریخ ہند میں سب سے قدیم شخص جو اس خطاب کا مالک ہے محمد ارسلان تاتار خاں ہے ۔ جو غیاث الدین بلبن متوفی ۶۸۶ھ کے عہد کا امیر ہے ۔

یہاں ایک اور امر قابل غور ہے کہ شہاب الدین سلطان محمد بن سام کے بچپنے کا نام ہے جو اسکے غزنیں کا بادشاہ بنائے جانے پر ترک کر دیا گیا اور معز الدین محمد بن سام اختیار کر لیا گیا ۔ اب اس نام سے وہ اپنی مدت سلطنت میں مشہور رہا ہے اسکے سکوں پر بھی یہی نام ہے اسکے عہد کے مورخین مثلاً تاج المآثر و طبقات ناصری اسی نام سے اس کا ذکر کرتے ہیں بعد کی تاریخوں میں مثلاً تاریخ فیروز شاہی میں بھی معز الدین کے نام سے مشہور ہے لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ راسا میں بار بار اس کو شہاب الدین غوری کے نام سے یاد کیا گیا ہے اس پہیلی کا حل یہی ہے کہ اکبر عہد کے مسلمان مؤرخین زیادہ تر اس کو شہاب الدین کے نام سے پکارتے آئے ہیں ۔ چنانچہ بعد کے مورخین نے یہی نام اختیار کر لیا ۔ اس لیے اگر راسا کا مصنف سلطان معز الدین کا درحقیقت معاصر ہوتا تو وہ قطعاً شہاب الدین نہ لکھتا بلکہ معز الدین لکھتا ۔ راسا میں توپ بندوق کا ذکر دس فیصدی غیر ہندی الفاظ کی آمیزش اور دیگر بیانات کی لغویت وغیرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب ایسے زمانہ میں لکھی گئی ہے جبکہ توپ و بندوق ہندوستان میں عام طور پر استعمال ہونے لگی ہیں ۔ اور فارسی وعربی الفاظ ہندی زبان میں شامل ہو چکے ہیں ۔

امیر خسرو

وفات ۷۲۵ھ

ادبی دنیا کے آفتاب عالمتاب ہیں اور خاک ہند اب تک ان کے اوصاف و کمالات کا انسان پیدا نہیں کر سکی ہے۔ وہ ایک طرف فارسی کے زبردست ناظم و ناثر ہیں۔ دوسری طرف عربی و سنسکرت میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں۔ متعدد امور کی ایجاد انہیں کی طرف منسوب ہے۔ ہندی اور ایرانی موسیقی کی تدوین کر کے اپنی ایجادوں سے اسے مالا مال کر دیتے ہیں۔ جہاں فارسی پر ان کے احسان ہیں، وہاں ہندی بھی ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوئی ہے۔ ان کی تصنیفات نظم و نثر کی تعداد ننانوے بتائی گئی ہے۔ اشعار کی تعداد چار اور پانچ لاکھ کے درمیان کہتے ہیں۔ جس قدر فارسی میں ان کا کلام ہے اس سے کہیں زیادہ ہندی میں بتایا جاتا ہے۔ لیکن امیر نے دیباچہ غرۃ الکمال میں اپنی ہندی نظموں کا ذکر بدیں الفاظ کیا ہے۔

"جزوے چند ہندوی نیز نذر دوستاں کردہ شدہ است۔ این جا ہم بہ دیگرے بس کردم و نظر بر آنست کہ لفظ ہندوی در پارسی لطیف و درد چنداں لطفے ندارد مگر بضرورت آنجا ضرورت بودہ است آوردہ شد"۔

آخری فقرہ میں اشارہ ہے۔ ان الفاظ و فقرات ہندی کی طرف جو امیر گاہ گاہ اپنے اشعار میں لکھ گئے ہیں لیکن امیر کے ہندی کلام کا اب تک پتہ نہ چل سکا۔ گزشتہ صدی کے تذکرہ نگاروں نے جو نمونہ کلام دیا ہے میں یہاں نقل کیے دیتا ہوں۔

از قسم شہر آشوب ہے

تیلی پسرے کہ می فروشد تیلے | از دست زبان چرب او وا ویلے
خالے بہ بنیش دیدم گفتم کہ تل است | گفتا کہ بہ وضعت دو میں تل تیلے

یہ عین ترجمہ ہے "ان تلوں میں تیل نہیں"۔ کا ہندوستان کا قاعدہ ہے کہ گوجریاں دودھ دہی وغیرہ لے کر گلی گلی آواز دیتی پھرتی ہیں۔ "لیو دہی لیو دہی" امیر کے عہد میں بھی یہی دستور تھا۔ فرماتے ہیں:

گجری کہ در حسن و لطافت چو مہی | آں دیگ دہی بر سر تو چتر شہی
از ہر دو لبت قند و شکر می ریزد | ہر گاہ بگوہی کہ "دہی لیہو دہی"
زرگر پسرے چو ماہ پارا | کچھ گھڑیے سنوارئیے پکارا
نقد دل من گرفت و بشکست | پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

اشعار ذیل بھی صنف شہر آشوب سے تعلق رکھتے ہیں:

رفتم بہ تماشا بکنار جوئے | دیدم بلب آب زن ہندوئے
گفتم صنما چیست بہائے موئیت | فریاد برآورد کہ دردر موئے

"دردر موئے" فارسی اور ہندی دونوں زبانوں میں پڑھا جاتا ہے فارسی میں یہ معنی ہیں کہ ایک ایک موتی کا ایک ایک بال ہے۔ ہندی میں یہ مطلب ہے کہ مردار دور ہو۔ فرہنگ آصفیہ میں ذیل کا قطعہ شہر آشوب امیر کے نام پر دیا ہے۔

ہندو بچہ کہ عجب حسن دھرے چھے | بر وقت سخن گفتن مکھ پھول جھڑے چھے
گفتم ز لب لعل تو یک بوسہ بگیرم | گفتا کہ ارے رام ترک کاہیں کرے چھے

اس قسم کی نظمیں جن میں پیشہ وروں کا قطعات کی شکل میں ذکر ہو۔ شہر آشوب کہلاتی ہیں۔ مولانا محمد امین چڑیا کوٹی جنہوں نے جواہر خسروی میں امیر کا شہر آشوب مرتب کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"سنسکرت اور ہندی بھاشا میں اس قسم کی نظمیں میری نظر سے گزری ہیں

ڈپٹی دکیرد لاس گوپال کوی نے اسی طرز پر نظم کیا ہے جس میں تمام پیشہ وروں اوران کے نام اور ان کے کام نظم میں بیان کیے ہیں۔ غالباً اسی طرز کو حضرت امیر خسرو نے فارسی زبان میں لاکر ایک جدت اور فارسی لٹریچر میں نیا اضافہ کیا ہے۔"

میں یہاں اس قدر اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس معاملہ خاص میں امیر خسرو سنسکرت بھاشا کے مرہون منت معلوم ہوتے ہیں کیونکہ خواجہ مسعود سلمان سب سے پیشتر فارسی میں ان نظموں کا رواج دیتے ہیں اور "مقطعات شہر آشوب" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ تمثیلاً خواجہ کے شہر آشوب سے یہاں ایک آدھ نمونہ حوالۂ قلم کر دیا جاتا ہے۔

در حق دلبر جباز بگفت

آنکہ او بر دکاں ز بس خوبی ہمچو خورشید بر سپہر آمد
شد فراز تنور چون دل من بلد و مد رفت و بادہ مہر آمد

صفت یار بربطی گفتہ

بتا زہرۂ آسماں جمالی چو زہرہ ہمین بر تو فرخندہ حالی
کنارہ تو خالی نباشد ز بربط ز بربط نباشد ہیلے زہرہ خالی

ذیل کی نظم بھی امیر کی طرف منسوب ہے سہ

زحال مسکیں مکن تغافل: دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبان ہجراں دراز چوں زلف در روز وصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کوں جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکین

کیے پڑی ہے جو جا سنا دے پیارے پی کو ہماری بتیاں
چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں ز مہر آں مہ بگشتم آخر
نہ نیند نیناں نہ انگ چینا نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں
بحق روز وصال دلبر کہ داد ما را فریب خسرو
سپیت منکے درائے لاکھوں جو جائے پاؤں پیا کی کھتیاں

وہ گئے بالم وہ گئے ندیو کنارہ   آپے پار اتر گئے ہم تو رہے اروار
بھائی رے ملاحو ہم کو پار اتار   ہاتھ کا دیوں دنگی مندری گل کا دیوں ہار
دکھ میں اپنے حال کو روؤں زار و زار   بی کن دونا بہت ہیں ہم ہیں او گنہگار
بابل بھیجی ہیں دہج کوں تا نداں کو بھول   ہو چھا دیکھ دہا جیا نا لا ہا سول
چکوا چکوی دو جنے ان کو مارو نہ کو   او ماہی سے کرتار کے رین بچھوڑی ہو
بیسج و چہیتی دیکھ کے روؤں دن رین   پیا کرتی ہیں پہر دن پل بھر سکھ نہ چین
سونا ریں تسو سکھ سیوین کنتاں کو گل لال   ہیں دو کھیاری جنم کی دوکھی گئی بہار
تاری چھوٹا دیس میں قصبے پڑی پکار   دروازے دینی رہ گئے نکس گئے اسوار
گوری سوئے پلنگ پر مکھ پر ڈارے کیس   چل خسرو گھر اپنے سانجھ پڑی چو دیس

(از بیاض مملوکہ پروفیسر سراج الدین آذر ایم۔اے پرفیسر اسلامیہ کالج لاہور)

ذیل کی غزل ایسی بیاض سے نقل کی جاتی ہے جو تیرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں لکھی گئی ہے ؎

جب یار دیکھا نین بھر دل کی گئی چنتا اتر   ایسا نہیں کوئی عجب راکھے اسے سمجھائے کر
جب آنکھ سے او جھل بھیا تڑپن لگا میرا جیا   حقا الٰہی کیا کیا آنسو چلے بھر لائے کر
توں تو ہمارا یار ہے تجھ پر ہمارا پیار ہے   تجھ دوستی بسیار ہے یک شب ملو تم آئے کر
جاناں طلب تیری کروں دیگر طلب کس کی کروں   تیری جو چنتا دل دھروں اک دن ملو تم آئے کر

ہمیرا جو من نم نے لیا تم نے اٹھا غم کوں دبا   غم نے مجھے ایسا کیا جیسا پتنگا آگ پر
خسرو کہے باتاں غضب دل میں نلاوے کچھ عجب   قدرت خدائی ہے عجب جب جیو دیا گل لائے کر

(از بیاض پروفیسر سراج الدین آذر ایم۔ اے)

میں نے اس غزل کو یہاں لکھ تو دیا ہے لیکن یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ امیر خسرو اس کے مالک ہیں۔

خالق باری

یہ وہ خوش قسمت کتاب ہے جو بالاتفاق امیر خسرو دہلوی کی طرف منسوب ہے تذکرہ نگاروں نے اس کے متعلق حسب معمول مبالغہ سے کام لیا ہے۔ مولوی محمد امین صاحب چڑیا کوٹی فرماتے ہیں کہ "اس میں کئی ہزار اشعار تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ کئی بڑی بڑی جلدوں میں اور اپنے تخیل کی رنگینی سے کام لے کر یہ فقرہ بھی اضافہ کر دیا ہے کہ "وہ ایک بھٹیاری کے لڑکے کے لیے لکھی گئی تھی۔" لیکن اگر تحقیق سے کام لیا جائے تو یقین ہے کہ یہ بیانات بے اصل ثابت ہوں۔ یہ بات تو عقل میں آتی ہے کہ بچوں اور مبتدیوں کے لیے جو کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ بالعموم مختصر اور رسالہ کی شکل میں ہوا کرتی ہیں مثلاً حامد باری۔ رازق باری۔ واحد باری اللہ باری۔ ایزد باری۔ صمد باری اور قادر نامہ وغیرہ جو سب کی سب اسی خالق باری کی طرز میں ہیں۔ یہ رسالے اکثر اوقات بچوں کو حفظ کرائے جاتے تھے اس لیے ضروری ہے کہ مختصر ہوں

یہاں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خالق باری کے امیر کی طرف منسوب کرنے کے لیے ہمارے پاس کیا وجوہ ہیں۔ کلیات خسرو کے سلسلہ میں ایک جلد موسوم بہ جواہر خسروی

بھی علی گڑھ سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں امیر خسرو کے متفرق کلام کے علاوہ مولوی محمد امین صاحب چڑیا کوٹی نے خالق باری کو نہایت محنت اور تحقیق کے ساتھ مرتب کر کے شامل کر دیا ہے اس کے دیباچہ میں مولانائے ممدوح ذیل کے بعض وجوہ کی بنا پر خالق باری کو امیر کی تسلیم کرتے ہیں۔

"جیتل کا لفظ اس کتاب میں ملتا ہے جو حضرات امیر کے زمانہ تک ایک ہندی سکہ تھا اور آپ کے قریب عہد میں متروک ہو چلا تھا یہاں تک کہ تاریخ میں اس عہد کے بعد اس کا نام بھی نہیں ہوتا ہے۔"

میں اس کے متعلق اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ جیتل ہر زمانہ میں ملتا ہے مثلاً آئین اکبری میں جہاں اکبری عہد کے سکوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ابوالفضل جیتل کو ایک فرضی سکہ اور دام کا پچیسواں حصہ مانتا ہے۔

مہابت خاں عہد عالمگیری کا ایک امیر ہے وہ ایک عرضداشت میں جو سرتاپا شکایت سے مملو ہے لکھتا ہے۔

"مدار کار بر قاضی و قاضی برشوت راضی دروغ فی قند ھار اشتہار یافتہ کہ مطربان باستقبال فرمای شتابند و نرخ حسب الحکم موقوف بر دو جیتل افتادہ و اسد خاں کہ ہنوز بوئے شیر از دہانش رفتہ وزیر اعظم و دستور معظم فرمودند"

آنند بھیرلچ گوالیری نے فن سیاق میں ایک رسالہ موسوم بخلاصۃ السیاق ۱۱۱۵ھ مطابق سنہ جلوس عالمگیری میں تصنیف کیا ہے اس میں جیتل کا لفظ عام طور پر ملتا ہے چونکہ یہ رسالہ چھپا نہیں اس لیے یہاں دو فقرے نقل کر دیے جاتے ہیں۔

"دستور معلوم کردن داجہانہ بحساب فی من دو باید کہ مبلغ نرخ من را باد اجہا ضرب نمایند و حاصل ضرب را جیتل دانستہ پنجاہ جیتل یک تنگہ گیرد۔ مثلاً فی من بست تنگہ قیمت دام می باید۔ پس بست را با پنج ضرب دادیم حاصل ضرب

یک صد جیتل بباشد و ازیں دو تنگہ گرفتیم قیمت پنج دام معلوم شد"
"اگر کسی پرسد فی من دو تنگہ است و دو آثار را چہ باید داد۔ باید کہ آثار را با تنگہائے نرخ من ضرب دہد۔ حاصل ضرب را جیتل دانسته بر چہل جیتل مقرر نماید۔ پس یک بہلولی قیمت دو آثار معلوم شد"۔
شیخ حبیبہ کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو ۔

چو دزدانه ریکیں باشد کرے جو نبینہ سنجبا را
نباشد سود یک جیتل گو ادا سول ہی سا را

جس زمانہ میں جیتل کا سب سے زیادہ چرچا تھا وہ امیر خسرو کے عین بعد ہے سلطان فیروز شاہ تغلق ۷۵۲ھ تا ۷۹۰ھ نے اپنے عہد میں جیتل (ایک تنکہ کا پچاسواں حصہ) کی تقسیم جس میں نیم جیتل اور دانگ جیتل شامل ہے کر دی تھی چنانچہ مولانا شمس سراج اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں۔

"سلطان فیروز شاہ فرمان فرمود کہ مہر نیم جیتل کہ آنرا ادھا گویند و مہر دانگ جیتل کہ آنرا بکہ گویند وضع کنند تا غرض فقرا و مساکین حاصل شود"۔

جیتل کے لیے ہر عہد کی مثالیں بہم پہنچائی جا سکتی ہیں لیکن میں بخوف طوالت انہی امثال پر قناعت کر کے مولوی صاحب کے دوسرے استدلال کو بیان کرتا ہوں

(۲) محاورات قدیم مثلاً میانجہ کہیا " توکت رہیا " بادا ورائی (ہوا چلی) "آکھنا (دیکھنا) چاد (شوق)" وغیرہ ہم الفاظ کی گواہی سے خالق باری کا زمانہ تصنیف عہد خسروی میں قطعی طور پر مقرر اور متعین ہو سکتا ہے۔

یہ دلیل بھی مضبوط معلوم نہیں ہوتی کیونکہ میں بجی کہیا۔ توکت رہیا آج بھی ہندوستان کے دیہات میں بولے جاتے ہیں آکھنا پنجابی زبان میں کہنے اور دریافت کرنے کے معنی میں آج بھی آتا ہے۔ بادا ورائی کے معنی خدا جانے مولانا نے

ٹہرا بیٹھی" کیسے لکھ دیے کیونکہ مصرع خاک ہول جو باد اوڑائی میں باد اوڑائی کا ڈھول کے ساتھ ہے بعض ایسے ڈھول جیسے خاک اڑا سکے۔ بہرحال ان میں کوئی بھی ایسا محاورہ نہیں جو محاورات قدیم کی فہرست میں شامل کیا جا سکے تیسری وجہ مولانا نے مفصلہ ذیل دی ہے

(۳) اس میں شرکت کرنے کے بہت کم وجوہ ہیں کہ خالق باری حضرت امیر خسرو کی تصنیف ہے اور یہ شائبہ شک بھی خود خالق باری کے مقطع کو دیکھ کر بالکل رفع ہو جاتا ہے جس میں لفظ خسرو موجود ہے اور جس شاعرانہ خوبی و صفائی کے ساتھ یہ لفظ مقطع میں واقع ہوا ہے اور اس پر درویشانہ انکسار کا طرہ دیکھ کر ناممکن ہے کہ کوئی صحیح المذاق شخص اس کو تخلص نہ سمجھے اور صرف ایک لفظ بامعنی دیگر الفاظ بامعانی کے جن سے خالق باری بھری ہوئی ہے قرار دے۔ وہ شعر یہ ہے۔

مولوی صاحب سرن پناہ گدا بھکاری خسرو شاہ

اسکی ترکیب بالکل وہی ہے جیسے آج کوئی خسرو نام کا شخص اپنے تئیں کسی تحریر میں خاکسار خسرو لکھ کر ختم کلام کر دے۔

مولانا کا یہ استدلال زیادہ تر شاعرانہ رنگ میں ہے۔ اہل اللہ میں سے بہت سے لوگوں نے اپنی ذات اپنے نام سے پہلے یا بعد شاہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مثلاً شاہ نعمت اللہ ۸۲۵ھ شاہ میاں جی ۸۸۹ھ اور سید راجی حامد شاہ ۹۰۱ھ وغیرہ لیکن امیر خسرو کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ شاہ کا لفظ اپنے تخلص کے آخر میں لاکر سادات کے نام کے ساتھ خواہ مخواہ التباس پیدا کر دیتے اور نہ امیر کے زمانہ میں فقرا کے نام کے ساتھ اس لفظ کا رواج تھا لیکن اس شعر میں سب سے زیادہ توجہ طلب مصرع اول ہے جس میں مولوی صاحب کی ترکیب موجود ہے کہ مولوی صاحب منشی صاحب پنڈت صاحب کی سی ترکیبیں امیر خسرو کے عہد میں رائج نہیں تھیں۔ "مولوی صاحب" درکنار تنہا مولوی کا لفظ امیر کے عہد میں

علما کے ساتھ نہیں ملتا۔ ایسے مرکب محض گذشتہ صدی کی متبدعات سے ہیں اس لیے ہمیں اس شعر کو جدید اضافہ ماننے پڑے گا۔ اور بات بھی یہی ہے کیونکہ اگرچہ یہ شعر مطبوعہ نسخوں میں اسی طرح ملتا ہے مگر قلمی نسخوں میں اس کی شکل بالکل مختلف ہے جو حسب ذیل ہے۔

دہ جگ رہا خسرو کا نام　　خالق باری ہوئی تمام

ایک اور نسخہ یوں ہے:۔

دو جگ رہیا خسرو نام　　خالق باری ہوئی تمام

ان شعروں میں اگرچہ خسرو کا تخلص موجود ہے لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ خسرو ہی مشہور امیر خسرو ہیں خسرو اور لوگوں کا بھی تخلص ہو سکتا ہے اور میرا خیال ہے کہ ہم نے خالق باری کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے رکھی ہے تاریخ و ادب میں اس کا کہیں ذکر نہیں آتا۔ نہ امیر خسرو کی تصنیفات کے ساتھ اس کا شمار ہوتا اور نہ کوئی اسے جانتا ہے اور نہ اسکے قدیم نسخے دستیاب ہوئے ہیں جس قدر نسخے ملتے ہیں بارھویں اور تیرھویں قرن ہجری کے نوشتہ ہیں صرف ایک نسخہ ایسا ہے جو گیارہویں صدی سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ نسخہ برٹش میوزیم کی فہرست کتب فارسیہ میں "ذیل ۱۶ اب ۲" ہے جو طامس ہائڈ متوفی سنہ ۱۷۰۳ء مطابق سنہ ۱۱۱۴ھ کی ملک تھا فہرست نگار کا بیان ہے کہ کسی فرنگی نے سترھویں صدی عیسوی میں نقل کیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس نسخہ میں مصنف کا نام مذکور نہیں ہے۔ انڈیا آفس میں ایک نسخہ نمبر ۲۴۴۸، سنہ ۱۱ جلوس محمد شاہی مطابق ۲۸ ربیع الثانی سنہ ۱۱۴۲ھ کا کتابت شدہ ہے۔ لیکن اس کتب خانہ میں ایک اور نسخہ نمبر ۲۴۴۴ ہماری دلچسپی کے کچھ سامان رکھتا ہے۔ اسکی تاریخ کتابت معلوم نہیں ہوتی لیکن اس کا نام "مطبوع الصبیان" دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خالق باری کا اصلی نام مطبوع الصبیان ہے اس نسخہ

کے ساتھ نثر کا ایک دیباچہ بھی ہے۔ فہرست نگار نے اس کا ایک پارہ نقل کر دیا ہے وہو ہذا:۔

"الحمد للہ … (بداں) اسعدک اللہ تعالیٰ فی الدارین کہ چند کلمہ عربی و فارسی ہر ایک با ترجمہ ہندی برائے تعلیم صبیاں بطریق ریختہ (گفتہ آمد)"

بدقسمتی سے اس نسخہ میں بھی مصنف کا نام مرقوم نہیں اس رسالہ میں چھپن فصلیں ہیں اور ہر فصل میں چار شعر ہیں۔ اس حساب سے اس کے اشعار کی تعداد ۲۲۴ ہوتی ہے کتاب کا آغاز خالق باری سرجن ہار الخ سے ہوتا ہے۔ اب یہ فصلیں یا تو متناسب الفاظ ولغات یا بحور کے لحاظ سے قائم کی گئی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رائج الوقت خالق باری کا شیرازۂ اشعار بہت کچھ درہم برہم کر دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ اس کا دیباچہ اور نام قطعاً بھلا دیئے گئے۔ سب سے دلچسپ دیباچہ وہ پارہ ہے جس میں ریختہ کا لفظ موجود ہے ریختہ کے موجد اگرچہ امیر خسرو ہیں لیکن ان کے ہاں وہ موسیقی کی ایک اصطلاح ہے۔ اس دیباچہ میں ریختہ نظم کے معنوں میں آیا ہے اور یہ وہ معنی ہیں جو دکنی اور سراج کے ہاں ملتے ہیں۔ ریختہ بمعنی نظم گیارہویں صدی کے آخر میں ملتا ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ کتاب مطبوع الصبیان مع دیباچہ اسی قرن میں کسی وقت تصنیف ہوئی ہو گی۔

عالمگیر کے عہد میں اردو زبان کی طرف خاص توجہ کی جاتی ہے اور بچوں کے لیے یہی زبان ذریعہ تعلیم بن جاتی ہے۔ اور بارھویں اور تیرھویں صدی میں خالق باری کے انداز کی درجنوں کتابیں لکھی جاتی ہیں مثلاً رازق باری۔ حامد باری۔ ایزد باری۔ واحد باری۔ صمد باری۔ مالک باری۔ اللہ باری اور قادر نامۂ مرزا غالب وغیرہ جب اس قدر کتابیں دو صدی کے اندر اندر لکھی گئی ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ خالق باری بھی ان کے متصل زمانہ لکھی گئی ہو گی۔ یہ امر قرین قیاس نہیں کہ خالق باری ۷۲۵ھ سے قبل

لکھی گئی ہے۔ اس کے بعد پورے چار سو برس یعنی گیارہویں صدی تک اہل قلم خاموش رہے۔ اور بارہویں اور تیرہویں صدی میں اسکی تقلید میں درجنوں کتابیں لکھی جانی شروع ہوئیں۔ میرے نزدیک خالق باری اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے اور اس کا زمانہ ہمیں دیگر تصنیفات کے قریب ماننا چاہیئے۔

اگر خالق باری امیر خسرو کی تصنیف ہوتی تو صورتحال بالکل مختلف ہوتی اس عہد سے لیکر سینکڑوں کتابیں ابتک اس کی تقلید میں لکھی جاتی شارح اسکی شرحیں لکھتے ہیں اہل لغات اس سے استناد کرتے۔ اور یہ کتاب مختلف فیہ لغات کے لیے ایک سندی ماخذ بن جاتی۔ بہت کم لوگ واقف ہیں جس محنت اور مشکلات کے ماحول میں آٹھویں نویں اور دسویں قرن ہجری کے ہندی فرہنگ نگاروں نے اپنی کتب لغات ترتیب دی ہیں۔ وہ ادنیٰ ادنیٰ شرحوں سے لغات جمع کرتے ہیں کتابوں کے حواشی سے الفاظ لیتے ہیں۔ استادوں سے پوچھ رہے ہیں۔ خطوط و رقعات سے استناد کر رہے ہیں وغیرہ۔ اگر امیر خسرو اتنا بڑا مجموعۂ لغات اپنی یادگار چھوڑ جاتے جو کہا جاتا ہے کئی ہزار اشعار اور کئی جلدوں پر شامل تھا تو کیا یہ فرہنگ نگار جو ایک درجن سے زیادہ ہیں اس سے استفادہ نہ کرتے۔ یہ خیال کرنا کہ محض اتفاقیہ یہ کتاب ان کے ہاتھ نہ لگی بے حقیقت معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کتاب کو داخل نصاب مانا جاتا ہے اس لیے شروع ہی سے ان کی واقفیت اس سے ضروری تھی۔

مولانا محمد امین صاحب نے اس یقین کے اندر کہ خالق باری امیر خسرو کی تصنیف ہے شاعرانہ انداز میں دل کھول کر اسکی مدح سرائی کی ہے۔ بلکہ نصاب الصبیان سے ایک قسم کا مقابلہ کر کے خالق باری کی عظمت کو تسلیم کر لیا گیا اور غالباً مولانا نے یہ سب کچھ محض عقیدتاً کیا ہے۔ کیونکہ حقیقتاً اگر ان کو مقابلہ منظور ہوتا تو نصاب الصبیان کے بجائے عبدالواسع کے نصاب یا قادر نامۂ میرزا غالب سے مقابلہ کرتے۔ جو ہر

حال میں زیادہ موزوں ہوتا۔ امیر کی وقعت ہمارے دل میں بھی اسی قدر ہے جس قدر مولانا کے دل میں ہے۔ لیکن خالق باری کا معاملہ اور بات ہے۔ میں امیر کی طرف اس تالیف کا انتساب امیر کی ہتک سمجھتا ہوں۔ ہمیں اس کے نقائص پر بھی ذرا ایک نظر ڈال لینی چاہیئے۔

اس کتاب میں ہر قسم کی ترتیب کا التزام مفقود ہے۔ مضمون الفاظ اور وزن میں کوئی ترتیب ملحوظ نہیں۔ ہندی الفاظ کے صحیح تلفظ کی کوئی پروا نہیں کی گئی عربی فارسی اور ہندی الفاظ کے مرادفات التزاماً نہیں دیئے۔ کبھی فارسی ہندی دیئے۔ کبھی فارسی عربی پر قناعت کرلی۔ اور کبھی صرف ہندی الفاظ پر۔ پھر بھرتی کے الفاظ اس کثرت سے لائے گئے ہیں کہ الفاظ برائے بیت خالق باری کا دلچسپ پہلو بن گئے ہیں۔ مثلاً ؎

بادہ شراب در اوق وصہبا مے است و مد
گر جرعہ زاں خوری تو کنی کار نیک و بد

کا آخری مصرع تمام و کمال برائے بیت پھر وہی الفاظ بعض اوقات دوبارہ دوہرا دیئے ہیں ان کی مثالیں دینا باعث طوالت ہے ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ یہ کتاب نوعمر بچوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس لیے اسکی بحروں کا شگفتہ اور سبک ہونا ضروری تھا لیکن اس تصنیف کی اکثر بحریں غیر شگفتہ اور ناہموار ہیں۔ پھر اوزان کی غلطیاں بھی موجود ہیں۔ ایک مصرعہ بڑھ گیا۔ اور ایک گھٹ گیا۔ کوئی اوچھا اور کوئی لمبا ہوگیا۔ مثلاً ؎

زر پود سونا سیم جتیل نقرہ روپا جامہ کپڑ ٹاٹ پٹر ڈبہ کوپا

جو بظاہر رمل مسدس سالم ہے۔ لیکن مصرع اول کی ابتدا میں ایک سبب خفیف از وزن لایا گیا ہے۔ اور شعر ؎

عقرب بتازی بچھو کژدم برج فلک   بشمر تو سروش و فرشتہ ملک

میں اب معلوم ہوتا ہے کہ پہلا مصرع انگڑائی لے رہا ہے۔ اس کے وزن کی اگر تلاش کی جائے تو فارسی والے کہیں گے کہ کوئی ہندی وزن ہوگا اور ہندی والے کہیں گے کہ فارسی وزن ہوگا۔ آنے والے شعر ہیں۔

نوت فرسا داست کھیرا باد رنگ   جھنبکا آدنگ ہندی ڈھیل ہے رنگ

آدنگ کا گاف اور ڈھیل کی لام زائد از وزن ہیں۔

بعض مقامات پر دیکھا جاتا ہے کہ مصنف مختلف موقعوں پر ایک ہی لفظ کے دو مختلف معنی دے جاتا ہے۔ مثلاً ذیل کے دو شعر۔

عنقا بمرغ ہست لگ لگ ہے تیترا   ہم بارکش ریسماں ہے جھیڑا

طاؤس مور باشد و دراج تیترا   خوب دنگو بھلا و بد وزشت ہے برا

مصنف کے نزدیک تیترا کی فارسی لگ لگ بھی ہے اور دراج بھی۔ لیکن خود فارسی میں لگ لگ اور درّاج دو مختلف جانور ہیں۔ دراج بیشک تیتر ہے لیکن لگ لگ کو اہل لغات یوں بیان کرتے ہیں۔

"مرغے است مشہور کہ گردن و منقار پائے دراز دارد و مار را شکار کند"

حکیم سنائی فرماتے ہیں ؎

آں لگ لگ گوید کہ لک الحمد ولک الشکر   طو طعمۂ من کردہ آں مار ثریاں را

اب ایسی غلطی امیر خسرو سے نہایت بعید ہے۔ کسی دوسرے موقع پر خرما کے معنی ایک جگہ کھجور بتاتے ہیں اور دوسری جگہ املی۔ چنانچہ ؎

جاں خرما ہندوی املی   داں صمغ گوند گلیم اسپ کنبلی

ہندوی گوید خرما را کھجور   واگہ را تو فارسی میدان انگور

املی کو اگرچہ خرمائے ہندوی کہا جاتا ہے لیکن جس طرح سے مصنف نے بیان

کیا ہے بے حد مغالطہ خیز ہے۔ انگور کا تلفظ جس طرح شعر دوم میں کیا گیا ہے وہ ہمیں پنجاب کی یاد دلاتا ہے۔ انگور کا یہ تلفظ امیر سے بعید ہے۔ بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ بچوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ شعر آیند میں مصنف سے ایک اور لغزش مشاہدہ ہوتی ہے۔

فارسی سیمرغ و عنقا ہست تدرو کبک ہنس
ہمچو پرقاں است کانور ہے زرپرد لنسل بنس

اس شعر میں تدرو، کبک اور ہنس تین مختلف پرندوں کو مصنف نے ایک مان لیا ہے۔ کبک کسی تشریح کا محتاج نہیں۔ اس کو ہم چکور کہتے ہیں۔ ع

کبک کو ہندی میں کہتے ہیں چکور

مرزا غالب قاطع برہان میں کہتے ہیں "تدرو در فارسی طائرے را گویند کہ بزبر ہندی آنست" اور فرہنگ نویس کہتے ہیں کہ "مرغیست صحرائی شبیہ بخروس در نہایت خوش روشنی و خوش رفتاری" لیکن ہمارے لیے سب سے اہم یہ امر ہے کہ خود امیر خسرو کبک اور تدرو کو علی الرغم مصنف خالق باری علیحدہ علیحدہ پرندے تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ قران السعدین۔

انکہ پرندے زپر خود تدرو ماندہ چو پر گم شدگاں زیر سرو
لالہ چو از کوہ برفت از شکوہ کبک ببرید دل از زیغ کوہ

(صفحہ ۲۶ طبع حسن رضوی)

قران السعدین میں شعر اسی ترتیب سے بلا فاصلہ ملتے ہیں جس سے اس احتمال میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ امیر کے نزدیک کبک اور تدرو مختلف جانور ہیں۔ اس لیے خالق باری کا مصنف اور امیر خسرو ایک شخص نہیں ہیں۔ لیکن صاحب خالق باری نے تدرو اور کبک کو ایک جانور کیوں تسلیم کیا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ خود بعض اہل لغات اس غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ مثلاً موید الفضلا میں تدرو کی تشریح ......

ہیں ہم یہ عبارت پڑھتے ہیں:۔

"تدرو بفتحتین کبک و آں پرندہ ایست آتش خوار و خوش رفتار کہ بکوہہا بود کذا فی الات الفضلا"

اداۃ الفضلا۔ قاضی بدرالدین محمد دہلوی نے ۸۲۲ھ میں تالیف کی ہے، اب ظاہر ہے کہ خالق باری نے اپنی کتاب کی تالیف کے وقت اداۃ الفضلا موید الفضلا ۹۲۵ھ یا کسی اور ایسی کتاب لغات سے امداد لی ہے جس کے ماخذ میں یہ کتابیں شامل ہیں۔

بیت ذیل بھی قابل توجہ ہے ؎

نیا خال ہندوی ماموں جاں اور عم کہیئے چچا بکھان

نیا کے معتبر معنی دادا یا نانا کے ہیں۔ چنانچہ لغت فرس، فرہنگ جہانگیری، رشیدی چراغ ہدایت اور آنند راج میں صرف یہی معنی دیئے ہیں۔ اور فردوسی علی العموم انہی معنوں میں نانا ہے۔ مثال:۔

درو گر زمانست و ماچوں گیا ہمانش نبیرہ ہمانش نیا

مصنف خالق باری نہایت مشہور اور مستند معنی کو صرف نظر کر کے غیر معروف بلکہ مشتبہ معنی "ماموں" دیتا ہے۔ اس کی وجہ وہی ہے جو اوپر نقل ہو چکی ہے یعنی اداۃ الفضلا موید الفضلا وغیرہ لغات سے نقل کر رہا ہوں۔ چنانچہ موید الفضلا میں اس لغت کے لیے لکھا ہے "جد و برادر و برادر بزرگ" لیکن یہ یاد رہے کہ آخری دونوں معنی کے لیے ہمارے پاس کوئی معتبر سند نہیں ہے اور غالباً ایسے معنی ہیں جو ہندوستان میں بعض غلط فہمیوں کی بنا پر پیدا ہو گئے۔

خالق باری جیسی کتاب کی تصنیف مکتب لغات کی امداد کے بغیر دشوار ہے لیکن جو لغات مصنف کے پیش نظر ہیں ایسی ہیں جو مغلوں کے عہد سے پیشتر ہندوستان میں لکھی گئی ہیں کیونکہ جو لغزشیں ان کتابوں میں موجود ہیں ان کا

عکس خالق باری میں بھی مشاہدہ ہوتا ہے اسلیے ضروری ہے کہ خالق باری ان کتب لغات کے بعد لکھی گئی ہو۔ موئید الفضلا ۹۲۵ھ میں کہا جاتا ہے تصنیف ہوتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ظاہر ہے کہ خالق باری اس کتاب کی تصنیف کے بعد تالیف ہوئی ہوگی۔

خالق باری کو موئید سے موخر بنانے کے لیے ایک اور بھی دلیل ہے جو یہ ہے کہ موئید الفضلا میں بعض اوقات فارسی الفاظ کے ہندوی مرادفات بھی دیئے گئے ہیں جب ان ہندوی الفاظ کا خالق باری کے ہندی الفاظ سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو موئید کا تقدم خالق باری پر صریحاً ظاہر ہو جاتا ہے اور ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ موئید کی زبان خالق باری کی زبان سے زیادہ قدیم ہے۔ میں یہاں چند الفاظ کی فہرست مقابلہ کی غرض سے ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

موئید الفضلا	حربا	کھرکت	داس	ہنسوا	چار مغز	اکروت
خالق باری	حربا	گرگٹ	داس	دانتی	جوز خراساں	اخروٹ
موئید الفضلا	جوز بوا۔ جاپھل بوئے			گندہ	خیار	ککھری
خالق باری	جوز بویا۔ جائے پھل بوے			باس	خیار	ککڑی
موئید الفضلا	انگوزہ۔ ہینگ		دبہ	کوبہ	خرس	بھال
خالق باری	"	ہنگ	"	کوبا	خرس	ریچھ
موئید الفضلا	خنوز	کوٹھی	دوغ	چھاچھ	اسمانہ	چھتر
خالق باری	کندو	کوٹھا	دوغ	مہی	سقف	چھت
موئید الفضلا	فازہ	جنوائی				
خالق باری	فازہ	جمائی				

لیکن خالق باری کی زبان کے مقابلے کے لیے میرے نزدیک سب سے مناسب

کتاب نصاب زبان یا صمد باری عبدالواسع ہانسوی کی ہے۔ عبدالواسع عہد عالمگیر کے ایک بزرگ مانے جاتے ہیں۔ ان کی کتاب دستور العمل معروف بہ رسالہ عبدالواسع نہایت مشہور رہی ہے اور اب بھی درس میں داخل ہے۔ نصاب زبان ایک نہایت دلچسپ کتاب ہے۔ اس میں التزاماً ہر مصرع میں تین تین لفظ عربی۔ فارسی اور ہندی کے بالترتیب یکے بعد دیگرے دیئے گئے ہیں۔ ساتھ ہی سب الفاظ کو علیحدہ علیحدہ عنوان کے نیچے بیان کر دیا گیا ہے۔ مثلاً لغات اعضائے انسان۔ اجناس غلہ۔ میوہ جات۔ ترکاریاں دگلہا۔ ادویات وغیرہ غائنہ میں مصادر مشہور وغیرہ مشہور دے دیئے ہیں۔ اب خالق باری اور نصاب کی زبان میں بہت کم فرق دیکھا جاتا ہے اکثر الفاظ دونوں میں عام ہیں۔ لیکن چونکہ عبدالواسع ہانسی کے متوطن ہیں جہاں ہریانی زبان کی اشاعت ہے۔ غالباً اس میں عبدالواسع بعض ایسے الفاظ (اگرچہ ہندی ہیں) دیئے جاتے ہیں جن سے موجودہ لوگ واقف نہیں۔ ذیل میں خالق باری اور نصاب کے مابہ الامتیازہ الفاظ کی ایک فہرست دی جاتی ہے۔

خالق باری غازہ جمالی تب جوڑی راسو نیول
نصاب زبان " جمہائی تپ جڑ راسو نیولا
خالق باری دد بارہ لونکڑی شیر مینہ امید آسی
نصاب زبان روباہ لونبڑی شیر باگھہ " آسا
خالق باری نیا ماموں مردمک پوتلی لب ہونٹھ
نصاب زبان نیا دادا مردمک پتری لب ادھر
خالق باری گوش کان رخسار گال انگشت اونگلی
نصاب زبان گوش سرون رخسار کپول انگست انگری
خالق باری پائے پانوں مادر ماں پیشانی کپار

نصاب زبان پا ئے چمن مادر مہتاری پیشانی ماتھا
خالق باری چشم نین پہلو پانسلی
نصاب زبان چشم لوچن پہلو پانسلی

دونوں کتابوں کی زبان پر غور کرنے سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ خالق باری نصاب سے چنداں مقدم نہیں ہے۔

آخر میں ایک اور امر کی طرف بھی توجہ دلائی جاتی ہے کہ موجودہ خالق باری کا متن جس میں علی گڑھ کے نیز بازاری اڈیشن شامل ہیں۔ چنداں قابل اعتبار نہیں معلوم ہوتا ہے مولوی محمد امین صاحب چڑیا کوٹی نے اگرچہ نہایت جانفشانی سے اپنا نسخہ مرتب کیا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے انھوں نے زیادہ تر مطبوعہ نسخوں پر اعتبار کیا ہے اور قلمی نسخوں کی طرف توجہ نہیں کی۔ اس لیے ان کا نسخہ اگرچہ بازاری نسخوں کے مقابلہ میں بہتر مانا جاسکتا ہے تاہم مستند نہیں ہے کیونکہ بمرورِ زمانہ مطبوعہ نسخوں میں بہت کچھ ترمیم و تنسیخ اور حک و اصلاح ہوگئی ہے۔ خالق باری کی قدیم ترتیب اور اشعار کی تنظیم بالکل برباد کر دی گئی ہے۔ اور رفتہ رفتہ بعض اغلاط بلکہ یوں کہیئے مصنوعی لغات اس میں شامل ہو گئے ہیں۔ میں یہاں صرف چند مثالوں پر قناعت کرتا ہوں۔

علی گڑھ اور بازار کے نسخوں میں ایک مصرعہ۔

"تابہ گز کاں است کڑاہی دتوا"

آتا ہے جس میں "گز کاں" نے مثنوی لغت کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ گز کاں اس صورت میں آنند راج۔ برہان۔ نفائس۔ رشیدی اور جہانگیری میں نہیں ملتا۔ قازقان قزقان اور قزغان بمعنی "دیگ بزرگ مسین" ملتا ہے۔ یہ ترکی زبان کا لفظ ہے امیر خسرو فرماتے ہیں سہ

ولے باا ینہمہ زیں خواں مستہ و ستم کہ حلوائے رضا پختہ نگردد در اندریں قزغاں

قلمی نسخوں کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے مصرع بالا میں "گرز خاں" دراصل لکھا تھا۔ اسی طرح مصرع

ہندوی کھانڈا کہاوسے اُن میں (یا آن من) میغ

میں اُن من "یا آن من" ایک حیرت میں ڈالنے والا لغت بن گیا ہے مولوی محمد امین صاحب بھی اس لفظ کی تشریح سے عاجز ہیں اور تجویز کرتے ہیں: قیاس یہ چاہتا ہے کہ یہ لفظ "انمڑ" ہے۔ اس صورت میں وزن عروضی درست ہو جاتا ہے لیکن اسکے معنی جو مولوی صاحب "بادل کا گھر آنا" بیان کرتے ہیں۔ چنداں چسپاں نہیں مگر قلمی نسخوں میں یہ مصرعہ یوں ہے۔ ع

ہندوی کہانڈا کھاوے ابر میغ

اب وہ تمام گنجلک رفع ہو جاتی ہے۔ ایک مصرع۔

"ہم قرنفل لونگ را کیکر بخواں

میں کیکر پنجابی لفظ بتایا گیا ہے۔ چنانچہ تمام نسخوں میں اس کو پنجابی میں لکھا گیا ہے لیکن سب سے زیادہ حیرت خیز یہ امر ہے کہ اہل پنجاب اس لفظ سے اپنی لاعلمی ظاہر کرتے ہیں۔ قلمی نسخوں میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصرع مذکور دراصل یوں ہے ع۔

"ہم قرنفل لوگ را نیکو بداں"

اس سے ظاہر ہے کہ کیکر محض اتفاقیہ ایک مصنوعی لغت بن گیا ہے اور کوئی تعجب نہیں۔ اگر لفظ نیکو، ترقی معکوس کرتا ہوا کیکر بن گیا ہو۔

شیخ شرف الدین احمد یحیٰی منیری

ہندوستان کے مشاہیر اولیا سے ہیں ابتدا میں سلطان المشائخ نظام الدین اولیاؒ کے مرید ہونے کی نیت سے ۷۲۵ھ میں دہلی آئے اس وقت تک ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ آخر دہلی ہی میں شیخ نجیب الدین فردوسی کے مرید ہو گئے۔ بہار جا کر مدتوں کوہ راجگیر میں ریاضت و عبادت میں مشغول رہے۔ ۷۸۲ھ میں وفات پائی اور میر اشرف جہانگیر سمنانی نے نماز جنازہ پڑھائی تصنیفات کے سلسلہ میں آپکے ملفوظات و مکتوبات موسوم بہ معدن المعانی کتاب ارشاد السالکین اور شرح آداب المریدین مشہور ہیں "شرف نامہ احمد منیری" ابراہیم بن قوام فاروقی نے آپ ہی کے نام پر سلطان بارَبک شاہ ۸۶۴ھ و ۸۷۹ھ والی بنگالہ کے عہد میں لکھا ہے۔ شیخ شرف الدین بھاشا میں بھی شاعری کرتے تھے۔ اور شرفؔ آپ کا تخلص تھا۔ ذیل میں آپ کا ایک "گنج منذرہ" جو انواع اقسام کے لیے مفید بتایا جاتا ہے نقل کرتا ہوں۔ ان کے دو دوہرے اسکے گنج منذرہ میں بھی موجود ہیں۔

علاوہ ازیں گنج منذرہ اسی عہد کی اردو کا بھی ایک اچھا خاصا نمونہ ہے۔

گنج منذرہ از شاہ شرف الدین یحیٰی منیری بر جمیع امراض کہ دریں ذکر می شود مجرب است از حلق خشک جھاڑ آکندر۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللّٰھم صلِّ علیٰ سیدنا محمدٍ و آلِ محمدٍ صاحب التاج والمعراج والبراق اسمہٗ جسمہٗ مطہراً منوراً مولیٰ الثقلین صاحب العلم والحلم دافع البلاء والوباء ابوالقاسم محمد بن عبداللہ صاحب العرب والعجم

یا ایہا المشتاقون الذین آمنو بنور جمالہ صلوا علیہ و آلہ و سلمو تسلیماً کثیراً کثیرا برحمتک یا ارحم الراحمین۔ بسم اللہ شافی بسم اللہ المعانی بسم اللہ الکافی بسم اللہ خیر الاسماء بسم اللہ الذی لا یضر مع اسمہ شئی فی الارض و لا فی السماء وھو السمیع العلیم۔

اونکار اارشا کرتا ببدن ہرتا وہا ایک سرجن ہادو جگ بین تلوک چار بید پانچ پند چھ ناسک سات سمندر آٹھ بس نوگرہ دس رادن اگیارہ دوبارہ راس تیرہ تھول چودہ بھون پندرہ تتھ سولہ ک لاچار کہاں چار ہاں پانچ بھوت لات نون نولے تاتہ چوادسی سید داہا چوستر جوگی اشت کوڑی اناک تی تیس کوٹری دیوتا چوراسی تکن سرجیو جنت اکاس پاتال مرت متدل زات دن بھر کہر ہی۔۔ وتدہی وندھلا پیلا، جوک مہورت میں بہیں سنالگی دہرت ہوں جو کچھ فلاسلے کے پتڈ پران میں ہوئی راہ سخاباتکا۔ کوے کا پوکہر کا اندھیاری کا اجیالی کا جوت پھیت کا کنے کا کرائے کا بھیجے کا بہجائے کالا نکھے کا انکھیں کا دیوانی بھوت پیت لاکہن بھوکس دکن سکھن کچن چوربل میل ملات جان بھوان دمہ توتہ تپ بجاری جاڑ اچو تری اکھوری مجکوزتی کہ تھنسلا مردت آدی نلہکی کرکری آدھاسیسی آدی برسیسی نہر داد ھر داکل سواکچھ دی پلہی اٹھارہ کوڑہ اٹھارہ پڑمیو ہوک سوک جلندر کتن دہر دلیس پیس کوڑہ۔ کتست الون لوہو بلغم پی چش مرگی کبھی گلستی ہیرکی باد کولا سرخ باد سبز باد سیاہ باد زرد بان ہفتا۔ دو دباو سرباد سے کہ باشد درد جود فلاں جن انگارد ہس ہے دوہائی سلیمان بن داؤد پیغمبر کی جل بھسمنت ہو بیک بلا جائے تاثر سوا لاکھ پیغمبر کا بجر ٹھاپ نوے تاتہ چوسا سی سید بہا کا سر

اپ جی جی تی تی مرنت دہا کی شاہ شرف الدین احمد یحییٰ منیری کی بحق کھیتس رحمتی و بحق لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفواً احد و تنزل من القرآن ما ھو شفاءٌ و رحمۃ للمومنین ولا یزید الظالمین الا خسارا۔

کالا ہنا ز ملا بسے سمندر تیر
پنکر پارے بکہرے زِل کرے سر پیر (دردبہے زہر پیر)
بحق لا الہ اللہ محمد الرسول اللہ ایں وہ سہرہ راسہ بار نخواند
شرف صرف مائل کہیں درد کچھو نہ بسائے
گرد چھوئیں دربار کی سو درد دور ہو جائے

(از بیاض مملوکہ۔ مولوی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر پیسہ اخبار)

شاہ کبیر یا کبیر داس

یہ ذات کے جلاہے اور بنارس کے رہنے والے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان کی وفات پر مسلمانوں نے انھیں رسوم اسلام کے مطابق دفن کرنا چاہا۔ اور ہندوؤں نے اپنے مذہبی طریق پر جلانا چاہا۔ اس سے کم از دونوں قوموں میں ان کی ہردلعزیزی مسلم ہے صاحب دبستان نے جو حالات دیئے ہیں وہ زیادہ تر ہندی ذرائع سے ماخوذ ہیں۔ ان میں انھیں رامانند کا چیلہ بتایا گیا ہے۔ ہندی نورتن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی۔ لڑکے کا نام کمال اور لڑکی کا نام کمالی تھا کبیر کے کلام میں قدم قدم پر مسلمانی اثر نمایاں ہے۔ اگرچہ اس کا کلام کبیر پنتھوں اور ہندوؤں کی بزاولت میں رہنے سے بہت کچھ مسخ ہو گیا ہے اور اکثر

غیر کبیری کلام اس میں شامل کر دیا گیا ہے۔ تاہم مسلمانوں صوفیوں اور کبیر کے کلام میں بہت کم فرق دیکھا جاتا ہے۔ اکثر امور میں وہ صوفیوں کا ہم آواز ہے عشق الٰہی۔ ذکر فنائیت محویت۔ ہیرانی۔ ترک و تجرید۔ موت کی یاد۔ دنیا کی بے ثباتی۔ ہمہ اوست جو صوفیہ کے ممتاز مضامین ہیں۔ کبیر کے ہاں عام ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ اس کے اکثر اشعار ہمیں مسلمان شعرا کی یاد دلاتے ہیں۔ حافظ شیرازی کہتے ہیں ع

ہر کسے نوبت پنج روزہ نوبت اوست

کبیر کہتے ہیں۔ ع

کبیر نوبت آپنی دن دس لیہو بجائے

فردوسی کا شعر ہے ؎

چہ بندی تو دل بر سرائے فسوس　　　کہ ہر ماں ہمیں آید آوائے کوس

کبیر کہتے ہیں ؎

کبیر سر پر سرائے ہے کیا سوئے سکھ چین　　　سو انس نگارا کوچ کا باجت ہے دن رین

ابو الفرج کہتا ہے ؎

ہر کس بقدر خویش گرفتار محنت است　　　کس را نداد وہ برات مسلّمی

کبیر کا قول ہے ؎

راجا دکھیا پرجا دکھیا جوگی کا دکھ دیناری　　　کہے کبیر سنو بھائی سادھو کوئی مندر نہیں نا رکھا

مولانا روم ؎

چشم بند و لب بہ بند و گوش بند　　　گر نہ بینی سر حق بر من بہ خند

اور کبیر ؎

دیکھ رہی دیکھ تجھ میں تیرا دھنی دم کو روک دیدار پائیے
دم کو روک اور مول کو بند کر چاند سورج گھر ایک آوے

کبیر کا یہ شعر ہمیں عمر خیام کی یاد دلاتا ہے ؎

ماٹی کہے کمار کوں تو کیا روندے موہی اک دن ایسا ہوویگا میں روندونگی توہی

کبیر کی زبان اردو سے بہت ملتی جلتی ہے۔ دس فیصدی سے زیادہ اسکے ہاں فارسی الفاظ محاورے جو اردو کے ذریعہ عام میں رائج تھے اس کے ہاں موجود ہیں مثلاً نوبت زدن فارسی محاورہ ہے کبیر نے اس کا ترجمہ نوبت بجانا کرلیا۔ اسی طرح "تیشہ بر پا زدن و خوردن" فارسی کا ایک اور محاورہ ہے۔ کبیر اس کا بھی استعمال کرتا ہے۔ چنانچہ ؎

دیں گنوایو سنگ نی دنی نہ چالی ساتھ پانو کلہاڑی مایا مورکھ اپنے ہاتھ

فارسی کی ضرب المثل ہے :-

کز نگی بشستن نگردد سفید

کبیر اپنے انداز میں یوں لکھتا ہے :-

کویلا ہوے نہ اوجرو نو من صابن لائے

ان چند امثال سے جو میں نے یہاں دکھائی ہیں۔ ظاہر ہوتا ہے کہ کبیر اپنے تخیل جذبات اور مقولات میں بہت کچھ مسلمانوں کے زیر اثر ہے اور یہ کہ اس کی تربیت مسلمانوں میں ہوئی ہے لیکن جس طرح حضرت عیسٰی نے یورپ پہونچ کر یورپی خط و خال پیدا کر لیے ہیں اسی طرح کبیر کے کلام نے ہندوؤں کی صحبت میں رہ کر ہندوانہ شکل اختیار کر لی ہے۔ کبیر کے معتقدین نے یہی نہیں کیا ہے بلکہ ایک قدم اور بلند پروازی کی ہے یعنی کبیر کے نام پہ ایسے ابیات اور نظمیں شائع کی ہیں جو اسلام پر حملہ ہیں مثلاً یہ شعر کبیر کے نام پر شہرت رکھتا ہے ؎

کانکر پاتھر جوڑ کے مسجد لینی بنائے تا چڑھ ملا بانگ دے بہرا ہوا خدائے

کیا یہ سمجھا جائے کہ کبیر جو مسلمان اور مسلمان زادہ تھا اور مسلمان گھر کا پرورش یافتہ اذان

جیسے معمولی رکن اسلامی کی غایت اصلی سے ناواقف محض تھا ۔ مسلمانوں کا بچہ بچہ تک جانتا ہے کہ اذان کا مقصد اعلان نماز ہے تاکہ نمازی بروقت جمع ہو جائیں نعوذ باللہ یہ مقصد نہیں کہ خدا بہرا ہے ۔ اسی طرح ایک اور شعر ہے سے

مسلمانوں کے پیرا ولیا مرگی مرگا کھائی
خالا کی ری بیٹھی بیاہیں گھوہی میں کر یں سگائی

اس شعر میں پہلا اعتراض مرغا مرغی کے ذبیحہ پر ہے ۔ دوسرا اعتراض خالہ کی بیٹی بیاہنے پر یہ اعتراض محض ہندو نقطۂ نظر سے ہے اور ہر وہ شخص جس نے مسلمانوں میں پرورش پائی ہے اس کو لغو سمجھے گا ۔ کبیر ایک صاحب ترک و تجرید شخص ہے ۔ اس کے مسلک کو ایسے فریقی مسائل سے کوئی لگاؤ نہیں ۔

کبیر اپنی اصلی نظموں میں اپنے آپ کو مسلمان جلاہا کہتا ہے ۔ وہ اپنی ایک نظم میں بار بار اپنے آپ کو مسلمان جلاہا کہتا ہے جس کا پہلا مصرع یوں شروع ہوتا ہے ،

"مسلمان جولاہہ ایک"

دوسرا مصرع مجھ کو یاد نہیں رہا ۔

کبیر کا بارہ ماسہ راقم کے پاس موجود ہے جو انھوں نے اپنے مرید سید مراد کی فرمائش پر لکھا ہے ۔ اس میں سمت تصنیف سنہ ۱۱۳ دیا ہے جو غالباً ہجری اور سمت ہے ۔ میں اس کا ابتدائی بند یہاں نقل کر دیتا ہوں ۔

گئی بسنت اب آیو بودھاپا بناپیو کچھو پو ترناپا سبھی مس میں کھیل گنوائی پیہ کی نہا نیک نہیں پائی
سانٹھ برکھ میں جات بجانی کھور کی بجن نیک نہیں ٹانی چھن چھن دیہہ بھی اب چھیا پیچ کمرنا کچھ پر نہ لکھیاں
سب جوبن اکارتھ کھویو یہ ہی نام کبیر اندلیو تجھلا سید مراد سیانا جن کچھو ربجن سانتھ گرمانا
موسیو کہی مود بڑا سا کہو یو مو کوں بارہ ماسہ مانس مانس میں جی دکھیا ئے جگ کون ان آئے سنائے
ہم ہی سمت ہے کھیو گیارہ سے اور تیس بارہ ماس میں کہوں پنڈت دیو اسیس ۔

صاحب مخزن الاصفیا (صد ۴۴۶) کبیر کے متعلق لکھتے ہیں۔

"مرید و خلیفۂ شیخ تقی است از اولیا و مشاہیر عہد خود است و جمال ولایت را در طریق ولایت مستور داشتے و در موحدان وقت خود ممتاز بود او را در زبان ہندی کلام بسیار عالی است کہ بر علو درجات او دال است و اگر در کلام او تفحص و تجسس کردہ آید نوعے از قسم وصال یافتہ می شود فراق را در ساحت وملت او را اصلا عبور نیست و اول کسے کہ بزبان ہندی حقائق و معارف بیان فرمودہ اوست و انواع اشعار ہندی دارد لیکن اکثرے از جنس بشن پد و ساکھی از روئے منقول است و اگر بنظر انصاف ببینی جواہر دقائق ولالی حقائق بمیزان سنجیدہ است کہ مثل آں در کلام دیگرے یافتہ نمی شود ... ۔ از قوت باطنی او آنکہ اہل اسلام و ہنود ۔ ہر دو فریق بر او اعتقاد کامل دارند و از خود شمارند۔ چنانچہ در اہل اسلام بہ پیر کبیر و در ہنود بہ بھگت کبیر اشتہار دارد۔"

شیخ عبدالحق اپنے دادا شیخ سعد اللہ متوفی ۹۲۸ھ کی رائے کبیر کے متعلق ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"نمی میفرمودند روزے از ایشاں پرسیدم این کبیر مشہور کہ بشن پد ہائے وے میخوانند مسلمان بود یا کافر؟ فرمودند موحد بود۔ عذر کردم کہ موحد مگر غیر کافر مسلمان است؟ فرمودند فہم ایں معنی دشوار است خواہید فہمید۔"

(الاخبار الاخیار صد ۳۴۳)

کبیر کے زمانۂ وفات کے متعلق بہت کچھ اختلاف ہے۔ اکثر مصنفین ان کو سلطان سکندر لودھی کے عہد میں ملتے ہیں۔ مثلاً ابوالفضل اور صاحب دبستان المذاہب اس طرح ان کی وفات دسویں صدی ہجری کے پہلے ربع میں ہونی چاہیئے۔ لیکن سرکاری

آرکیولوجیکل رپورٹ اثریات قدیمہ و مخطوطات صوبہ شمال و مغربی و اودھ صہ ۲۲۴
میں لکھتا ہے کہ بجلی خاں نے کبیر کا روضہ موضع مگہر ضلع بستی میں (جہاں کبیر وفات پاتے ہیں سنہ ۱۴۵۰ء تیار کرایا (جو بحساب سنہ ۸۵۴ھ کے مطابق ہے) اور سنہ ۱۰۲۷ھ میں فدائی خاں نے بعہد اکبر اس روضہ کی مرمت کرائی۔ شاہ کبیر کی یادگار میں ایک مسجد شہر جونپور میں بابا بھیک نے سنہ ۹۹۱ھ میں تعمیر کی ہے۔ کبیر کی اوقاف کے لیے دو گاؤں شاہی زمانہ سے معافی چلے آتے ہیں۔ ایک گاؤں مسلمانوں کے قبضہ میں ہے اور دوسرا ہندوؤں کے قبضہ میں۔ کبیر کے مزار کے برابر ہندوؤں نے کبیر کی سمادھ بنا رکھی ہے۔ سمادھ میں ایک سادھو رہتا ہے اور مزار پر مسلمان مجاور ہے۔

کبیر کی تحریک ان اثرات کی آواز بازگشت ہے جو اسلام کی موجودگی سے ہندوستان میں بروئے کار آئے ہیں۔ کبیر کی آواز توحید کی نشر و اشاعت اور بت پرستی کی بیخ کنی میں نہایت مفید ثابت ہوئی ہے۔ اور ہندوستان کے ایسے مذاہب پر جو اس کے بعد وجود میں آئے ہیں اس کا اثر نہایت گہرا ہے۔ مثلاً کبیر پنتھیوں کا وہ پیشوا مانا جاتا ہے دادو پنتھیوں۔ ستنامیوں اور نانک پنتھیوں پر بھی کبیر کا پرتو نمایاں ہے۔ مسٹر بوس کا بیان ہے کہ کبیر نے ہندوستان کی بارہ تیرہ مذہبی تحریکات پر اثر ڈالا ہے۔

ملحاظ شاعری اس کا پایہ بہت بلند ہے۔ ہندی زبان کا در حقیقت پہلا بڑا شاعر ہے۔ اس کا کلام سادگی۔ تاثیر۔ صفائی۔ جدت۔ معنی آفرینی۔ سوز و گداز اور شیرینی ادا کے اوصاف سے آراستہ ہے۔ کبیر کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ دقیق سے دقیق خیال کو چند معمولی الفاظ میں ادا کر سکتا ہے جس کو خواندہ و جاہل اور عامی و عالم سب سمجھ سکتے ہیں۔ اور اسی کمال کی بدولت اس کو دائمی شہرت کا تاج مل گیا ہے تلسی داس اور سور داس اگرچہ کبیر سے بہت بعد گذرے ہیں۔ لیکن ان کا کلام اس قدر دقیق اور عالمانہ ہے کہ ہم اس کا اکثر حصہ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ لیکن کبیر کے ہاں

یہ دقت محسوس نہیں ہوتی اگرچہ اس کا وطن بنارس ہے لیکن اس نے وہ زبان استعمال کی ہے جو اس زمانہ میں عوام الناس کی زبان تھی۔ اسی لیے اس کا کلام اردو کے اس قدر قریب ہے کہ آج بھی اس کا سمجھنا دشوار نہیں۔ کبیر کی تصنیفات سے بعض ریختہ بھی مشہور ہیں۔ اسی طرح اس نے فارسی بحروں میں بھی لکھا ہے اور دیکھا جاتا ہے بعض موقعوں پر اس نے ردیف و قافیہ کی بھی پابندی کی ہے میں یہاں دو مثالیں درج کرتا ہوں:۔

خلق سب بن کا سپنا سمجھ من کوئی نہیں اپنا
کٹھن یہ موہ کی دھارا بہا سب جات سنسارا

گھڑا جو نیر کا پھوٹا پتا جو ڈار سے ٹوٹا
آس نرجات جند گانی ابھوں لگا بھی پانی

بھولو مت دیکھ تن گورا جگت میں جیونا تھوڑا
تجو بدلو یہ چترائی رہو نہنگ جاگے باتھمی

تمس جب پران جاویگے کوئی نہیں کام آویگے
جس پہ لیو ارت وار اسی دن ہوینگے نیارا

آس نرجاں یہ دیہا لگا لے نام سے نیہا
کٹے جسم جال کی پھانسی کہے کبیر ابی ناسی

(کبیر بچناولی صہ ۱۸۳)

دیگر ؎

سنتا نہیں دھن کی خبر ان حد باجا باجتا
رحمند رحمند رگا جتا باہر سنے تو کیا ہوا

کا بجا افیم و پوستا بھنگ اور شرابیں پیوتا
اک پریم رس چاکھا نہیں امی ہوا تو کیا ہوا

کاسی گیا اور دوار کا تیرتھ سکل بھرمت پھرے
گانٹھی نہ کھولی کپٹ کی تیرتھ گیا تو کیا ہوا

پوتھی کتابیں باچتا اوروں کو نت سمجھا دتا
ترکوٹی محل کھوجے نہیں بک بک مرا تو کیا ہوا

قاضی کتابیں کھوجتا کرتا نصیحت اور کو
محرم نہیں اس حال سے قاضی ہوا تو کیا ہوا

شطرنج چوپڑ گنجفہ اک مزد ہے بدرنگ کی
بازی نہ لائی پریم کی کھیلا جوا تو کیا ہوا

جوگی و جنگم سے بڑا کپڑا رنگے رنگ لال سے
واقف نہیں اس رنگ سے کپڑا رنگا تو کیا ہوا

مندر مسجد کے راوٹی گل چمن میں رہتے سدا
کہے کبیرا میں نہیں گھٹ گھٹ میں صاحب دم رہا

(کبیر بچناولی)

یہ نظمیں اچھی خاصی اردو کہلائی جانے کی مستحق ہیں لیکن مجھ کو شبہ ہوتا ہے کہ وہ کبیر کی نہ ہوں۔ اور بعد میں کبیر کی طرف منسوب کردی گئی ہوں۔ بات یہ ہے کہ ہندی ادبیات میں باہم ہر قسم کی ابتری اور آشوب سے ملاقی ہوتے ہیں قدما کے حالات اور ان کے سنین حیات و ممات سے ہندی ادیب اکثر بے خبر ہیں۔ اسی طرح اساتذہ کے اصلی کلام کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ اب اسی کبیر کی طرف اسّی پچاسی تالیفات منسوب ہیں خدا جانے ان میں کتنی کبیر کی ہیں اور کتنی الحاقی۔ اسی طرح اپنے ادبی ذوق کی قدامت کرنے کی دھن میں وہ ہر دستاویز کو پرتھی راج اور اس کے جانشینوں کے عہد کی ماننے کے لیے تیار ہیں۔

میرا خیال ہے کہ کبیر کے بعد بھی کبیر کے نام پر برابر نظمیں لکھی جاتی رہی ہیں کیونکہ نظموں میں ایسی اشیاء اور چیزوں کا ذکر آتا ہے جو کبیر کے عہد میں رائج نہ تھیں مثلاً بندوق۔ تمباکو اور دوربین۔ بندوق اگرچہ دکن میں پہلے سے رائج تھی۔ لیکن ہندوستان میں بابر کے عہد تک بھی بہت کم معلوم تھی اور عام استعمال میں ہرگز ہرگز نہ تھی۔ تمباکو ہندوستان میں اکبر کے عہد میں آئی ہے اور دوربین تو گزشتہ صدی میں یورپ لائے ہیں ان کی مثالیں ذیل میں عرض کرتا ہوں ؎

تیر تپک سے جو لڑے سو تو سو بھو ~
بابا تیج بھکتی کرے سو رکھائے سوے (کبیر بجناولی ص ۲۸)

دیگر ؎

کب نارد بندوق چلایا   داس دیو کب شنب بجاتا
(کبیر بجناولی ص ۱۶۹)

دیگر: ع بھنگ تمباکو سلفا گانجا سو کھا خوب اڈایا رے
(کبیر بجناولی ص ۱۴۵)

دیگر:-

بمراد وار ے دور ہیں لگا دسے اترنے بوجہل پارا
(اکبیر بچنا ولی صفحہ ۱۰۳)

شیخ بہاء الدین باجن متوفی سنہ ۹۱۲ھ

منتصف آخر قرن نہم کے بزرگ ہیں اور شیخ رحمت اللہ گجراتی بن مخدوم شیخ عزیز اللہ متوکل کے مرید ہیں۔ صاحب خزینۃ الاصفیا شیخ عزیز اللہ کے مرید بتاتے ہیں (صفحہ ۴۱۵) شیخ رحمت اللہ محمود بیگڑہ (م ۹۱۷ھ) والی گجرات کے پیر ہیں۔ شیخ بہاء الدین کے والد کا نام معز الدین ہے۔ اور مزار برہان پور میں ہے ان کا بھائی میاں مینا بھی شیخ رحمت اللہ ہی کے مرید تھے۔ سال وفات بقول تذکرہ گلزار ابرار سنہ ۹۱۲ھ ہے۔ کچھ مدت سیاحی بھی کی ہے۔ ادھر گجرات سے سندھ و خراسان تک گئے ادھر جزیرہ سیلان تک پہونچے۔

شیخ باجن ہندی و فارسی میں اشعار لکھتے تھے اور باجن تخلص کرتے تھے باجن کے معنی ہندی میں ساز کے ہیں۔ انھوں نے فارسی زبان میں ایک تصنیف اپنے پیر کے حالات اور مریدوں کی ہدایت لکھی ہے اور اس میں اپنے اشعار کثرت سے لائے ہیں۔ باجن پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو "زبان" کو زبان دہلوی کے نام سے یاد کیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو ان ایام میں بھی برج بھاشا سے علیحدہ مانی جاتی تھی۔ ان کے ہاں صرف ایک نمونہ اس اردو کا ملتا ہے۔ میں اس کو اس سے پیشتر اگلی صفحات میں نقل کر چکا ہوں۔ نمونہ کلام:-

مناجات

روزے دھر دھر نماز گذاری دینی فرض زکوٰۃ — بن فضل تیرے چھوٹنگ ناہیں آکھیں کھیمن بات

دوہرہ سے

بھونرا لیوے پھول رس لیوے باس — باجن ٹے سچے اس کو بھونرا کہرا ادا اس

دوہرہ سے

نہ وہ بھینا نہ وہ جاپیا ناوہ مائی باپ کھلایا — باجن سب داآپٹ پایا پرگٹ ہو آپ لگایا

دوہرہ سے

باجن وہ کسی سر لکھیا نہیں اداس سر لکھیا نہیں کوئے — جیسا کوئی من منھ چنت دے دیا بھی نہ ہوئے

دوہرہ سے

باجن جو کسی کے عیب ڈھانکے — اس تھے ور جن ٹھر ٹھر کانپے
نعمت علی اس تھے پائی — میں جیہاں (کذا) انکھیاں بچاری نکھائی

دوہرہ سے

باجن بھکیاری بکھان کرے گا — دلے اپنی بھیک کارن کچھ کچھ کہے گا
جو کچھ قسمت میں ہے سو ہی لہے گا — گدھوں بتوں ہی پرا آتا رہے گا

دیگرسے۔ محمد سرور پرم کار رحمت اللہ بھریا — باجن جیوڑا دار کرمرا آکھیں دہریا

عقدہ سے

ایک آہیں جاگنا اور ن بھی جگا دنہ — پھرے پھرے سدھ سنا دنہ
الٹک الٹک بیٹھی ہیں پوکیاں — جاگو لو کا جساتی زات

دوہرہ سے

باجن کوئی بجانے وہ کد تھا اور کد تھے پرگٹ ہودا
وہی جانے آپ کوں جب تھے پرگٹ ہودا

قطبن

اصلی نام معلوم نہیں۔ تخلص قطبن ہے۔ اور بھاشا کے سربرآوردہ شاعر ہیں ان کے متعلق میری اطلاع کا تنہا ماخذ ناگری پرچارنی سبھا بنارس کی ۱۹۰۲ء کی رپورٹ ہے جو شیام داس صاحب بی۔ اے آنریری سکریٹری سبھا مذکور نے تیار کی ہے اور یوپی کی گورنمنٹ نے اپنے خرچ اور حکم سے چھپوائی ہے۔ سبھا کی یہ رپورٹیں جو صرف ہندی مخطوطات سے تعلق رکھتی ہیں ۱۹۰۰ء سے شروع ہوتی ہیں۔ ابتدا میں سالانہ رپورٹ شائع ہوتی رہی۔ بعد میں سہ سالانہ رپورٹ کی شکل میں تبدیل کر دی گئی اور مسٹر شیام داس ہی ایڈیٹر رہتے۔ رپورٹیں اب تک مسلسل شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان رپورٹوں نے ہندی قلمی ادبیات کی تلاش اودھ۔ بہار۔ اضلاع متحدہ۔ مالوہ۔ راجپوتانہ اور بندیلکھنڈ۔ وغیرہ میں جاری رکھ کر جہاں جہاں قلمی ذخائر کا سراغ لگا۔ ان کی فہرست اپنے ذیل میں شامل کر لی ہے ان فہرستوں سے ہندی ذخیرہ پر ایک نہایت ہی حیرت بخش روشنی پڑی ہے اور سیکڑوں نادر اور نامعلوم کتابیں دریافت ہوئی ہیں درحقیقت ناگری پرچارنی سبھا نے یہ ایک نہایت مفید کام ہے جو تکمیل کو پہونچایا ہے۔ طباعت کے مصارف گورنمنٹ صوبۂ متحدہ نے برداشت کیے ہیں۔ مسٹر شیام داس کو ان کی محنت ہمت ذوق اور استقلال کامل پر جو انھوں نے ہمارے مخطوطات کے تحفظ میں دکھائے ہیں مبارکباد دیتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اردو کے میدان میں بھی خدا مسلمانوں کو بھی توفیق عطا فرمائے۔

ناگری پرچارنی سبھا کی تازہ دریافت کردہ کتابوں میں قطبن کی تصنیف مرگاوتی بھی شامل ہے۔ یہ ایک نظم ہے جو محمد جائسی کی پدماوت کی طرح عشقیہ افسانہ ہے قصہ کا خاکہ مسٹر شیام داس نے اس طرح بیان کیا ہے۔

راجہ گنپت دیو چندگیری کے۔ راجہ کا فرزند شہزادی مرگاوتی کے عشق میں مبتلا ہو کر صحرا نوردی اختیار کرتا ہے۔ یہ شہزادی کنچن نگر کے راجہ رُپا نرائن کی دختر بلند اختر ہے۔ راج کنواری اور کمالات کے علاوہ فن پرواز سے بھی واقف ہے۔ شہزادہ بڑی اور مسلسل مصائب کی برداشت کے بعد شہزادی تک رسائی حاصل کرتا ہے اور بیاہ ہو جاتا ہے۔ بیاہ کے کچھ عرصہ کے بعد شہزادی یکایک غائب ہو جاتی ہے اور شہزادہ کو اسکی تلاش میں پھر بیابانوں کی خاک چھاننا پڑتی ہے وہ ایک دریا سے محصور پہاڑی پر پہونچتا ہے اور ایک عورت کو جو کسی راکشش کی قید میں تھی رہائی دلاتا ہے۔ اس عورت کا نام رکمن تھا رکمن کا والد اس شکرگزاری میں رکمن کا بیاہ شہزادہ سے کر دیتا ہے چند روز کے بعد شہزادہ چھپ کر چل دیتا ہے۔ اور متواتر تکالیف اٹھانے کے بعد اسی شہر میں پہونچ جاتا ہے جہاں مرگاوتی اپنے باپ کی وفات کے بعد اسکی جانشین بنکر راج کر رہی ہے۔ میاں بیوی دوبارہ مل جاتے ہیں اور شہزادہ حکومت میں شریک ہو جاتا ہے۔ دونوں بارہ سال تک نہایت راحت اور آسائش کے ساتھ حکومت کرتے ہیں۔ راجہ گنپت دیو اپنے فرزند کی لمبی جدائی کی تاب نہ لاکر اسکی تلاش میں آدمی روانہ کرتا ہے جو رکمن کے شہر ہوتا ہوا کنچن نگر پہونچ جاتا ہے اور راجہ کا ضروری پیغام شہزادہ کو پہونچا دیتا ہے۔ شہزادہ اپنی بیگم مرگاوتی و خدم و حشم سمیت روانہ ہوتا ہے اور راستہ میں رکمن کو لیتا ہوا آخر اپنے باپ کی راجدھانی میں پہونچ جاتا ہے۔ شہر میں اسکی آمد پر بڑی خوشیاں منائی جاتی ہیں اور شہزادہ کئی برس تک اپنی دونوں بیویوں کے ساتھ بڑے لطف سے زندگی بسر کرتا ہے۔ ایک دن شہزادہ شکار کھیلنے گیا اور اپنے ہاتھی سے گر کر فوت ہو گیا۔ اس کی وفادار بیویاں اسکی نعش کے ساتھ

جل کر مر جاتی ہیں اور قصہ ختم ہو جاتا ہے۔"

مسٹر شیام داس کی نگاہوں میں اس کتاب کی اہمیت اس لیے بڑھ گئی ہے کہ ہندی ادبیات کا اکثر حصہ سری رامچندر اور سری کرشن کی مناقب آرائی پر وقف ہے خال خال ایسے شاعر گذرے ہیں جنھوں نے ملک محمد جائسی کی طرح عشقیہ افسانوں یا حکایات پر قلم اٹھایا ہے قطبن اس سلسلہ کا غالباً پہلا ہندی شاعر ہے جس نے جائسی سے بھی قبل سینتیس سال افسانہ نگاری کی بنیاد ڈالی ہے۔ مسٹر شیام داس کا بیان ہے کہ "قطبن کا سرپرست حسین شاہ شیر شاہ سور کا باپ تھا" اور حاشیہ میں اضافہ کرتے ہیں کہ "حسین شاہ بعد میں جونپور کا بادشاہ ہو گیا۔ جب سنہ ۱۴۷۶ء میں بہلول لودھی نے جون پور کا الحاق دہلی کے ساتھ کر دیا۔ حسین شاہ بہار میں جا کر سنہ ۱۴۹۴ء تک حکومت کرتا رہا۔ اس سال سکندر لودھی نے بہار پر حملہ کر دیا۔ حسین شاہ کو شکست ہوئی اور وہ بھاگ کر بنگالہ چلا گیا اور کچھ سال بعد وفات کر گیا۔"

یہاں مسٹر موصوف کو تھوڑا سا مغالطہ ہو گیا ہے۔ وہ حسن سور شیر شاہ کے باپ جاگیردار اور سہسرام اور سلطان حسین شرقی والی جونپور سنہ ۸۶۳ھ (۱۴۵۸ء) و سنہ ۹۰۵ھ (۱۵۰۰ء) کو ایک ہی شخص فرض کر رہے ہیں دوسرے یہ کہ قطبن کا سرپرست نہ حسن سور ہے اور نہ حسین شاہ شرقی ہے اس لیے کہ مرگاوتی محرم سنہ ۹۰۹ھ (۱۵۰۴ء) کے پہلے منتصف میں تصنیف ہوتی ہے اور حسین شاہ شرقی اس سے چار سال پیشتر یعنی سنہ ۹۰۵ھ (۱۵۰۰ء) میں فوت ہو جاتا ہے۔ حسن سور کو قطبن کا مربی ماننا بھی دور از کار ہے۔ اس لیے کہ دونوں کے نام مختلف ہیں یعنی مرگاوتی کا مصنف اپنے ممدوح کا نام حسین شاہ بتاتا ہے اور شیر شاہ کے باپ کا نام حسن ہے جو ایک معمولی جاگیردار تھا۔ میرے خیال میں قطبن کا سرپرست علاء الدین حسین شاہ والی بنگالہ ہوگا۔ جس نے سنہ ۸۹۹ھ (۱۴۹۳ء) سے لے کر سنہ ۹۲۵ھ (۱۵۱۸ء) تک حکومت کی ہے۔ یہ بادشاہ ہندی اور بنگالی ادبیات کا ایک سرگرم سرپرست تھا۔

قطبن اپنے مرشد شیخ بڈھن کے ذکر میں کہتے ہیں ؎

شیخ بڈھن جگ سا چا پیرو | نام لیت سدھ ہوئے سریرو
قطبن نام لئی پا دہر ہے | سر پڑدی دوہ جگ نہ مرے
پاچھلے پاپ دھوئے سب گئے | جھڑ بن پرانے اور سب نئے
نکلے بھیا آج ادھارا | سب سوں بڑ سو پیر ہمارا
جیہ کوٹ دکھائی ہووے | پہونچے ایک نمک میں سووے

دوہرا ؎

گرو پنتھ دکھائے دین ہے جو چل جانے کوئے
نمک ایک میں پہونچے جو ست بہاوے سو ہوئے

اور حسین شاہ کے لیے کہتے ہیں ؎

شاہ حسین آہے بڑ راجا | چھتر سنگاسن ان کو چھاجا
پنڈت او بدھ ونت سیانا | پڑھے پوران اور سب جانا
دھرم و دوستل ان کو چھاجا | ہم سر چھاہ جیو جگ راجا
دان دسے لوگنت نہ آئے | بلی او کرن نہ سر بر بادے
رائے جہاں لوں گندے رہیا | بھیٹوا کرہیں با سب پچھ ہیں

شیخ عبد القدوس گنگوہی متوفی سنہ ۹۴۵ ھ

آپ کے والد کا نام اسمٰعیل ہے اور شیخ محمد بن شیخ عارف بن شیخ احمد عبد الحق چشتی صابری کے مرید ہیں اور صاحب تصنیفات کثیرہ ہیں۔ از تحفہ انوار العیون

رسالۂ نورالہدیٰ۔ رسالہ قرۃ العین اور رشد نامہ ہیں۔ ان کے مکتوب مولانا خضر بدمین بن رکن جون پوری نے جمع کیے ہیں۔ ۱۰۹۵ھ میں وفات پائی ہندی کے بلند مرتبہ شاعر ہیں۔ الکھ داس تخلص کرتے تھے۔ نمونہ کلام :-

مرو دوہ چوہٗ پوری ؎

دہن کارن پی آپ سنوارا بن دہن سنکھی کنت کنھارا
شہ کھیلے دھن مانہیں ایواں پاس پھول اچھے جیواں
کیوں نہ کھیلوں تج سنگ بیتا مجھ کارن تیں اپتا کیتا
آلکھ داس آکھے سن سوہئی سوئی پاک ارتھ پہن سوئی

شبد ؎

ایک تھیں ہم اننت بھیلی آپی آپ بیاہی
سہجنہ سہجہ کیتا سہجو برانا ایام سرا جنوائی

دوہرہ ؎ ایک اکیلا آپ سو جب تھیں یہ سیسار آتھ نانہ تھول سو سبھی ایک اکار

دوہرہ ؎

جدھر دیکھیوں ہے سکھی دیکھوں اور نکوری دیکھا بوجھ بچار منہہ سبھی آپیں سوئے
جیسو کینہہ آئینہ منو تکیو تیسو بند بیندیں نرمیو باہر بھیتر کہا بجائے سرب ترنترا لکی کالے
چت پائی ست مالت بھول انہس اوچا اچھی ابھو ل یہ جوا ہیں رس لادہو نہجھو سرب ترنترا ہیں دیو

شبد ؎

جل تھل مہیر اور اکاس پی سرب ترنتر تو دے پاس
تو چھاڈ پیا کہہ کہواں جانوں چنھ رجا تنھ تو را ٹھانوں
باہر بھیتر کہا نہ جائے سرب ترنتر الکی کائے
الکھ داس مانکھے مور کنت دھہہ جگ سکھی رات بسنت

شبد سے

جان اجان سبھ کھیلنا لوئی — بن پی کھیلے نہ کھیلا ہوئی
جان اجان جگ کھیلے رے — ہو ہو ہو ہو ہو ہو ہولی رے
سبھ کھیلنہ سکھی مہہ جان — سرب ترنتر پی پروان
جان اجان جگ کھیلے بھاگ — کنت بلبا لیوں سہرڑے لاگ
الکھ داس آکھے سن نانہاں — ہم تم کھیلینہ دی کل نانہاں

دوہرہ سے

دیکھوں ری من پوچھوں ری دیکھوانوں بانی — سبھی ٹنگ تیر کا بار بار نگ سبا یا بالی
رہنسی کبوتھ ناچوں سکھی پی جی رنگ چڑھایا — تن من جیوا یک رنگ دیکھا تو میں آپ گنوایا

عقدہ

الکھ داس لکھے سن لوے — دوئی ددی کہو مت بھائی کوئی
جل تھل مہیر سرب تر نتر — کو رکھ ناتھ اکیلا سوئی

شلوک سے

اپا ناشت پرا ناشت ناشت گنجت جگڑا
بدھ پاچا منو ناشت تنتر دیوی اکل بتا

شبد سے

پھلے نہ پھولے آدے نجائے — کانسی کا سبد کانسی ہی سمائے
جل بھیں اپنا ببلا جل میں ناتھ بلائے — تیسا یہ سنسار سب مولنہ جائے سمائے

دوہرہ سے

آپ گنواتی پی ملے پی کھوئے سبھ جائے
الکتھ کتھا ہے پریم کی جے کوئی بوجھ پائے

شاہ علی محمد جیو گام دھنی گجراتی

سید احمد کبیر رفاعی کی اولاد میں ہیں۔ اور سید عبدالرحیم کے پوتے ہیں[1]
۲۸ جمادی الاولیٰ ۹۶۳ھ کو انتقال کیا۔ اور رائیکر میں متصل روضہ شاہ عربی مدفون
ہیں ہندی کے شاعر ہیں۔ کتاب چشتیہ میں لکھا جب مخدوم بہاء الدین برنادی
خاتم التارکین بسبیل سیاحت گجرات تشریف لے گئے۔ شاہ علی جیو کے مہمان تھے۔ اس قیام
کے زمانہ میں میزبان نے اپنا ہندی کلام جو عجیب و غریب و پر لذت بجمد میں لکھا تھا
سنایا اور اپنا ایک رسالہ جو نکات و دقائق موحدانہ پر مشتمل تھا ہدیہ دیا۔

شاہ علی جیو کے کلام کو ان کی زندگی میں ان کے مرید شیخ حبیب اللہ بن عبدالرحمٰن
القریشی الاحمدی نے ایک مختصر دیباچہ کے ساتھ مدون کیا ہے۔ اور اس کا نام
جواہر اسرار اللہ رکھا ہے۔ دیباچہ حسب ذیل ہے۔

"می گوید بندۂ فقیر و حقیر کہ یکے از کمینہ مریداں و خاکروب حضرت رب العالمین
بندگی حضرت قطب الاقطاب العالم والآفاق تاج الافراد و سلطان العارفین
غوث الاعظم الشریف سلطان سید معشوق اللہ الحسینی الرفاعی رضی اللہ تعالیٰ
عنہ المسمّی بہ شیخ حبیب اللہ ابن عبدالرحمٰن قریشی الاحمدی کان اللہ لہٗ کہ چند
مکاشفات حضرت بندگی سید السادات سیدی و سندی شیخ العالم الشریف
المخاطب حضرت اللہ تعالیٰ بخطاب سلطان العارفین و سلطان العالم

---

[1] تحفۃ الکرام میں سید عبدالرحیم کا پوتا لکھتا ہے لیکن حبیب اللہ شاہ عمر کا پوتا بیان کرتا ہے
یہ ظاہر ہے کہ حبیب اللہ اپنے مرشد کے جد کے نام سے زیادہ صحیح اطلاع دے سکتا ہے

الشریف شاہ علی جیو معشوق اللہ مدظلہ۔ ابن شاہ ابراہیم ابن شاہ عمر الحسینی الاحمدی رضی اللہ عنہم دربیان توحید و اسرار بالفاظ گوجری بطریق نظم فرمودہ بود دریں مختصر آوردہ و جمع کردہ و آں ملفوظات حضرت سلطان العالم شاہ علی محمد معشوق اللہ المنابت جواہر اسرار اللہ رایکتاب جواہر اسرار اللہ نام داشتہ "۔

جواہر اسرار اللہ کی یہ پہلی اشاعت ہے جس کا ایک نسخہ دیوان عطار (مملوکہ پروفیسر سراج الدین آذر۔ ایم۔ اے) کے حاشیہ پر مرقوم ہے یہ نسخہ گیارھویں صدی کی ابتدا کا نوشتہ معلوم ہوتا ہے۔ اسکی دوسری اشاعت شاہ علی جیو کے پوتے سید ابراہیم بن مصطفے بن شاہ علی جیو نے مرتب کی ہے۔ اس اشاعت کا ایک نسخہ نوشتہ ۱۱۲۷ھ میرے پاس ہے۔ سید ابراہیم اپنے دیباچہ میں حبیب اللہ کی اشاعت کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن اس کا نام ابوالحسن شیخ محمد ابن عبدالرحمن القریشی الاحمدی لکھتے ہیں اور اس کا ایک فارسی قصیدہ بھی جو شاہ علی جیو کی مدح میں ہے نقل کرتے ہیں۔

یہاں شاہ علی جیو کے کلام کا نمونہ دیا جاتا ہے۔

نکتہ اول در مکاشفہ ع

اپنے بھاؤ جو لبیا لوڑے سو کیوں بھیس بھوبھی چھوڑے

نکتۂ دوم ع

نو کھنڈ ہو رہے اسمہ آہے سب ہیو جہت تھیں جہتا ہوا ہے
ہو ہنو دونوں نانو اسی کے آہیں اسے سب بھیس جسی کے

نکتہ سوم ع

سرک اجھر ہو رمندر مارے ہو رہے اس منہ ندیاں بارے
مانک موتی سنگھ سنگارا اے سب بھیس پیا کا سارا

نکتۂ چہارم

کبھی سو لیاوے بھیس اکا سا — ہو کر چندا تارے باسا
ویہ الا لا تیج بکھیرے — روپ انڑے اپیں ہیرے

نکتۂ پنجم سے

کبھیں سو ہووے اندھیاری راتا — سانجھ بتی کر لاوے دھاتا
ہو کر دیوار راتیں ساری — لاکر جوت دکھاوے بھاری

نکتۂ ششم سے

ہکہ پر مال بکھیر سو ساتھی — چھپ کر ہووے رات سند گاتی
دل سنبھال سو بکھیرے کیا — دن ہو آوے سورج بھیا

نکتۂ ہفتم سے

ان بھر دل کھیلے میرے — بھیس کیے ہیں میرے تیرے
پرکھ نار ہو آپیں آیا ہو — دیکھو بھیس او ناری لیا یا

نکتۂ ہشتم سے

کھیل عدھر بھرد پا کھیلے — ہنسی نل بھی کھیل نہ میلے
آپیں ناچے آپیں گاوے — آپیں آپس بھاؤ دکھاوے

نکتۂ نہم سے

کبھی تیج بھرا بھیس لیاوے — دھرتی ہو کر آپ بچھاوے
کم پریت ہو بھاری بیسے — سرماں ہو کر نیئوں بیسے

نکتۂ دہم سے

ایک سمندہ سات کھاوے — دلنہوس بادل مینہ ہو آوے
وہی سمند، کر بوند دکھالے — ندیاں نالے ہو کر چالے

نکتہ یازدہم سہ

کبھی سونہاں ہو جھڑ لاوے کبھیں موتی اولے تھاوے

کاج ریچ ہنس آپیں کھیلے نار پر کھ ہو ویہی جھیلے

مکاشفہ سہ

جاؤ اٹھیا اس میرے ساتھی کی ہوں جگ بھیں سوں آؤں کہیں سور جا کہیں سو پر جا کہیں سوں ہند آپ کہاؤں

نکتہ سہ

کہیں سو عاشق ہو کر راؤں کہیں عارف ہوئے پچھاتوں کہیں موحد کہیں محقق کہیں سو جانوں کہیں یہ بجانوں

نکتہ سہ

کہیں بندوں کے کروں سو بندگی اوہا ہو ہو نماز گزاروں

ہوں حاجی ہوں کعبا آ ہوں آپیں آپس اوپر واروں

نکتہ سہ

ہوئے بندے ہو رہوئے بتیاں یو کی ہیں آپ کہا ہوں فرض کیتاں ایہ باتاں تم پر پیار کرو گا کرسیں تا ہوں

نکتہ سہ

بھاؤ نماز جب لیاؤں کیرا مجلس تن یو آپ سنواروں وضو غسل کرنا ہو کیرا زیبا کیر حسے بھر سنگاروں

نکتہ سہ

ستر عورت کر کا جھوں آپس میں سنگاروں سا زلاؤں کھبا ہو کیا پٹ کھاؤں مسجد سے گھر گھر لٹکے لا لیوں

نکتہ سہ

آج سو تیو گھبیں کیسے ہیں علم قدیم میں جیوں تھ گورے فرض نماز آپس پر کیتی تس منہ تیرا فرض سو جوڑے

نکتہ

اسمنہ بھلا سازجو اسی سو جے شرطاں جا بنی ما ما حد خبث تھیں بھلوں پاکی یہ تن پاک کر یجا سارا

نکتہ سہ

دوجی فریضہ ایسے کپڑے پاک نماز پڑھئے تیجی شرط سو تھاں پاک جیہڑے دھڑے قدم تمہارے کھے

نکتہ سہ

مجسے کی بھی جیہڑے بھائیو کوری پاک سو تھانہاں سر کبوں چوکھی تھام نکیجے بیس نا دنے جہاں نانہاں

نکتہ سہ

چوتھی شرط سو ستر عورتونکی تو سمنہ بکنا وانہیں مردوں کو تن ڈھیانڈے دونے تھیں کھوئیں تائیں

نکتہ سہ

پہونیچ ببیاں ہیرو میں اصیلاں زتن سارا ڈھوہنا جوگی دسے نو معاہیں مکھ ہور پاؤں تھیاں جا لکہ بیچ کی

نکتہ سہ

اصیل عورت کے تن نکھ جیر کہیں عورت ما ہاں
چوتھا بھاگ کھلے جو اسکہ کھلیں ڈھا پئے چاہی تھانہاں

آگے نماز کی بہ ابیات ہیں۔ میں اسی پہ اکتفا کرتا ہوں شاہ ولی جیو نے ایک آدھ مقام پر فارسی بحر میں طبع آزمائی کی ہے۔ بحر ہزج مربع سالم۔

نکتہ سویم سہ

مکاشفۂ در عشق سہ

بچاری بہو لڑکی کھادو
دور نتھی آپ کوں کا دہو

نکتہ ادل سہ

پرم رنگ جیو جن ماہاں سو دیکھیں نا رب تھا نہاں تنہو من لوک ہے کانہاں

نکتہ دوم سہ

لوکا کی بھوک کوں بوجھو گھ ٹیں ساج ان سو جھو پرم کی بات لیہ لو جھو

جب جوڑا پیو سوں لاگا   ہئے جس نیہ کی آگا   تنہوں کالو جب سب بھاگا

نکتہ چہارم سے

جو لوٹیں ترکھ جیں نا کہیں   دو نو میں ہو دو کہ سکو چاکہیں   تنہوں اسے ناچنتے آکہیں

نکتہ پنجم سے

بنو لو بول کچھ کا جو   جو لاگے پیار تم سا جو   تمنہ بھی اینویں ناہیں ناچو

نکتہ ششم سے

جنھوں من پریم کا بھٹکا   تلیں تل نیہ کا کھٹکا   سو جانے مرم کا ٹکا

نکتہ ہفتم سے

انکھوں کی سیج سے بس بس   بھاونے پیو انہ ہس ہس   گے تب سو کہ ہاتھ کس کس

نکتہ ہشتم سے

الہی یہ انکھ کھیں لاگے   سو تا پیر جوڑا جاگے   جو انکا ہو گرہن بھاگے

نکتہ نہم سے

پر کر یہی نادہ پڑا دیں   سو سنتی آپ کھو چاویں   سو بیگے بان بند ہو ادیں

نکتہ دہم سے

جو یانا پیو سبز ادسے   پیاسیں پیار بڈھا دے   پراتس کیتو کھو ندسے

نکتہ یازدہم سے

جو اپنے کنت بسرا دے   پرانس اکھیا جادے   بھلا سو پیو دکھلا دے

نکتہ دوازدہم سے

دہوں جگت نہ ہے کا جے   ساودں سر تاج جو راجے   سنیں تن گیت منہ باجے

نکتہ سیزدہم سے

جو بولیں لوگ بہتر سے   کھلے ہیں کان جن کہر سے   سنے سب یاد و بیو کہیرے

نکتۂ چہار دہم سے

باجوں سب بازوہ بولی تاروں اور بانس پہ دوہلی پوچھیں جن جیو پیو کھولی

نکتۂ پانزدہم سے

بجنتر ماما کونا نہیں کرے سب وہ وہ سا ہیں بولو بول سب کائیں

نکتۂ شانزدہم سے

جو گاویں گیت یہ ناؤں سنیں اے پیو کے کانوں سبھی کر بات تم جانوں

نکتۂ ہفدہم سے

ہمارے لوگ رے سارے دیکھیں جب جیو کے پیارے کہا نہ جانو ہیں واسے

نکتۂ ہشدہم سے

نبی کی نین ات ماتی سلونی اور رنگ راتی کھلیں وے پیو دکھلاتی

نکتۂ نوزدہم سے

جھنڈ بابا آج میں دیتہا سو دسے پاؤ لگ بیٹھا دہر یار نہ بات منجہ پیٹھا

نکتۂ بیستم سے

جو ایسے پیو کوں پاویں اٹھیں ہور بھیر گل لاویں پھر ب ہور داریں جاویں

نکتۂ تخلص سے

سو لٹکن لٹکتا آوے لٹک گل بانہ جب پا ہووے
علی تب چانپ گل لاوے

شیخ خوب محمد چشتی

گجرات کے رہنے والے ہیں۔ اور شیخ کمال محمد سیستانی کے مرید ہیں۔ سنہ ۹۸۶ھ میں تصوف کی ایک مثنوی خوب ترنگ نامی تصنیف کی۔ اور سنہ ۱۰۰۰ھ میں ایک شرح

بزبان فارسی لکھی۔ شرح کا نام امواج خوبی ہے خوب ترنگ کی تاریخ تصنیف شعر ذیل کے دونوں مصرعوں سے الگ الگ برآمد ہوتی ہے۔ بلکہ دوسرے مصرع سے دوہری تاریخیں نکلتی ہیں۔

خوب محمد کیے بچار چودہ گھاٹ اوس برس ہزار

اور شرح کی تاریخ اس شعر میں بیان کی ہے ؎

عدد شمار ز تاریخ شرح نعت محمدؐ ہزار سال مکمل ز فکر خوب محمدؐ

دیباچہ میں کہتے ہیں۔

خوب کہیگا خوب ترنگ سنتیں کچھ نہ کیجو ننگ یوں انکار نہ کیجو دیکھ جا بوناں تج یوں منہ لیکھ
کے یہ تو کہتا ہے خوب دیکھو کر کہتا ہے خوب پڑھے جو چھو کر داد قرآن تو اس کوں کر چھوٹ نراں
مت بوجھیں ہے چھو کر داد اس کا کیا پوچھے برباد جو بمقدر کنیں نہیں پائے جو ہر تو کیاں بنیاں نکھائے
یہ تو جان بنا نہ ہنہوئے جیسے مقصود تجھے یوں کوئے یہ تو کہیا نکلا سے نے یار ایسا بوجھ کرے انکار
جتنا طالب کوں بسم ہوئے بل بس بنیہ کہیا ہے سنئے جیوں دل عرب عجم کی بات سن بولی بولے گجرات
بتوں ترجما سو ہوں جیوں ل کہوں ہیں تھیں جل جنگل ہیں مرشد تھیں سنیاں بیاں شیخ مرشد صاحب عرفاں
جنہو منجھے سکھلا یادیں جن تھیں منجھ دل ہما یقیں جیلانی بیجا پی شاہ بغدادی جس چتر کلاہ
ہر ماضی پر حجت لیک ہوں معتقد ہوا ان دیگ وارث محمدی ہر تھانوی شیخ کمال محمد نانوں
کیا عروج مقام اقدم اللہم اغفر وارحم اون کون تھا یہ علم کمال ہٰذا العلم افواہ رجال
اون تھیں سنیاں دن رات اوس منجھ یاد ہے کچھ بات وہ جیوں منجھکو آئی ترنگ جمع کیے لے تس تس ڈھنگ
خوب ترنگ اس دیا خطاب مدح رسول الثمرات بہر لیے مدح رسول اوسی دوستی کر قبول
جیوں میری بول منہ بات عرب عجم ہل اک سنگھات تیوں ہی کہو گا کر یٹ کھوٹ آیا بول کیا نہیں چھوڑ
اپنہاں شعر کا قصد نہ لیکھ اپنہا مراتب کہوں تو دیکھ اتنی سما منہ بچ نہ سمائے وزن شعر منہ دے کیوں آئے
نعت میں کرتا ہوں سیر باللہ تم بالخیر غلطا یہ بگڑیں بھلا آجان دوس کہوں دے تو ہ من ان

جو کچھ خدا اس منہ تو پائے ایسی کر بڑائے خدائے پن اتنا کہوں کو دکھائے مت ان کہے بول پرائے
نسخہ کی تاریخ اس تھا نہ پائے عدد ہر مصرع مانہ خوب محمد کئے بچار چودہ گھاٹ اس پر ہزار

دو جا چاند جو تھا شعبان دیس دوشنبہ کیا بیان

شیخ خوب محمد اس زبان کی عربی و فارسی آمیز گجراتی کہتے ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ اُردو ہے۔ اگرچہ اس میں گجراتی زبان کا پر تو بھی موجود ہے۔ گجری بھی اسی کا نام ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب رسالہ اردو حصہ بیست و ہفتم ۱۹۲۷ء میں رقمطراز ہیں۔

جب یہی زبان دکن میں آئی اور اس میں دکنی لفظ اور لہجہ داخل ہوا تو دکنی کہلائی اور گجرات میں پہونچی تو اس خصوصیت کی وجہ سے گجری اور گجراتی کہی جانے لگی شاہ برہان صاحب جانم متوفی ۹۹۰ھ نے اپنے کلام میں کئی جگہ اپنی زبان کو گجری کہا ہے۔ مثلاً وہ کتاب حجت البقا میں فرماتے ہیں۔

"جے ہوویں گیاں بچاری نہ دیکھیں بھاکا گجری"

یعنی جو صاحب عرفاں ہیں وہ گجری (گجراتی) زبان کا خیال نہ کریں گے۔"

فارسی و عربی الفاظ ان کے زمانہ سے پیشتر مقامی لہجہ اختیار کر چکے تھے اس لئے اس کو وہ مروجہ لہجہ میں لکھ جاتے ہیں۔ مثلاً اوپر کے اقتباس میں مصرع کو مصرمے، نسخہ کو نسخا۔ درست کو دُرُس رقم کیا ہے

احمد دکنی

اُردو ادب کی تاریخ میں محمد قلی قطب شاہ ۹۸۸ھ د ۱۰۲۰ھ کا نام سنہری حرفوں میں لکھا جانا چاہیئے۔ وہ خود اردو اور فارسی کا زبردست شاعر تھا۔ اسکے ضخیم کلیات پر جو اٹھارہ سو صفحات پر شامل ہے ۱۹۲۲ء میں مولوی عبدالحق صاحب کے رسالہ اردو ادب بابت جنوری میں ایک پُر مغز اور عالمانہ تبصرہ لکھا ہے۔ علوم کی سرپرستی

میں جس قدر حصہ اس بادشاہ نے لیا ہے ابھی ہم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اس عہد کے ذہنی کارناموں کی تاریخ ابھی تک مدون نہیں ہوئی ہے اختیارات قطب شاہی جو اختیارات بدیعی (ایک طبی تصنیف) کی تتمیم تنقید ہے۔ اسی بادشاہ کے حکم سے اطبا کی ایک جماعت نے تالیف کی ہے جس کا اصل نسخہ راقم کے مجموعہ کتب کے نوادرات میں سے ہے۔

احمد دکنی اسی بادشاہ کے دربار کا شاعر ہے اور اسکے حکم سے اپنی تصنیف لیلی مجنوں لکھی ہے۔ احمد کے حالات زندگی سے ہم بے خبر ہیں۔ میرے مہربان اور مخدوم پروفیسر سید عبدالقادر ایم۔ اے۔ پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور کی وساطت سے احمد کی لیلی مجنوں کے چند اجزا مجھ تک پہونچے ہیں جن میں کل ۹۴ منتشر اوراق ہیں باقی کتاب کا اکثر حصہ غائب ہے۔ ان میں چند تصاویر اکبری دلبستان کی طرز میں موجود ہیں۔ لیکن اکثر شکستہ و خستہ۔ یہ مثنوی خط نسخ میں لکھی گئی ہے اسکی تقطیع ۹×۵½ ہے۔ فی صفحہ گیارہ اشعار جلی قلم میں مرقوم ہیں۔ رسم الخط میں بعض مقامی خصوصیات مشاہدہ میں آتی ہیں زیادہ تر ہندی اصوات کے اظہار کے لیے وضع ہوئی ہیں۔ چنانچہ جیم فارسی رائے ہندی اور دال ہندی اور بائے فارسی کے نیچے بالعموم تین نقطے دیئے ہیں۔ تائے ہندی پر چار نقاط اور کاف فارسی کے نیچے (بعض اوقات) تین نقاط دیئے گئے ہیں۔

احمد سبب تالیف میں کہتا ہے:۔

جو منج بخت کوں فتح یار ہوا	سو منج بخت سیو کیا اسیر ہوا
جو شہ آپ تھے آپ منج یاد کر	منجے غم کی بندگی تھے آزاد کر
دیتے امر اعلیٰ کہ یہ باغ دلاؤں	جو پالوں سے امریت نانوں
جو نیں شہ کا امر سر پہ لیتا	ترت باغ لانے شتابی کیتا

بہوتیک پریشانی روزگار — اگرچہ منجے ہے ملامت سوبار
بہوتیک شعلا سیں رات دن — نتھی منج فرصت بھلا ایک بن
ولے اس دہر شہ کے فرمان پہ — لگیا تن سنگارن بہو قصہ دہر
دہر میں عشق کی باس اس بن کے پھول — جو اس باس پر جوں بھنور جگ کوں بھول
سو ہر یک عشق کوں سب جگت میں دکھا دیں — جو گم کر گنے لیلیٰ مجنوں چاؤں
جو لیلیٰ [illegible] تھے دلوں پُران — سو تازہ کروں اب اتو کا بران
جو اس بن چمن تھے گزرے پون — پون باس تھے باس لے سر کے بن
جو اس باغ پر شہ کا داغ ہے — سو باغوں میں باغ شہ باغ ہے
دہنی باغ کا شہ ہیں باغباں — بھنور باغ کا کیوں نہوی آسماں
جو اس باغ ہر کلا تھے جگ بھرے — مہر سرست کم قدسیاں کوں ہرے
سو ہر یک شہ کوں یہ بن مبارک ہو — جو اس بن تھے ہر روز نور روز ہے
شہنشہ کے ارکان دولت جیکوی — مبارک تو ر پر بھی یہ باغ ہوی
جکوئی باغ کی باغباں کرے — جو اس باغ تھے شادمانی کرے
دہنی باغ کا باغباں گل نواز — بہو رحمت سوں کرے سرفراز
جو احمد کرے اس دہر میں سنگار — سو اب شہ تھے پاے ستیں سنگار

مثنوی کے افتتاحیہ ابیات یہ ہیں ؎

اس اللہ کے ناتوں سوں سب جگت — جو دانی دیا ونت اسکی صفت
سر بانا سب اللہ کو جسم قرار — جو جگ کا دہنی ہور پروردگار
جو دیا ہمیں کافر مسلماں کوں — منگے من سو بخشے بہا ماں جسوں

شاعر نے حمد کے بعد تین مناجاتیں لکھی ہیں۔ میں دوسری مناجات سے کچھ اشعار حوالۂ قلم کرتا ہوں۔

رحیمی سوں رحمت کرے سو رحیم   کریمی کے سب گن دہرے سو کریم
سبہ جگ کوں بھرڈے سو رحمت دہرے   سبہ جگکوں اپڑے سو نعمت دہرے
بہلے ہور برے پر کرم راکھتا   برائی چھپا کر بھرم راکھتا
گنہگار کے پاپ بھجن کرے   گنہ بخش بخشش سو پرسن کرے
نہ وہ کچھ کسی دہاتھ حاجت دھرے   جو عالم سب اسکی عبادت کرے
دلے بر جگت کوں ہدایت دکھاوے   کرم ساتھ اپنے عبادت سکھلائے
عبادت سیتے اپیں تو ہے بے نیاز   سو ہوئے جن عبادت کرے سرفراز

کرے ایک نیکی تو دسے دس ثواب
جو لوٹے زیادہ تہ دسے بے حساب

مصرع "جو عالم سب اسکی عبادت کرے" میں "جو" کاف بیانیہ کا قائم مقام ہے پنجابی اور دکنی میں بالعموم آتا ہے۔ مثلاً عبدالحکیم پنجابی کہتے ہیں ؎

کہے بیچارہ اب یوں کرکے فریاد   جو یارب بھائیاں دیکھ بیداد

دیگر ؎

کہا یعقوب جو فرزند میرا   تساں کھاوا چھڈو جھگڑا اتے جھیڑا

اسی لیلیٰ مجنوں میں احمد ایک اور مقام پر کہتا ہے ؎

جو پانی ستیں جیوتی سب جگت
جو طاقاں ہوئے سب جگت جائے گت

اسی طرح یہ شعر ؎

بولایا لکھن ہار مسکباں کوں
جو لکھے کتابت بھو گیاں سوں

لیکن کاف بیانیہ اردو میں قدیم سے ہے۔ پرانے مصنف اس کو "کہ" لکھے

لکھتے ہیں۔ مثلاً شاہ علی جیو گام دہنی ؎

بے عد ثابت ہوئی جو ہے سو اس مٹھ جگ بھی عد نجوئے

کے وہ الطف سبا لطف بھتے ہے۔ عجز نہ آوے فہم نہ ہوئے

بعد میں فارسی املا اختیار کرلیا گیا۔ چنانچہ یہی احمد گویلہے ؎

بہر عجز سوں آس احمد دھرے

کہ سائیں دکھت عجز رحمت کرے

فارسی اُردو سے ہندوستان کی اکثر زبانوں ہندی گجراتی وغیرہ میں لے لیا گیا ہے کاف بیانیہ کی سرگزشت کا ایک دلچسپ پہلو وہ ہے جب کہ بمبئی کے فاضلوں کے ایک دبستان نے اسے سنسکرت کے ماخذ سے استخراج کرنے کی کوشش کی تھی۔

شیخ عثمان

غازی پور کے رہنے والے ہیں۔ والد کا نام شیخ حسن تھا اور جہانگیر کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے چتراولی نام کا ایک عشقیہ قصہ بزبان ہندی لکھا ہے جو دوہوں اور چوپائیوں پر مشتمل ہے۔ اسکے علاوہ اور تصنیفات کیں چتراولی ایک نہایت دلچسپ تصنیف ہے، اور اسی پر ان کی شہرت قائم ہے اس تالیف کے زور دار حصے وہ ہیں جو چتراولی کے محل اسکے حسن وجمال بیان ہجر اور بارہ ماسہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ شہزادہ کی تلاش میں مصنف نے جہاں مختلف ممالک اسلامیہ کا ذکر کیا ہے اس میں انگریزوں کی طرف بھی ایک تلمیح ملتی ہے جو ہندوستانی ادب میں بقول مصنف کامتا کو میدی سب سے پہلی ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی شہر سورت میں اپنی کوٹھی سنہ ۱۶۱۲ء میں قائم کرتی ہے اور سنہ ۱۶۱۳ء کی یہ تلمیح ہم کو مل جاتی ہے۔

ذیل میں چترادلی کے اس حصہ سے جس کا عنوان "گنور ڈھونڈھن میں کھنڈ" ہے بعض اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں ؂

جنہ پچھوں دس کرُ پیانا — پھلہیں گا سو دیس ملتانا
دیکھسی سنگھی لوگ سہائیں — نہیرا دن سب سلو ہیں سائیں
ہیرے رہی ٹھٹھ نگر سو بادا — بیہنگ ہرن سیویں گجاتا!
کابل ہیری موگل کر دیسا — جہاں پوہم پتی ہیری نہ دیسا
دیکھسی روم سکندر کیرا — سیام رہا ہوتی سگل اندھیرا
دیکھے گنا کر دو ہی استھانا — ہاتھی اندھ تین پاہن جانا
حاجی سنگ ملی کبیو مدینہ — کابھا گئے جو صاف نہ سینہ
گابغداد پیر کے تبسرا — جیہی نہیچے تیہی سنگ عبرالامیرا
استنبول، مصر، پوتی۔ ہیرا — گالداخ ہو کنہوسی پھیرا
دکھن دیس کو بجے بگو دہارا — چلاتا کی سولنگ بھارا
پچھلے ہی گے ہیر مس گجراتا — سندر دہنی لوگ سو کھ داتا
گیو جام جھن پگھی ہوئی — لوگ سروپ سو کھی سب کوئی
بلندیپ دیکھا انگریزا — جہاں جائے نہیں کیٹھن کر بجا
اونچ نیچ دہن پنت ہیرا — مدبراہ بھو جن جن کیرا

جہاں جائی اوہن بندر سا جا
رگا سنگ چڈھی گیو چھا جا

شیخ بہاء الدین برناوی خاتم التارکین

آپ مخدوم شیخ فرید الدین برناوی مہاجر متوفی ۹۸۷ھ کے پوتے اور جانشین ہیں مسلمانان ہندوستان میں صرف دو شخص فن موسیقی میں یگانۂ روزگار مانے گئے ہیں امیر خسرو اور مخدوم بہاء الدین۔ امیر اس کا دیباچہ ہیں۔ اور مخدوم اس کا تمت ہیں مخدوم کے حالات اب تک گوشۂ گمنامی میں رہے بقیر اللہ داگ درپن میں البتہ ان کا مذکور کیا ہے۔ میری اطلاع کا ماخذ کتاب چشتیہ ہے جو مخدوم علاء الدین ثانی کی یادگار ہے۔ چنانچہ یہ چند سطور اسی سے ماخوذ ہیں۔

"قاضی عارف برناوی نے حرف شناسی اور ہجا خوانی کرائی۔ ملا انور دوہتگی سے کتابی تعلیم حاصل کی بعد میں شیخ الہ داد پانی پتی آپ کے معلم تھے۔ میران عبد الشکور سے تیمناً شرح عقائد پڑھی اسی زمانہ میں ایک عربی قصیدہ لکھ کر استاد کی خدمت میں پیش کیا۔ تحصیل علمی کے بعد شکار کے بہانہ سے جنگلوں میں نکل جاتے اور تیس تیس کوس جنگلوں میں پھر لیتے۔ ابتدا میں تیر سے شکار کھیلتے رہے۔ بعد میں بندوق اختیار کی۔ ان نواح میں آپ ہی پہلے شخص تھے جس نے بندوق سے شکار کھیلنا اختیار کیا۔ شکار پوکارہ پسند تھا جد امجد کے مکہ معظمہ جانے کے بعد تمام دنیاوی اشیاء مثلاً جاگیرہ۔ قریات انعامات و وظائف۔ اثاث البیت۔ اجناس و متاع۔ ہتھیار مویشی۔ گھوڑے وغیرہ کو ترک کر دیا۔ اس بنا پر آپ خاتم التارکین کہلائے۔ سیر و سفر کے بے حد شائق تھے۔ دکن گجرات۔ کنبھایت۔ جونپور۔ پٹنہ بہار۔ پنڈدہ۔ سرہند

لاہور پٹن، سرہند، حصار و غیرہ کی سیاحت کی تھی۔ ان کے ہر بڑے شہر میں ان کے دوست احباب موجود تھے۔ اکبر و جہانگیری امرا سے رسم و راہ تھی۔ ان دونوں سلطانوں سے ملاقات کی ہے ساتھ ان کا تعلق عشق کی حد تک تھا۔ جکری، خیال اور جنگلہ، قول، ترانہ، سادرہ، حرید، بشن پد وغیرہ میں انھوں نے اشعار لکھے ہیں یوں تو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے لیکن ہندی میں اکثر لکھتے تھے بساز خیال و ساز کہرٹس کے موجد ہیں۔ انھوں نے گمنام رہنا پسند کیا اسلیے کوئی تخلص اختیار نہیں کیا چنانچہ ان کا کلام دوسروں کے نام سے مشہور ہو گیا یہاں بعض نمونے کتاب چشتیہ سے لیکر ہدیۂ ناظرین کیے جاتے ہیں
برائے بارش۔

کاہے اے بدرا نال برست کاہے تھی نا ہن گرجت کاہنے ماں جھوٹ لاوت
کاہے تھی برکھارت نیوت برمن من جتوت کاہے تھی نا گھور مستاوت
جتر و سانبرہ ہے آما ہو داتا سیکھ کہاوت گر ہن تیا کو تا جم گٹ بھیرا ول بدل لے آوت

دیگر ۔

ان نینن کا یہی بسیکھ   ہوں تجھ دیکھو تو مجھ دیکھ

خیال ۔

کیسیں کی کروں تو من چنچل تو کہوں کہو ڈولی   او دو نگ بات کرت رہے یا ہے کاج بنولی
اننگ للاری لکھی تو تیتی میٹی لیک کا نٹھ کو کھولی   جے ستہر جنینے بدھنا تن کی سرا کلو ۔ بی

(سادرہ) جہانگیر اور خرم کی جنگ کے وقت کہا ۔

اے لے بھائی جیتا مصاف ساہن سر تاج   جس ری تو ملا نت نت راج

خیال برائے شفا ۔

اگر گرو ۔ کچھو جیت نہ دہری ۔ جنیں ان پر اوہ اپرادہی کرے
مہا چھین رد گی کی بیدن ۔ اپنی مہا تمیں کہن میں ہرے

خواجہ خضر کے لیئے ؎

دائم حیات کائم کرامات ملاکات نعمت پاؤ نہم
ندی نیر درم بہاری بہیر نکر مربت ہو تہاں تہائی رم پرم
رحم کیجے کرپا ہمیں دیجیے کا کسوں زادری ہم
تم کہو اجہ کہدر وسے مہتر الیاس رہ دو دپاس جگت میں اگم

دائے طلب بقائے سلطان الاولیا ؎

ہاری کاج تمہاری ہواتیں دکھ کہو کرہ بھیتر دہ ۔ آج بھاگ جاگ پڑے ہمارے پرسن درسن پاوت تیرہ
سندہ سہ انندسے جہاں چڑھ کے سیہ موش گیوسو ہردہ ۔ تیرپت بھئی تپت سب ناسی اولیا چرنوں لگ ٹھوکر

بارش بند ہونے کے لیے ؎

اب من مانوری بدرا نیکی بھانت برنجراؤ نیو ۔ نیکی میں گٹالی آتو ینگھیں گرج سنا ہو
نیکھیں نیکھیں تین تور ہنس رہس جھڑ لا یو

ان سے دو بت داس گنہوں برا گی نے اپنی وفات کے وقت شیخ کی خدمت میں ذیل کا پد بھیجا تھا ؎

اے من نام پائیں اتیں تھیں دکھ سکھ بھائے ۔ یہ جو کچھ کو سپنو سو دیکھت جارے رہے یہ جائے
جے بچن ست کرن کی ہے تی میں کہی سنائے
داس گہنوں جیوں جل ترنگن جل میں جل ہو جائے

مولانا محمد افضل جھنجھانوی یا پانی پتی

میرٹھ کے قریب جھنجھانہ یا جھنجھ ایک پرانی بستی ہے۔ عہد ماضی میں ایک مردم خیز خطہ تھا اور بعض مشاہیر وہاں سے پیدا ہوئے ہیں۔ شیخ عبدالرزاق اور شیخ عبدالقادر متوفی سنہ ۹۴۲ھ جو مشہور اہل اللہ ہیں اس بستی سے تعلق رکھتے ہیں اور شیخ صوفی دانش مند جنھوں نے علوم ہند سے تحصیل کر کے ان کے تراجم اکبر کے لیے فارسی زبان میں کیے۔ اسی قصبہ کی گود میں پلے تھے۔ محمد افضل کا شمار اسی سرزمین کے نونہالوں میں کیا جاتا ہے۔

ہم ان کے حالات سے قطعاً تاریکی میں ہیں بس اسی قدر جانتے ہیں کہ ایک دوازدہ ماہہ یا بکٹ قصہ کے اردو میں مصنف ہیں۔ میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں محمد افضل۔ افضل تخلص از قدیم است کدام ہندو۔ بچہ گوپال نام بود کہ برو عاشق شدہ حسب حال خود بارہ ماسہ عرف بکٹ کہانی گفتہ اکثر کھتریان دگا بیا [illegible] مشتاق ادمی باشند نصفے فارسی نصفے ہندی دارد لیکن قبولیت داد الہی برد الہی برد لہا اثر می کند از دست۔

پڑی ہے گل میں میرے ہیم پھانسی مرن اپنا ہے اور لوگوں کی ہانسی
مسافر سے جنھوں نے دل لگایا انھوں نے سب جنم روتے گنوایا

ان کے زمانہ کی نسبت اسپرنگر نے اپنی فہرست میں محمد قائم چاندپوری کے تذکرہ کے حوالہ سے اتنا لکھا ہے کہ:۔

افضل عبداللہ قطب شاہ سے جو سنہ ۱۰۲۰ھ میں تخت نشین ہوتا ہے بیشتر گذرا ہے۔ اسکی تعلیم معمولی حیثیت کی تھی صوفیانہ شعر کہتا تھا

اور ایک بکٹ کہانی لکھی ہے۔ جس کا ایک نسخہ انڈیا آفس کے
کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

قائم نے افضل کا جو زمانہ دیا ہے اس میں بظاہر ایک غلطی معلوم ہوتی ہے
وہ یہ ہے کہ عبداللہ قطب شاہ درحقیقت سنہ ۱۰۲۵ھ میں تخت نشین ہوتا ہے۔ سنہ ۱۰۲۰ھ
میں جو محمد قطب شاہ کی تخت نشینی کا سال ہے۔ اسکی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ یا
تو قائم نے محمد قطب شاہ کے نام کے بجائے عبداللہ قطب شاہ یا سنہ ۱۰۲۵ھ کی جگہ
سنہ ۱۰۲۰ھ لکھ دیا۔ یہ امر بھی تعجب خیز ہے کہ قائم محمد افضل کے زمانہ جو خود
اسکے اپنے بیان سے ایک ہندوستانی شاعر ہے۔ ایک دکنی بادشاہ کے عہد کے
ساتھ مصناف کر رہا ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دہلی میں رائج ہونے
سے پیشتر اردو شاعری چونکہ دکن کی سرزمین کے ساتھ وابستہ تھی۔ اس لیے
ہمارے تذکرہ نگار اپنے ذہن میں غیر دکنیوں کو بھی دکنی ہی تصور کر لیا کرتے
ہیں۔ چنانچہ شیخ سعدی کو جو ہندوستانی ہیں دکنی فرض کر لیا گیا ہے۔

علی قلی خاں والہ داغستانی نے اتفاق سے محمد افضل کا تذکرہ ریاض الشعراء
میں شامل کر لیا ہے جو ہمارے شاعر کے حالات پر بالکل مختلف روشنی ڈالتا ہے
والہ کا بیان ہے کہ محمد افضل پانی پت کے باشندے ہیں۔ جو فضائل و کمالات
ظاہری و باطنی سے آراستہ اور عشق و نفرہ کی چاشنی سے شیریں کلام تھے۔ ہندی اور
فارسی میں نہایت اعلیٰ شعر کہتے تھے اور نثر نویسی میں مقبول خواص تھے۔ معلمی ان کا
پیشہ تھا اور طلبہ کی ایک کثیر تعداد ان کے حلقہ درس میں داخل تھی۔ بہتوں نے ان سے فیض
اٹھایا۔ بڑی عمر میں آکر کسی عورت کے دام عشق میں گرفتار ہو گئے اور ایسے وارفتہ
ہوئے کہ تمام زہد و عبادت و تقویٰ کو خیرباد کہہ دیا اور مسجد و مدرسہ کے بجائے کوچہ
دلدار کا طواف کرنے لگے اس عشق و وارفتگی کے ایام میں مولانا نے عاشقانہ نظمیں

کثرت کے ساتھ لکھی ہیں ایک غزل کا مطلع یہ ہے:-

عالم خراب حسن قیامت نشان کیست
در دہ گدام فتنہ گر است دزبان کیست

شدہ شدہ مولانا کے عشق و جنون کی خبر عورت کے رشتہ داروں کو لگ گئی اور عورت مفت میں بدنام ہو گئی۔ بےچاری نے باہر نکلنا ترک کر دیا حتیٰ کہ تہوار کے موقعوں پر بھی گھر سے باہر قدم نہ رکھتی۔ مولانا دیدار یار سے مایوس ہو کر کوچۂ یار میں اور بھی جم کر بیٹھ گئے۔ بالآخر عورت کے رشتہ داروں نے تنگ آ کر اسے متھرا اپنے عزیزوں کے پاس بھیج دیا۔ جب حضرت کو معلوم ہوا کہ ان کا مطلوب متھرا بھیج دیا گیا ہے۔ روتے پیٹتے اس طرف کا رخ کیا اور متھرا پہونچ کر تلاش یار جاری کر دی۔ تقدیر سے یہ عورت اپنی سہیلیوں کے ساتھ باہر سیر کو گئی ہوئی تھی سامنے سے قبلہ مولانا تشریف لا رہے تھے آپ دیکھتے ہی آگے بڑھے اور یہ شعر پڑھا۔

خوشا رسوائی و حال تباہے مرا نیست و آہے نگاہے

خدا جانے وہ عورت ان کے شعر کا مطلب سمجھی یا نہیں لیکن اس نے مولانا کو بڑی گرما گرم داد دی۔ طیش میں آ کر کہا "مولوی تجھے شرم نہیں آتی کہ منہ پر سفید داڑھی لگا کر ایک جوان عورت کی محبت کا دم بھرتا ہے" مولانا شرمائے تو بہت لیکن عشق کا بھوت ان کے سر سے نہیں اترا۔ پری کو شیشے میں اتارنے کے لیے فریب کا ایسا جال تیار کیا جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا یعنی داڑھی منڈوا دی۔ زنار گلے میں ڈالی اور برہمن کا بھیس بدل کر ایک مندر کے پجاری کے شاگرد بن گئے دن رات برہمن کی سیوا کرتے۔ اور علوم ہندی کی تحصیل میں مشغول رہتے۔ آدمی تھے ذہین تھوڑے ہی دنوں میں ہندی میں حیرت خیز ترقی کر لی۔ برہمن نے انھیں مندر میں اپنا نائب مقرر کر لیا۔ کچھ عرصہ کے بعد برہمن کا انتقال ہو گیا۔ مرتے وقت انھیں

اپنا جانشین مقرر کر گیا۔ مولوی نے چند ہی روز میں عوام کے قلوب پر ایسا اثر ڈالا کہ سب ان کا کلمہ پڑھنے لگے۔ اس مندر میں سال میں ایک مرتبہ میلا بھرا کرتا تھا جس میں مستورات بھی خاص طور پر شامل ہوا کرتی تھیں۔ جب میلے کا دن آیا اور عورتیں نذر و نیاز لے کر جوق جوق پوجا کے لیے مندر میں داخل ہونے لگیں۔ مولانا کی محبوبہ بھی نذر لے کر آئی اور جب اپنی باری میں مہاراج کے قدم چومنے کے لیے جھکی۔ آپ نے اس کو روک دیا اور کہا کہ ہمیں بھی پہچانتی ہو۔ عورت نے سر اونچا اٹھایا۔ مہاراج کو نگاہ غور سے دیکھا اور پہچان گئی۔ لیکن یہ امر اسکے فہم سے باہر تھا کہ ایک مسلمان مولوی ہندو مندر میں بیٹھ کر پوجا کرا سکتا ہے سہمی اور گھبرائی ہوئی ان کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی بالآخر بولی کہ آپ نے مجھ جیسی ناکارہ عورت کے لیے بیحد مصائب برداشت کیے ہیں گزشتہ آنچہ گذشت لیکن آیندہ کے لیے وعدہ کرتی ہوں کہ میں آپ کی تابعدار بن کر رہوں گی۔ آخر وہ عورت مسلمان ہو گئی۔ اور مولانا کی اہلیہ بن گئی مولانا نے ۱۰۳۰ھ میں انتقال کیا۔

میں والہ کے اس بیان کو میر حسن کے بیان پر ترجیح دیتا ہوں اس لیے کہ اول تو والہ میر حسن سے اقدم ہے۔ دوسرے محمد افضل اپنی بکٹ کہانی کے خاتمہ میں یہ شعر لاتے ہیں

بیا دلربا خوش حال می باش ۔ گیے افضل گہے گوپال می باش

میر حسن کے نزدیک گوپال اس ہندو بچہ کا نام ہے جس پہ مولانا عاشق تھے اسی توجیہہ سے یہ شعر بے معنی بن جاتا ہے۔ میری مراد آخری مصرعے سے ہے۔ والہ کے بیانات کی روشنی میں گوپال خود مولانا کا نام قرار پاتا ہے یعنی ان کی زندگی کے اس واقعہ کیطرف اشارہ کرتا ہے جب وہ برہمن بن کر مندر کے پجاری بن جاتے ہیں اور گوپال نام اختیار کر لیتے ہیں اس شعر کے معنی بالکل روشن ہو جاتے ہیں۔ قائم کا بیان ہے کہ افضل عبداللہ قطب شاہ کے دور سے پہلے کے آدمی ہیں۔ والہ کا بیان اس کا بھی موید ہے یعنی

عبداللہ قطب شاہ ۱۰۳۵ھ میں تخت نشین ہوتا ہے اور افضل اسی سال انتقال کرتے ہیں۔

ہمارے مورخین کا عقیدہ ہے کہ شمالی ہند میں اردو شاہی ولی کی آمد اور محمد دور تک وجود میں نہیں آئی تھی لیکن محمد افضل کے دوازدہ ماہہ کی موجودگی میں ہمیں اس عقیدہ میں ترمیم کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ محمد افضل ہی پر کیا منحصر ہے، اگر باقاعدہ تلاش کی جائے تو افضل کے ساتھی اور بھی ملیں گے۔ ہمارا خیال ہے کہ اردو میں تالیف و تصنیف ہند کے ہر صوبہ میں کسی نہ کسی شکل میں ضرور موجود تھی یہ اور بحث ہے کہ وہ لوگ ولی کے روزمرہ میں نہیں لکھتے تھے یا جذبات میں فارسی کے متبع نہیں تھے اور ہندی طرز میں لکھتے تھے ان کے اوزان ہندی تھے اور عورت کی طرف سے خطاب ہوتا تھا۔ بہرحال ملک میں اردو مسائل لکھے جانے کا رواج تھا، غیر تعلیم یافتہ طبقہ میں یہ تالیفات مقبول تھیں۔ مذہبی مسائل۔ قصے۔ تصوف کے مسائل۔ تعویذ۔ گنڈے اور وظائف بلکہ منتر جنتر تک اس میں موجود تھے لیکن آج یہ چیزیں ہماری نظروں سے کیوں نہیں گذریں اسکی سب سے بڑی وجہ ہماری وہی ناقابل معافی بے پروائی ہے جس کے اثر میں ہم نے اسلاف کے علمی و دماغی کارناموں کے ساتھ نہ صرف بے رحمانہ بلکہ مجرمانہ سلوک روا رکھا ہے۔ شکسپیر اور ملٹن۔ گولڈ اسمتھ اور تھیکرے کی آندھیوں نے ہمیں اندھا کر دیا ہے۔ ہم انگریزی ادیبوں اور شاعروں کے حالات سے واقفیت رکھتے ہیں لیکن اگر واقف نہیں ہیں تو اپنے وطن کے باکمالوں سے۔ انگریز اور انگریز پرستی کی لہر ہم میں اس قدر دوڑ گئی ہے کہ ہم اپنے وطن کی ہر شئے سے نہ صرف احتراز کرتے ہیں بلکہ نفرت کرنے لگے ہیں۔

محمد افضل کی بکٹ کہانی درحقیقت ایک بارہ ماسہ یا دوازدہ ماہہ ہے جس میں ایک فراق دیدہ عورت اپنے خاوند کی جدائی میں اپنی سکھیوں یعنی سہیلیوں سے خطاب کر کے اپنی جدائی اور درد جدائی کی داستان الم سناتی ہے جیسا کہ ہمارے

ملک میں بارہ برسوں کا دستور ہے۔ ہر ہندی ماہ کے عنوان کی ذیل میں اپنا قصہ غم ایک دل گداز پیرایہ میں دہراتی ہے۔ اسکی زبان دکنی سے بہت مختلف ہے اور صاف ہے اس نظم میں فارسی بندشیں اور ترکیبیں جا دبے جا رندھی گئی ہیں یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو دکنی سے غیر حاضر ہے ایک مصرع کی بندش آدھی فارسی میں ہے اور آدھی ہندی میں حتیٰ کہ افعال و ضمائر فارسی سے بھی بے تکلف کام لیا گیا ہے اور بعض امثال یہاں نیز درج کرتا ہوں۔

چہ سازم ہیچ کسے کن پکاروں جتن کیا ختی کے غم کا پچاروں

دیگرسہ

جنوں دہ ملک جاں جھنڈا گڑایا سمجھ اور بوجھ کا تھانہ اٹھایا

دیگرسہ

چہ شد مدت پیائے سنگ رہتے مرم بایک دگر کہتے و سنتے

دیگرسہ

چہ می بینم کہ منگل گاوتی ہیں مرے گھر ناریاں سب آوتی ہیں

ذرا ضمائر متصلہ کے استعمال ملاحظہ ہوں۔ مع

"نہیں جز وصل کا سو کھا ہمالم" (دیگر) کہوں کیا اب مکانش باگہہ لیتا
دیگرسہ لے آکر بیٹھے جانم جلن سوں

بلکہ فارسی کا اثر اس سے بھی زیادہ گہرا ہے۔ یعنی لفظ "دھوم" ہندی کا ہے اس پر با قاعدہ فارسی شین اضافہ کرکے حاصل بالمصدر دھومش بنا لیا۔

اٹھا کر کھر بیٹھے دھومش مچائی متاع صبر تسکین دل لوٹائی

فارسی کا ایسا اثر میر جعفر زٹلی کے ہاں بھی بہت غالب ہے اس قدر فارسیت کے باوجود یہ نظم جذبات کے لحاظ سے بالکل ہندی ہے اس میں ہندوانہ زندگی

مرقع پیش کیا گیا ہے حتیٰ کہ ہندو تہواروں۔ ہولی۔ دوالی۔ بسپرہ کا مع ان کے لوازمات کے مذکور ہے۔ ہولی کے گیت گائے جاتے ہیں۔ رنگ کی پچکاریاں ہاتھوں میں ہیں۔ دف۔ اور مردنگ بجائے جاتے ہیں۔ سرمنڈل پھڑک رہا ہے گلال اور عبیر اڑایا جارہا ہے۔ دوہرے اور غزلیں گائی جاتی ہیں۔ جوگن کا بھیس برہمن کی پوتھی اور پیہا پیہا پیہا کی پکار لگاتا ہے۔ جوگن کا بھیس۔ برہمن کی پوتھی دیکھنا۔ ٹوٹکے کرنا وغیرہ یہ تمام ہندی جذبات ہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ محمد افضل کی یہ نظم ہندوؤں میں جیسا کہ میر حسن کا بیان ہے زیادہ مقبول رہی۔

از دوازدہ ماہ محمدؐ افضل

سنو سکھیو بکٹ میری کہانی | بھئی ہوں عشق کے غم سوں نمانی[1]
نہ مجھ کو سوکھ دن نہ نیند راتا | برہوں کی اگن سیں سینہ جراتا
تمامی لوک مجھ بورنی کہیں ری | خرد گم کردہ و مجنوں کہیں ری
نہیں اس درد کا دارو کسی کن | بھئے حیراں سبھی حکمائے ذوفن
ارے جس شخص کوں یہ دیو لاگا | سیانا دیکھ اوس کوں دور بھاگا
ارے یہ ناگ جس کوں ڈنک لاوے | پنا دے کا درد جیورا لکواوے
ارے یہ عشق ہے یا کیا بلا ہے | کہ جس کی آگ میں سب جگ جلا ہے
کہ جس کے بیچ یہ آتش پری ہے | وہی دن رین سسکت ہے سر برے
وہی جانے کہ جس کے تن لگی ہے | برہوں کی ایک تن من میں لگی ہے
پرائیکی نہیں جس شخص کوں پیر | چہ داند درد دیگر را اسیر

---

[1] بھئی ہوں۔ ہو بادلی

پھٹی پوری برہوں بیر اک سہتی　　جلے جیو دا مرانت آک سیتی
چہ سازم چوں کنم کس کن پوکاردں　　جتن کیا عشق کے غم کا پچا ردوں
نہیں یکدم مجھے دن رین میں چین　　اندھیری ہو چلی رو روتے مری نین
جنوں دل ملک جاں جھنڈا اگڈایا　　سمجھ اور بوجھ کا تھانا ادھایا
اوٹھا کر کہر مینن دھومتس مچا ہی　　متاع صبر تسکیں دل لوتا ہی
گیا مجھ دستگیر آں شاہ بیداد　　چہ سازم چوں کنم فریاد، فریاد
پیالہ حسن کی مے کا پلایا　　کیا بے خود مجھے سوں بھولایا
گدا ہو کر پھروں گھر گھر و بازار　　کبھو ہو وے کہ پالوں بسکھ[1] دیدار
بہت مدت کہی کر نے گدا ہی　　پیا کے وصل کی تب بسکھ[2] دیدار
پیا نے کو بکڑ ما کر سوں لگا ہی　　تمامی آگ تن من کی بجھائی
جو شد مدت پیا کے سنگ رہتی　　مریم بایک دگر سنتی و کہتی
چہ حیلہ عشق نے برمن ادھایا　　فلک دشمن مری پاچھیہ لگایا
مراسکھ دیکھ اوس کوں حسرت آہی　　نہادہ بر دلم داغ جدائی
بخت قصہ بنت مشکل کہانی　　دیوانی کی سنو سکھیو کہانی
ملن پا پاچھی[2] بچھڑ ناں کٹھن ہی　　کہو اب زندگی کا کیا جتن ہی

ساون

چڑا[3] ساون بجا مارو نکارا[4]　　سجن بن کون ہے ساتھی ہمارا
گھٹا کاری اوندھ چھاتی سوں آہی　　برہوں کی فوج نے کین چڑاہی[5]

---

۱ جھبک۔ ۲ پیچھے۔ ۳ چڑھا۔ ۴ نقارہ۔ ۵ چڑھائی۔

پپیہا پیہ پیہ نس دن پوکارا | پوکارت دادرو جھنگر جھنکارا
اری جب کوک کوئل بین سوناہی | تماچی تن بدن میں آگ لاہی
اندھیری رین جگنو جگ مکاتا | اری جلتی اوپر نین کیا جلاتا
سونی جب مور کی آواز بن سوں | شکیب از دل شدہ آرام تن سوں
پھٹی جل تھل ھیما سرسبز عالم | نہیں جز وصل کا سوکھا نہالم
ہندولی جھولتی سب نار پیہ سنگ | حسد کی آگ نی جارا مرا انگ
چلا ساون دگر ساجن نہ آہی | اری کن سوکنی تو نی چلاہی

بھادوں

سکھی بھادوں تپت بھوتی پڑی ہا | تمامی تن بدن میرا اجری رہی
مسہ بادر جہاروں اور چھائیں | لیا جھجھ گھیر پیہ[1] اچھونیائیں
پھورن برنی تھی اوز رعد[2] کرجا | تمامی تن بدن جیو جان لرجا[3]
کہتا کاری کی اندر بیچ چمکی | جری جیہورا کن سوں دیہہ لرجی
اکیلی دیکھ نس کاری ڈرادی | تمامی رین دن برہوں ستادی
پیا پردیش جا ہم کون بسارا | نخانوں کیا کنہ دیکھا ہمارا
کتھا غم کی اومد چھاتی سوں آہی | اری دو نین تیں برکھا لگاہی
اری نس دن بتاؤ پوچھ ہاری | خبر پیہ[4] کی نیسا ہی ہائی ہاری
جری پوتھی باہمن سب مرگئی رہی | پھٹی کرکاک اود تھک رہی رہی
کہو پیہ کی خبر پوچھوں کے جاری | لکھوں پتیاں کسی دیوں ہاری ہائی

---

۱ پیہ ۲ رعد۔ ۳ لرزا ۴ پیہ۔

خدارا اے صبا ہیں حال میرا | پیا کوں کہوں[1] کری یک یک پیرا
دہل رحلت کا بھادوں نے بجایا | اجھوں لگ ساودا پردیس چھایا

اسوج

سنو سکھیو کہ رت آسوج آہی | پیا رے کی خبر اب لگ نیا ہی
کہو کیسی جیوں بہیہ پاچھ ناری | جنہیں رہنی کتی ہی عمر ساری
لکھوں پتیاں ارے اے کاک لیجا | سلونی سانوری مسندر پیا یا
کنا کت جب پیارا پہیہ آدی | تو جہی دیکھی مہر کر کی بولا دی
سلام از طرف این غمخوارہ کیجو | پگن کوں پرس پاتی اناتھو دیکھو
اری یہ کاک باتیں سو کہو نہ مانی | مرم دل دیہ مندروں کا بجانی
پیا بن سیج رہی ناگن پھنی رہی | ہنس کھیلیں کی سب سو دہ بودہ کی رہی
دہسرا[2] پو جنی کہر کہر سکھی رہی | کرم میری نہ بجانوں کیا پری رہی
اری سبز ک پیا کے باغ جا کر | اپسکوں[3] تجھ بے وفا سمجھتی لو کا کر
کہو اری سنگدل تب مجھ دکھا یوں | تیری مکھ سے اگر آگے تو ل پاؤں
کہ گھر جا بر ہنی کوں گل لگا دو | پکڑ بنہا پلنگ اوپر بنہا دو
کرنیری پر ہوں سین دین رین رو دے | بغم بہہ جو بنا تجھ باجھ کھو دے
تم اور ان سیں پیاری سو کھ کرت ہیں | ہمن سی برہنی سو دکھ بھرت ہیں
دیا پردیس جا سو کن کھیں راج | پھولا یا کہر نہیں تجھ نین میں لاج
تو جہی اے سنگدل کیسی پوی چین | جزی جت آہ سوں جل بھل دے دادیں

---

[1] کہو۔ [2] دسہرہ [3] خود کو۔

ارى ظالم نہ ادى خوب رب كا — قيامت ہى گھرى كر فكر تب كا
دراكر توں ز آه درد مندان — كه موسوز دا آہش سنگ دندان
سكھى اس سوچ ميں سب عمر جاتى — بجھيّا غم پيارى كا سناتى
كه ہوئے جلائے كو ہى اس سجن سول — سنى دل سوں كبھى ديكھى ہمن كوں
سكھى آ سوچ دت چلتى رہى رى
پيا بن برہنى جلتى رہى رى

محبوب عالم عرف شیخ جیون

شمالی ہندوستان میں محمد افضل کی تحریک اردو نظم میں کسی تنہا واقعہ کی کڑی نہیں ہے بلکہ بعد میں اور لوگ بھی اسکی تقلید کرتے ہیں۔ یہ تحریک پہلے پہل ہریانی زبان میں شروع ہوتی ہے جسے اجانب بانگرو کہتے ہیں۔ ہریانی زبان مشرق میں اردو شمال میں اردو اور پنجابی مغرب میں پنجابی و جنگلی اور مشرق راجستانی زبانوں سے محصور ہے جو دادری۔ فتح آباد۔ جھنگ۔ ہانسی۔ حصار۔ کلانور۔ رہتک۔ گھانا۔ نارنول وغیرہ شہروں میں کسی قدر اختلاف کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ اس علاقہ کا مغربی حصہ بالکل غیر آباد تھا لیکن فیروز شاہ نے دریائے جمنا و ستلج سے نہریں کاٹ کر نئے شہر آباد کر کے اس کو بہت سرسبز بنا دیا تھا۔ اس سرزمین میں جھجر کو بھی شامل سمجھنا چاہیے۔ ہریانی زبان اردو سے نہایت ہی قریب ہے کیونکہ دہلی کے قرب جوار سے ان اطراف میں مسلمانوں کے اثرات ہمیشہ غالب رہے ہیں۔

شیخ جیون گیارہویں صدی میں پیدا ہوتے ہیں ان کے حالات زندگی سے ہم ناواقف ہیں۔ اس قدر معلوم ہے کہ سید میران بھیکھ چشتی صابری متوفی ۱۱۴۱ھ کے مرید اور

خلیفہ تھے چنانچہ ان کے خلفا کی فہرست میں شیخ جیون کا نام بھی ملتا ہے اسپرنگر نے
شیخ جیون کی مصنفات کے مفصلہ ذیل نام دیے ہیں۔

۱۔ فقہ ہندی ۲۔ محشرنامہ۔ ۳۔ دردنامہ۔ ۴۔ خواب نامہ۔ ۵۔ دبیر نامہ
بی بی فاطمہ خاتون۔ ان میں سے نمبر اول فقہ ہندی شیخ جیون کی تصنیف نہیں
ہو سکتی اسکے مالک، کوئی ہندی ہیں جو پنجاب سے علاقہ رکھتے ہیں۔

یہاں صرف دردنامہ کے مختصر سے تبصرہ پر قناعت کی جاتی ہے۔ دردنامہ
ایک بڑی کتاب ہے جس میں پونے تین ہزار کے قریب اشعار ہیں۔ اسکی زبان۔
رائج الوقت اردو سے بہت مختلف نظر آتی ہے۔ لیکن جس وقت یہ کتاب تصنیف
ہوئی ہے اس وقت اسکی اور دہلی کی زبان میں بہت کم فرق ہوگا۔

سب سے بڑا فرق اسکی ماضی، مستقبل اور مضارع کے صیغوں میں ہے
جہاں یہ زبان اردو راجستانی دونوں کی تقلید کرتی ہے۔ مثلاً۔

عرض اور بھی ہم تجھ سے رکھاں کہاں نانہ تجھ سے تو کس سے کہاں

اردو میں ایسے موقع پر رکھیں اور کہیں لاتے ہیں۔ اور یہ شکل بھی ہریانی
میں موجود ہے اسی طرح ماضی کی مثال:- مصرع

تمھیں میرے پیچھے بہت دکھ پڑاں (یعنی پڑے)

اردو کی لام ہریانی میں رے سے اور ڑے ڈال سے بدل جاتی ہے۔
تلوار۔ تردار۔ ڈال۔ ڈوڑ۔ پڑھیں گے۔ بڈھیں گے۔ بڑائی۔ بڈائی۔
گڑا۔ گڈا۔ پڑھنا۔ بڈھنا۔ چڑھنا۔ چڈھنا۔

الفاظ میں حرف دوم بہت نمایاں ہے۔
رکھ۔ راکھ۔ بکری۔ باکری۔ کل۔ کالھ۔ دکھ۔ دوکھ۔ اکٹھی، ایکٹھے
لگا، لاگا، اتر، اوترا۔

غنہ کثرت سے مستعمل ہے۔

نے ۔ نین ۔ تو ۔ توں ۔ کوچ ۔ کوپخ ۔ پچاس ۔ پنچاس ۔ سنی ۔ سنیں ۔ کو
کوں ۔ مانے ۔ مانیں ۔

ہائے مخلوط التلفظ بہت مواقعوں پر خارج کر دیے گئے ہیں۔

بھی ۔ بی ۔ ابھی ۔ ابی ۔ جبھی ۔ جبی ۔ باہر ۔ بار

دردنامہ کا افتتاحیہ ہے۔

بسوں من پہل نام رحمن کا　　پتوں میں گیان میں دھیان سجان کا
صحی ایک کرتار وہ پاک ہے　　گھڑا جس کی قدرت سے افلاک ہے
وہی ہے جو کرتار عالم خدا　　نرنجن نرنکار سب سے جدا
جنے ایک پلک میں کیا یہ جہاں　　وہی توڑ دے پھر خودی اور گمان
کیا جن تکبر وہی پاک سے　　پڑا عاقبت خاک پر ناک سے
تکبر سے شیطان رانا گیا　　فرشتے سے وہ دیو دانا گیا
تکبر خودی کی تھی نمرود نیں　　براہم نبی سے جو مردود نیں
دیا مغز بیچ ڈانس جب کیا نبی　　لگی لاکھ پاپوش سر پر گھنی
بنایا ارم بہشت شداد نیں　　لگائے بہت درم برباد نیں
چلا بہشت کوں دیناں کر نداں　　غضب کے فرشتے میں کھنچے پران

فارسی اور عربی الفاظ کے استعمال میں مصنف ان کے اصلی تلفظ کی پروا نہیں کرتا بلکہ مقامی لہجہ میں لکھتا ہے مثلاً فاطمہ کو فاطماں اور طلاق کو تاک لکھتا ہے اور پاک اس کا قافیہ ٹھہراتا ہے۔ پلک کا قافیہ شوق لایا ہے۔ عکرمہ کو عکرماں لکھ کر اگر ماں کا ہم قافیہ بنایا ہے۔ ہراول کو ہر دل اور گرز کو گرج اور ہیچ کو ہچ لکھتا ہے۔

محبوب عالم کے کلام میں خاصی چستی اور روانی نظر آتی ہے۔ بیبی واقعہ واحد کے چند

اشعار یہاں نقل کرتا ہوں۔

ہوئے پھر مقابل قریشیوں کے تب   نبی اور اصحاب یک بار سب
عکاسہ طرف داہنی کول کھڑا   ابو سلمیٰ بائیں طرف پر پڑا
کیا سعد وقاص عبید امیر دل   کیا اور مقداد کوں جب چنڈ دل
ہوئے آپ درمیاں کی فوج میں   نبی خاص مقبول رحمان ہیں
کھڑی فوج کفار کی بھی طیار   کرے داہنی خالد آ کر پوکار
اطرف بائوے کے جب عکرماں   کھڑا تیر تروار لے اکڑ ماں
مقابل ہوا عمر سفیاں شتاب   چلا اور ہشیار بیچ عتراب
ہوئی صف جو دونوں طرف سے تیار   پوکارے چھپوں طرف سے مار مار
ترنکوں کی پھر جنگ کھینچی لگام   بجی ڈنگ لے میں جنگ کی دھوم دھام
دھاد بھلم لگا گم ہوئی بھیر کر   لیا ایک نے ایک کوں گھیر کر
کہیں برچھیاں ترچھیاں ہاتھ میں   ہوئے مرد کی مرد جب گھات میں
کرے سیل کی ریل اوت کھیل کر   لیا مرد نیں مرد کو بیسل کر
ستیا تھپ چلے تیرے تیر زور   کھپا کھپ ہوئی پار بجوہ چھوڑ
لگے گرج بھاری گرج شور کر   کمر توڑ ڈالی نیٹ زور کر
پٹی دھار تلوار آوت آبدار   جیسے پار صابن ہوئے لوہ تار
لڑائی گھٹی اک قیامت اٹھی   قیامت کرے اس بات چھاتی پھٹی
کہیں مست گھومیں صحابی کھڑے   کہیں گھاؤ کھائے قریشی پڑے
مسلماں اصحاب تیغ تیز کر   لیا مار کفار کوں چیر کر
گئے بھاگ کافر چلے کھائے ڈر   اوٹھی (کذا) گیت جب تا ریاں گا ئیکر

رسول اللہؐ کی وفات پر مصنف نے حضرت عائشہؓ و حضرت فاطمہؓ و شیخین کی طرف سے

مرثیے لکھے ہیں جو بالکل غزل کی شکل میں ہیں لیکن وہ انہیں دوہرے کہتا ہے چنانچہ حضرت عائشہؓ کا دوہرا حسب ذیل ہے ؎

سکھ چین کے گھر سودتی لاگا کلیجے تیر اب — دکھ نین بھر بھر رو دتی بھارہی پڑی ہیر اب
رو رو کروں ہاہوں زاریاں کون سناؤں حال یہ — کیا ہی لگی آب حرم کی دیہی گئی ہے چیر اب
جانی بنا کوئل بھی جیہ جری جو ل کو بلا — تن ماں لگی ہے لوکئی دل کا گیا دلگیر اب
نسدن پوکاروں ابکلی پیو بن سبھی تن بے کلی — آنسوں چھراں نادی بھرا نینو رہانا نیر اب
میری ہا ہوئی ہیں نین کٹ بنسی لگی ہے چہانجک — ترچھڑی ہی بیکل کھڑی کیسے دھرو نہیں دیر اب
پیو چاہ چاہیے جیو پیو بن نہیں کچھ جیونا — جبکوں تجوں ہیکوں بہر سانچی اکھی ہے پیر اب
پک پک پڑی تھک تھک گری ٹوٹا تنک ناہیں دہا — محبوب عالم نیہہ کی پاؤں پڑی زنجیر اب

حضرت عمرؓ کا دوہرا یہ ہے۔

محمدؐ یاد نا جو کوں پڑا دن رین کرلاؤں — کھڑا فریاد ماں کو کوں محمدؐ سا کہاں پاؤں
محمدؐ نیہہ کی پھانسی گئی گر مانہ سے ہانسی — گئی ہے ٹوٹ کر پھانسی کسے یہ حال دکھلاؤں
لگن لاگی نیٹ گاڑھی محمدؐ پیت نین یادہی — یہی ہے جیو ماں ٹھاوی محمدؐ نانونت گاؤں
محمدؐ کہہ محمدؐ کہہ پوکاروں میں سدا اللہ — پھروں گھر گھر یہی کہہ کہہ محمدؐ نانوں پہچاؤں
کروں ہاہا محمدؐ بن سبھوں بھا پڑا نس دن — گئے سب چین ہر دم میں کسے دکھ بات بتلاؤں
نہ سنگی ہے نکو ساتھی پھٹی اس درد ماں چھاتی — پھٹی تن کی سبھ ٹاٹی محمدؐ جو با جھ مین پاؤں

عجیب محبوب عالم تھا نہایت خوب بالم تھا
مرا نت پیت بالم تھا دہا ہے ہیٹ کس ٹھاؤں

میر جعفر زٹلی

پچھلے تذکرہ نگاروں نے ان کا ذکر کیا ہے اور اردو شعرا میں مانا ہے لیکن حال کے تذکرہ نویسوں نے ان کے نام پر پردہ ڈال دیا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے یہ کہہ کر ان سے دامن چھڑایا ہے کہ زٹل کا بھروسہ کیا۔ لیکن اردو کی تاریخ میں ان کے خاردار و داغدار مضامین کے باوصف میر جعفر سے اعراض نہیں کر سکتے اس لیے ہندوستانی اردو نگاروں میں ان کا نمبر بہت پہلے ہے ان کا اور ولی کا ایک زمانہ ہے۔ اس لیے دہلی میں ولی کے متبعین سے ان کا زمانہ اقدم ہے۔

میر جعفر اصل میں نارنول کے باشندے ہیں اور سید عباس کے فرزند ہیں جن کا پیشہ دوکانداری تھا۔ اورنگ کی تخت نشینی اور میر جعفر کی ولادت ایک ہی سال کے واقعے ہیں۔ ان سے پہلے دو بہنیں ہو چکی تھیں اور بعد میں ان کے چھوٹے بھائی صفدر ہوئے۔ میر کی کم عمری میں ان کے والد کے انتقال کا واقعہ پیش آیا۔ چچا کا نام میر سرور تھا سرپرستی کی۔ مکتب میں تعلیم پانے کے بعد ملازمت کی تلاش میں نکلے اور شہزادہ کامبخش کی فوج میں سواروں میں ملازم ہو گئے۔ چونکہ اورنگ زیب کا اکثر زمانہ دکن میں گزرا۔ اس لیے یہ بھی کامبخش کے ساتھ وہیں رہے۔ ان کا سال وفات کسی نے نہیں لکھا۔ لیکن ان کے کلیات مطبوعہ لکھنؤ ۱۲۸۵ھ کی ایک سرخی سے معلوم ہوتا ہے کہ فرخ سیر نے ان کو قتل کروا دیا تھا۔

میر جعفر فحش گوئی میں عبید زاکانی کے خلف ارشد معلوم ہوتے ہیں۔ کچھ تو طبیعت افتاد کچھ ایام کی مبتذل اخلاقی حالت نے ان کو اس رنگ میں رنگ دیا۔ ہجویں انھوں نے کم لکھی ہیں۔ اور وہ بھی ضرورتاً لکھی ہیں تاہم ان کی زبان درازی اور بیباکی

میں کوئی شک نہیں۔ ان کے قلم سے راجا سے پرجا تک کوئی نہیں بچا۔ وہ شہزادوں سے خائف تھے اور نہ خانوں سے جس نے انہیں چھیڑا، نقصان اٹھایا۔ مشہور توتلی ہیں لیکن کلام کو خداداد قبولیت حاصل تھی اسی لیے دنیا ان سے کنیاتی تھی ان کی زبان سے عورتیں بھی نہیں بچیں۔ عالمگیر نہایت ثقہ اور متین بادشاہ تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے اسکی انتہائی سنجیدگی اور متانت کی تلافی کے لیئے ایک ہی وقت میں دو زبردست ہزال اور فحش گو فارسی اور اردو زبانوں میں پیدا کر دیے۔ ایک یہی ان سطور کے موضوع اور دوسرا نعمت خان عالی۔

قمر النساء بیگم نے میر صاحب کو تیس روپے دیئے جانے کا حکم دیا۔ بیگم کے دیوان فتح علی خان نے پانچ روپے کرٹا لینا چاہا۔ میر صاحب اس پر بگڑ گئے۔ دیوان صاحب کی ہجو الگ لکھی۔ اور روپیہ الگ وصول کیا۔ خانجہاں خان بہادر کوکلتاش عہد عالمگیر کے مشاہیر امراء سے ہیں۔ میر نے ان کی خدمت میں قرآن مع ایک قصیدہ پیش کیا اور قرآن شریف کے ہدیہ اور قصیدہ کے صلے کے لیئے عرصہ تک منتظر رہے۔ لیکن کوئی نتیجہ مترتب نہیں ہوا۔ آخر میر نے تنگ آکر خان والاشان کی ہجو لکھی۔ ایک امیر نے ان کو پانچ اشرفیاں انعام دلوائیں۔ ان کے دیوان خدایار بیگ نے اشرفیاں دبا لیں میر کو خبر لگی خدایار پر برس پڑے۔ اس ہجو کے آخر میں فرماتے ہیں ؎

جو کوئی مجھ اوپر شفقت کرے — جگت بیچ اسکی خدا پت رکھے
نہ ایں ہجو از راہ حرص و ہوا است — دل آزار را ہجو کردن رواست
بیا جعفر اکنوں شکایت مکن — ز موزی و ماضی حکایت مکن

میر کے قلم سے عالمگیر کے فرزندوں میں کوئی بھی نہیں بچا۔ ان شہزادوں کی آپس کی رقابت نے دکن کی مہم کو ایک نہایت پیچیدہ اور کٹھن بنا دیا تھا۔ محمد معظم کی تعریف میں کہتے ہیں۔

نخستیں کلاں تر کہ برکھنڈ کرد — ہمہ کار د بار پدر دھنڈ کرد
چناں لوٹ شد بستی تبنگ نگر — نہ غد ما صفا ماند نہ مالدار
چہ ملکے بدست خود آورده داد — بگر از بخششں اساسے نہاد
جہاں ہوئے ایسا کلجھن کپوت — لگے خلق کے منہ کو کالک بھبوت

اور محمد اعظم شاہ کے حق میں کہتے ہیں سے

دگر شاہ اعظم ہمہ کند ور — بر سوائی اندا خت کار پدر
بکوشش دامن نہ خسوره ساختہ — بہ للو پتو کار در باختہ
فرستند انیاں پشپ پان پھول — ملا کر گیا کام سب خاک دھول
ازیں اختلافش کہ گیرد خراج — کہ دھنگ بھنگ گشت است للو کاراج

محمد اکبر کے لیے کہتے ہیں۔ (ع)

چہارم پسر ڈومنی کا جنا

خود شہزادہ کا بخشش پر بھی میر نے ہاتھ صاف کیا۔ خیریت اسی میں گزری کہ نوکری سے موقوف کر دیے گئے۔ میر اپنی غلطی کو مانتے ہیں اور پشیمان ہیں۔

از ہجو آں سلطاں خود کردی پریشاں جان خود — در ماندہ بے بال و پر کہہ جعفر اب کیسی بنی
با بادشہ تین ہیر کی سر کی خدا نے خیر کی — تا حال ہم داہی حضد کہہ جعفر اب کیسی بنی
وہ ذوق ہر دم کا کہاں وہ عطر بیگم کا کہاں — در خاک شد آں کروفر کہہ جعفر اب کیسی بنی

عالمگیر نے "امجد خاں" کا خطاب امیر کو دیا۔ میر نے اس واقعہ کی تاریخ "خلل ملک" نکالی جس سے ۱۱۱۳ھ برآمد ہوتے ہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ میر اورنگ زیب کا ہمیشہ نہایت ادب سے ذکر کرتے ہیں۔ اسکی زندگی میں نیز وفات کے بعد بھی اس کا احترام کرتے رہے۔ اگرچہ ایک آدھ جگہ اس کو للو کہہ گئے ہیں تاہم کوئی ہجو مقصود نہیں ہے اسکی وفات پر ہندوستان کا نقشہ بگڑا ہے اور رعایا پر ایک عالمگیر بے اطمینانی اور پریشانی

چھائی ہے۔ اسکی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں ؎

کہاں اب پایئے ایسا شہنشاہ ۔ مکمل اکمل وکامل دلی آگاہ
رکت کے آنسوؤں جگ روتا ہے ۔ نہ میٹھی نیند کوئی سوتا ہے
صدائے توپ و بندوقت است ہر سو ۔ بسراسباب بندوق است ہر سو
دوا دوہر طرف بھاگڑ پڑی ہے ۔ بچہ در گود سر کھٹیا دھری ہے
کٹا کٹ و لٹا لٹ ہست ہر سو ۔ جھٹا جھٹ و پھٹا پھٹ ہست ہر سو
بہر سو مار و دھاڑ دھاڑ است ۔ اوچل چال و تبر خنجر کٹار است
ازاں اعظم وزیں سوئے معظم ۔ جھڑا جھڑ اادھڑ ادھڑ ہر دو پایم
ببینم تا خدا از کیست راضی ۔ بخواند خطبہ بر نام کہ قاضی

محمد معظم کے دور میں میر نے ایک رسالہ اخبار دربار معلیٰ کے نام سے لکھا ہے جس میں اول دربار کے فرضی وقائع بیان کیے جاتے ہیں اور پھر ان کے متعلق شاہی احکام صادر ہوتے ہیں۔ میر نے یہ شاہی احکام اکثر اوقات ضرب الامثال کی زبان میں ادا کر دیئے ہیں اسی طرح ہمیں کسی قدر اس عہد کی ضرب الامثال سے واقف ہو جانے کا موقع مل جاتا ہے میں بعض یہاں نقل کرتا ہوں اکثر وہی ہیں جو آج بھی رائج ہیں۔

(۱) چوم چھاڑا بھاری پتھر (۲) تجھے پرائی کیا پڑی تو آپ نبیڑ (۳) ہارا حاکم ضامن چاہیے (۴) اندھے کی جورو کا خدا رکھوارہ (۵) دم تو پکڑی۔ بھیڑ کی دارا ہوا نہ پارا (۶) باندر کے ہاتھ ناریل (۷) باسی رہیے نہ کوتا کھائے (۸) ٹکالا بنیا پنیری کا تولے (۹) ماں پر پوت پتا پر گھوڑا بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ (۱۰) بہرے آگیں گاؤنا اور گونگے اگے گل۔ اندھے آگیں ناچناں یہ تینوں ال بل (۱۱) دبی بلی چوہے پاس کان کترا وے (۱۲) گدھوں کھایا کھیت پاپ نہ پن (۱۳) داتا کی ناؤ پہاڑ چڑھے (۱۴) مارے متھر طباق سے

آگے دھر الکھائے (۱۵) ترت دان نہاپن (۱۶) اتہ کھلی میں سر دینا دھمکوں سے کیا ڈرنا (۱۷) کھاویں ہیویں محمود کے آدیں مسعود کے (۱۸) پاسا پڑے سو داؤ راجا کرے سو نیاؤ (۱۹) آٹا لمرط اور پوجا سٹہ کا (۲۰) جیا بوئے تیسا اولے (کذا) خارشتی کتا مخمل کی گدی اور اس پر بانائی جھول (۲۲) چار دن کا چاندنا اور پھر اندھیری رات۔

اس رسالہ کے متعلق ایک حیرت انگیز واقعہ یہ ہے کہ اس میں عالمگیر ثانی متوفی سنہ ۱۱۷۳ھ اور شاہ عالم ثانی متوفی سنہ ۱۲۲۱ھ کے زمانوں کے بعض واقعات درج ہیں۔ مثلاً احمد شاہ درانی، سورج مل جاٹ اور مرہٹوں کا دہلی میں استیلا وغیرہ اب یہ ناممکن ہے کہ میر عالمگیر کے جلوس کے سال سنہ ۱۰۶۹ء میں پیدا ہوکر بارہویں صدی کے اختتام تک زندہ رہیں حالانکہ ان کی عمر ساٹھ سے کچھ اوپر بتائی جاتی ہے جس حساب سے انھیں فرخ سیر سنہ ۱۱۳۱ھ کے زمانہ میں انتقال کرنا چاہیئے اس صورت میں یہی خیال کیا جا سکتا ہے کہ میر کے کسی فرزند معنوی نے میر کی وفات کے بعد بھی اخبار دربار معلی کو جاری رکھا۔

جب میر ملازمت سے برطرف کر دیئے گئے ان کا ملازم ان کا تمام اندوختہ لے کر بھاگ گیا میر نے اپنے دل کا بخار نثر میں اس طرح نکالا۔

"درعین وقت بیکاری وچنیں ناداری غی ازلی و متنفنی دیرینہ وحرملیفہ چگونہ نفرے بے پدرے ماچہ خرے فرصت دریافتہ متاع کثیر و قلیل راگرفتہ بگوشۂ خزید۔ قولہ تعالیٰ۔ یفعل اللہ ما یشاء و یحکم ما یرید مثل۔ ہوے پر سو درے۔ مثل جیسے کوڑھ میں کھاج۔ مثل بلکہ بے خرچی میں آٹا گیلا۔ بیا جعفر مجوشی و مخروبش بشنید کہ گفتہ اند"

جب فرخ سیر تخت نشین ہوا اس کے سکہ پر یہ شعر کندہ کیا گیا ہے

سکہ زد از فضل حق بر سیم و زر | پادشاہ بحر و بر فرخ سیر

میر کی طبیعت بھی جولانی پر آئی۔ آپ نے اپنے انداز میں اس سکہ کو یوں سجایا۔

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر | پادشاہ پٹہ کش فرخ سیر

میر تقی میر نے لکھا ہے کہ میر جعفر ایک روز میرزا بیدل کے ہاں گئے اور فتوح کی امید میں مصرعہ پڑھا۔

چہ عرفی چہ فیضی بہ پیش تو بخش

میرزا بہت برہم ہوئے اور دھکا دلوا کر نکال دیا۔

میر حسن بیان کرتے ہیں کہ میر جعفر ایک دن میرزا بیدل کے گھر گئے۔ بیدل اس وقت فکر شعر میں مشغول تھے۔ کچھ توجہ نہ کی۔ میر زیادہ انتظار نہ کر سکے پوچھا قبلہ وہ مصرع کیا ہے جس کے دوسرے مصرع کی تلاش ہے۔ بیدل نے کہا وہ مصرع یہ ہے۔ ع

لالہ در بارش داغ جنوں دارد

میر نے سنتے ہی بے تامل کہا۔ ع

چو بکے میرزا بر ..... دارد

بیدل بہت خفا ہوئے اور کچھ دے کر پیچھا چھڑایا۔

میر جعفر کے کلیات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زمانہ میں اردو اور فارسی میں گنگا جمنی پیوند دیئے جانے کا دستور تھا اور زبان کی وہ شاہراہ جو بتقلید دکن عہد محمد شاہ میں قائم ہوئی ہے اس وقت تیار نہیں ہوئی تھی۔ ان کا کلیات اگرچہ مختصر ہے تاہم اس میں ہم سیکڑوں عجیب و غریب الفاظ پاتے ہیں جو آج متروک ہیں۔ نقد و تحقیق شائقین پر انھیں نے بہت کم ہاتھ ڈالا ہے۔ لفاظی میں نظیر اکبرآبادی سے کم نہیں ہیں۔ ان کی طباعی اور زباندانی سے انکار نہیں کر سکتا۔ زبان اردو کا ایک بڑا ذخیرہ ان کے کلیات میں موجود ہے

میر اپنے تمسخر کی لہر میں اکثر اوقات ہندی الفاظ کو عربی بندش دیدیتے ہیں۔ مثلاً۔

"چوں گھڑگھڑاہٹ الرعد فی الغمام و کڑکڑاہٹ البرق فی الہوام برسر است و ہنگام گھٹا گھور صبح و شام شور ارد و مور بر دوام و آواں لرزۃ العمارت و گڑبڑۃ الکھنڈرات و ٹوٹ الچھپر و البوچھاڑ فی المنظر است و دل وسعت منزل علی اینچ پیچ و الکھیچ کھاچ کو چھائے چھیچھی آگیں آمرہ میوزد"۔ یا فارسی کے مطابق ہندی افعال کی تصریف کردیتے ہیں جیسے (۱) نہ ہلدنہ ٹلدنہ جلبدنہ جابد (۲) مثل تو نباشد بجہان اے شہ (۳) لنگندڑہ و ٹکنڈہ بر رفتار جو ہے سو۔

یہ طرز اور زبانوں میں بھی موجود ہے۔ طرزی نے اسے فارسی میں اختیار کیا ہے اور سولھویں صدی کے انگریزی شعرا کے کلام میں ایسے نمونے کثرت سے ملتے ہیں جن میں انگریزی اسما و افعال کو لاطینی زبان کی تصریف کے مطابق برتا گیا ہے۔ یہاں کسی قدر کلام کا نمونہ حوالۂ قلم کیا جاتا ہے۔

جو سکھ سیج راحت میں سدا راہ زہد طاعت میں ابھی بھی رہیگی ساعت میں کہ آخر خاک ہو جانا
جنھوں کے لاکھ تھے گھوڑے سدا زلفت کے جوڑا ہے انھوں کو موت نے توڑا کہ آخر خاک ہو جانا
جنھوں گھر جھولتے ہاتھی ہزاراں ان کی دن ساتھی تنھوں کو خاک میں لیتے کہ آخر خاک ہو جانا
جو جب موڑا کر چلتے عطر سب دیہہ پر ملتے دیکھو اب خاک میں لیتے کہ آخر خاک ہو جانا
جنھوں کے لال تھے ہیرے سدا مکھ پان کے بیڑے تنھوں کو کھا گئے کیڑے کہ آخر خاک ہو جانا
سدا جو پہنتے ململ محل میں باجتے مندل گئے وہ خاک میں رل مل کہ آخر خاک ہو جانا
جو کلغی باندھتے پاگاں محل میں رنگ اور داگاں وہاں ہیں بیٹھتے کاگاں کہ آخر خاک ہو جانا
جو لذت کا کھاوتے کھانا پہرتے ریشمی بانا انھوں کو موت نے جانا کہ آخر خاک ہو جانا

ہزاراں شہر کے راجہ جنو مکھ چاند سے لاجا
نقارہ موت کا باجا کہ آخر خاک ہو جانا

دربیان نوکری۔

بشنو بیاں نوکری جب کانٹھ ہووے کھوکھری — جب کھل جاوے چوکڑی یہ نوکری کا خط ہے
ہر روز اٹھ مجرا کریں در کار یک صد گر پڑیں — بے شرم آپس میں لڑیں یہ نوکری کا خط ہے
ہر صبح ڈھونڈیں نوکری کوئی نہ پوچھے بات ری — سب قوم ڈھونڈیں لاکڑی یہ نوکری کا خط ہے
چوکی کھیلو در حاضری کہاں دن پناویں باجری — تس پر چلاوے ناظری یہ نوکری کا خط ہے
دکھے سپاہی کھات کو چوکی دلاویں رات کو — کوئی نہ پوچھے ذات کو یہ نوکری کا خط ہے
صاحب عجب بیداد ہے محنت ہمہ برباد ہے — اے دوستاں فریاد ہے یہ نوکری کا خط ہے
ہم نام کو اسوار ہیں روزگار سے بیزار ہیں — یار و ہمیشہ خوار ہیں یہ نوکری کا خط ہے
یک تیر پیکاں نگردشئے نہ سوفار و نہ پر — غوطہ نماندہ در کمر یہ نوکری کا خط ہے
دربار دیکھا خان کا بیڑا نہ پایا پان کا — زرکار تو پھر امکان کیا یہ نوکری کا خط ہے

انقلاب زمانہ

گیا اخلاص عالم سے عجب یہ دور آیا ہے — ڈرے سب خلق ظالم سے عجب یہ دور آیا ہے
نہ یاروں میں رہی یاری نہ بھاؤں میں وفاداری — محبت میں گئی ساری عجب یہ دور آیا ہے
نہ بولے راستی کوئی عمر سب جھوٹ میں کھوئی — اتاری شرم کی لوئی عجب یہ دور آیا ہے
خوشامد کر کے بن زر کی چوبرگا بچہ زن گھر کی — ملاوے بات سب ہر کی عجب یہ دور آیا ہے
نفر کی جب طلب ہووے نفر باہر کھڑا رووے — میاں گھر میں پڑا سووے عجب یہ دور آیا ہے

یہ واضح رہے کہ اشعار بالا میں ردیف پر قناعت کی گئی ہے اور قافیہ کا استعمال نہیں ہوا ہے۔ محبوب عالم کے دوہروں کی بھی یہی خصوصیت ہے۔ نظموں کا یہ دستور پنجاب میں بہت عام تھا۔

سید اٹل نارنولی

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ میر جعفر زٹلی کے بھائی ہیں اگر سگے بھائی نہیں ہیں روحانی ہمدرد ہیں۔ ان کا ایک رقعہ کلیات جعفر زٹلی میں محفوظ ہے اس رقعہ کے ملاحظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اور میر جعفر کا مذاق ایک ہی رنگ کا ہے زٹل اور اٹل میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ وہو ہذا:

"رقعہ سید اٹل کہ از نارنولی نوشتہ بمیر جعفر در دکن فرستادہ بود۔"

پناہ بڑا ای وچوڑا ای میر جعفر زٹلی بڑے بھائی ہر روز از یاد حق سکھی باشد از سید اٹل بعد ادمک جہار بسیار ادر منوہار بیشمار اد جھل و مخفی نماند کہ سر پریت ہموطن دادمنگ ملاقات واشتیاق آں از حد پر گھٹ پنٹ برون ہا از جہت اندیشہ بنہایت افزون لیک بموجب آں کہ کل امور مرہون باوقاتہا حوالہ نمودہ۔ دوا کچھری نگارد کہ بعضے بدبختاں کافر کنٹھ دلی بوجوہ مزید غشہ و رجوی خودی چوں غوک از ندی ٹرٹرمی ویر چوں از برائے ایں پنٹ مہرباں از وہاں... نشاں چوں... پڑپڑ بر زباں می آوردند نظم ؎

زٹل تیری جعفر جہانگیر شد زٹل گفتن اندر توئی میر شد

امید کہ خود در بن بیٹھا بادی بودہ از خط وکتابت بھول جانا ز دانباشد۔ بیت ؎

نام حق روز و شب پکارا کر خط کتابت کو بھی بچارا کر

اس رقعہ کا جواب میر جعفر نظم میں دیتے ہیں۔ جو یوں شروع ہوتا ہے۔

سنوائے سخنداں برادر عزیز اٹل نارنولی توئی باتمیز

اسی جواب میں زٹل ذیل کا شعر بھی لکھتے ہیں ؎

منم کمترین بندہ شاگرد تو　　شب و روز در یاد و ورد تو

جس سے شبہ ہوتا ہے کہ کہیں زٹل اور اٹل ایک ہی بہروپ نہ ہو۔

غزل ذیل سید اٹل کا نمونۂ کلام ہے جو ایک بیاض نوشتۂ عہد محمد شاہی سے نقل کی جاتی ہے ؎

رخسار پر بہار چمن رونق چمن　　یا گل گلاب کا کہوں یا لالہ یاسمن
یا حقۂ جواہر دیا درج در کہوں　　یا غنچہ گلاب کہوں یا کہوں دہن
گیسوئے تابدار ہیں یا ناگ ہے بھونک　　یا زلف مشک رنگ ہے یا نافۂ ختن
با قد خوش خرام چلے جب لٹک لٹک　　شمشاد و صنوبر خم کھاویں در چمن
چوں ماہتاب شہر بادہ کرنا ہے جھمک　　یا آفتاب گشتہ درخشندہ در گگن
بیداد گر ستم گر ظالم عجب عجب　　گہ مہرباں و گاہ غضبناک خندہ زن
بر تو سن کرشمہ سوار است نازنیں　　سید اٹل زیادہ ز بیدار او مگن

(از بیاض پرتاپ سنگھ ساکن موضع آدر پرگنہ راہوں۔ دوابہ نسبت جالندھر بست و نہم شہر جمادی الاولی ۱۱۰۹ھ جلوس محمد شاہ بادشاہ غازی)

فارسی لغات سے اُردو کی قدامت کی شہادت

اکبر اعظم کے عہد میں فارسی خوانی کا رواج از سر نو تجدید پاتا ہے اس عصر میں علوم و فنون نے وہ ترقی کی جو گذشتہ ایام میں نا معلوم تھی۔ فیروز شاہ تغلق کی وفات کے بعد ۷۹۰ھ سے لے کر اکبر کے جلوس ۹۶۳ھ تک کا زمانہ ہندوستان میں فارسی کے لیے عہد تاریک کا حکم رکھتا ہے۔ اس زمانہ میں بہت کم تصنیفات ہوئیں اور نہ کوئی چوٹی کا مصنف بالخصوص پیدا ہوا۔ یوں تو فارسی کا ستارہ اس زمانہ سے پیشتر بھی

گھٹانے لگ گیا تھا خلجیوں میں علاؤالدین محمد شاہ ۷۱۵ھ کا زمانہ انقلاب خیز ہے اس کا
عہد زمانہ ماسبق کے اثرات کی بنا پر اگرچہ علم و فضل کے علمبرداروں سے خالی نظر نہیں آتا۔
اور علماء و فضلاء۔ ادیب و شعراء کا جمگھٹا پایہ تخت میں موجود ہے لیکن پادشاہ بذات خود
جاہل مطلق تھا اور پرستاران علم سے اس کو کوئی الفت نہ تھی حتیٰ کہ اس نے اپنی اولاد تک
کو جاہل رکھا اور محل میں ان کی پرورش ہوتی رہی۔ اسکے قواعد و ضوابط جاسوسی کی
سختی نے رعیت کے دلوں میں پڑھے لکھوں سے نفرت پیدا کر دی تھی۔ لوگ نوپسندوں کو بیٹی
دینا تک ناپسند کرتے تھے شاعروں۔ مورخوں۔ ادیبوں اور عالموں کی اس کے دربار
میں آمد و رفت رہی لیکن بادشاہ کو اس جماعت سے کوئی سروکار نہ تھا یہ لوگ اس کے
نزدیک دربار کی رونق اور نمائش و نمود کے سوا کسی مصرف کے نہ تھے۔ نتیجہ یہ
نکلا کہ آخر عہد علائی سے تعلیم یافتہ طبقہ کی تعداد گھٹنے لگی۔ اور عوام الناس میں تعلیم
کا ذوق و شوق کم ہو گیا۔ علوم کی بے رواجی کے ساتھ ساتھ فارسی پر بھی زوال
آگیا۔ تغلقوں نے کسی حد تک اس تنزل کی روک تھام کی لیکن فیروز شاہ کی وفات
پر کامل اندھیرا چھا گیا۔ فیروز شاہ کے جانشینوں۔ خضر خانیوں۔ لودھیوں اور
سوروں کا زمانہ فارسی کے لیے نہایت بدفعال تھا۔ بالخصوص پٹھانوں کا جو فارسی
کے دشمن مطلق تھے۔ شیر شاہی عہد کے پٹھانوں کے ذکر میں اخوند درویزہ اپنے
مرشد سید علی ترمذی یہ الفاظ نقل کرتے ہیں

"بحکم آں کہ جہل و سختی بر افغانان غالب است تا ہر کہ بر زبان فارسی
نطق و تکلم کند اورا دشمن می گیرند"۔

ان ایام میں دیسی زبانوں کی طرف عام توجہ ہو گئی تھی۔ مذہب و تصوف اور شاعری کا
سب سے زیادہ چرچا تھا۔ برج اودھی اور قنوجی کے بعض مشہور شاعر اسی زمانہ میں
پیدا ہوئے دنیا مذہب و تصوف کے پیچھے دیوانی ہو رہی تھی اور ہر قسم کے شیاد بشرطیکہ ان میں

لسانی وطباعی موجود ہو۔ ایک نیا فرقہ اور نیا مذہب بنانے میں کامیاب ہو سکتے تھے مداری وجلالی فرقے مہدیوں کی تحریک۔ کبیر پنتھی۔ دادو پنتھی ستنامی اور نانک پنتھی اسی زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ قصہ مختصر نئے مذہب بنے نئے فرقے اٹھے اور تصوف پھلا پھولا۔ لیکن فارسی ہندوستان میں ٹھٹھر گئی۔

علمی لحاظ سے ان ایام میں اگر کوئی کام ہوا ہے تو یہ ہے کہ طبیبوں نے طب یونانی کو ہندوستانی فضا کے مطابق ڈھالا۔ عربی و فارسی کے اسماء کو ہندی اسماء کے ساتھ مطابقت دی۔ درحقیقت یہ ایک نہایت مفید کام تھا جو اس عصر کے اطباء نے کیا اس کے ماسوا جیسا کہ دور منزل میں دیکھا جاتا ہے۔ شرح نگار پیدا ہوئے اور اسی ضرورت نے فرہنگ نگاروں کی جماعت پیدا کی۔ یہاں چند الفاظ انہی لغات نگاروں کی بابت کہنا چاہتا ہوں۔

ہندی فرہنگ نگاروں میں سب سے مقدم مولانا فخر الدین مبارک غزنوی قواس یا کمانگر جو علاء الدین خلجی ۶۹۵ھ و ۷۱۵ھ کے مشہور و معروف شاعر ہیں۔ ضیاء الدین برنی اور فرشتہ دونوں ان کا ذکر کرتے ہیں۔ ہندوستان میں ان کا فرہنگ نامہ فارسی لغات کا سنگ بنیاد ہے۔ ہماری نظر میں ان کی اہمیت یوں اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ فارسی الفاظ کی تشریح کرتے وقت بعض موقعوں پر مصنف نے ہندی الفاظ بالخصوص دواؤں اور دیگر اشیا کے نام بھی دیئے ہیں یہاں بعض الفاظ نقل کرتا ہوں۔

اظفار الطیب کے لیے لکھتا ہے۔

"ہندش ذکرمک گویند" دوسرے معنی لکھتے وقت کہا ہے: "بپارسی ناخن پریاں۔ ہندش نکھ نامند۔"

ایرنیساں کے واسطے لکھتے ہیں۔

"اہل ہند آنرا باداں سواتی نامند واں ابتدائے زمستان ؛ نتہائے برشگال است"

پرستو : "مرغیکہ ہندش ککراج گویند۔"

تاک : "ہندش چھینکا نامند"۔

چنوک : "قبرہ چنی ہانورک د بہندی۔ تمرہ گویند ر"۔

کت : "مہیایہ پرورکہ ہندش نیری گویند"۔

ہفوشش : "چیز لیست خوردنی کہ برنج ترکردہ میکوبند و درجامہ لبتہ بالائے آب گرم در آوندے مہر کردہ و مقدارے درآں سوراخ کردہ مید اندند۔ از بخاراں پختہ می شود۔ ہندش بھاکا نامند"۔ (منقول از مؤید الفضلا)

میں انہی نمونوں پر اکتفا کرتا ہوں جن میں سے نصف آج ہم نہیں سمجھتے۔ مولانا کی تحریک اس قدر مبارک ہوئی کہ ان کی تقلید میں اور لوگوں نے بھی فرہنگیں لکھنی شروع کیں چنانچہ مولانا رفیع المعروف بہ حاجب خیرات نے ۸۷۳ھ میں دستور الافاضل اور ملا رشید برادر عبدلجامع شرف نامہ منیری نے زفان گویا۔ قاضی بدر الدین محمد دہلوی نے ۸۲۲ھ میں اداۃ الفضلا ۸۸۳ھ میں محمد بن داؤد شادی آبادی شارح خاقانی و انوری نے مفتاح الفضلا، مولانا ابراہیم بن قوام فاروقی نے رکن الدین باربک شاہ ۸۶۴ھ و ۸۷۹ھ کے زمانہ میں شرفنامہ منیری، مولانا محمود بن شیخ ضیار نے ۹۱۶ھ میں سکندر لودھی کے نام پر تحفۃ السعادت وغیرہ تصنیف و تالیف کیں۔ ان کے علاوہ طلب حقائق الاشیاء، فینۃ الطالبین از قاضی شاہ، مؤید الفرائد، لسان الشعرا، فوائد الفضلا۔ بھی اہم تالیفات ہیں جن کے زمانوں اور مصنفین سے ہم ناواقف ہیں۔ ہماری دلچسپی کا سامان جو ان فرہنگوں میں ہے یہ ہے کہ ان میں سے اکثر مصنفین نے فارسی الفاظ کی شرح کے وقت ان کے ہندی مرادفات دے دیئے ہیں اور یہ التزام قریب قریب تمام مصنفین نے کیا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ ان ایام

میں ہندی کی طرف ایک عام رجحان ہو گیا تھا وہ غیر معمولی لفظ کا ہندی مرادف دے دیتے ہیں اگر موجود نہیں، ہیں تو وضع کر لیتے ہیں یہ عمل طبی تالیفات میں زیادہ تر مشاہدہ میں آتا ہے۔ میں اس کو کسی قدر واضح کرنا چاہتا ہوں۔ زبان کی ارتقائی تعمیر میں ایک اصول یہ بھی ہے کہ وہ دوسری زبان کے الفاظ کو یا تو بعینہ لے لیتی ہے یا ان کا ترجمہ کر لیتی ہے۔ اسکی مثال میں لفظ اذان الفار" ہم لیتے ہیں۔

اذان الفار ایک بوٹی ہے جس کے پتے زمین پر پھیلے ہوتے ہیں شاخیں باریک ہوتی ہیں اور پتوں کی شکل چوہے کے کانوں کے مشابہ ہوتی ہے۔ اس مشابہت کو دیکھ کر حکمانے اس کا نام اذان الفار رکھدیا۔ فارسی والوں نے اس کا ترجمہ مرزنگوش کرلیا۔ فارسی میں مرزن چوہے کے معنی میں آتا ہے جب حکماء کو ہندی میں اس لفظ کی ضرورت محسوس ہوئی تو انھوں نے وہی اصول اختیار کرکے اس کا ترجمہ "موساکنی" کرلیا۔ موساکنی اب سے پانچسو سال پیشتر ہندی میں مستعمل ہو رہا تھا متاخرین یا تو یہ ترجمہ بھول گئے یا کسی اور مصلحت کی زیر اثر موساکنی کو چوہہ کنی" کہنے لگے۔ اس طرح اظفار الطیب ہے جسے فارسی میں ناخن بویا اور ہندی میں جیٹھ نہر اور نکھ کہتے ہیں۔ یہاں ناخن کی رعایت تینوں زبانوں میں موجود ہے۔ اسی قیاس پر بصاق القمر کا ہندی ترجمہ "چندر کانت" کیا گیا۔ بصاق لعاب وکف دہن کو کہتے ہیں۔ کانت کے معنی مجھے معلوم نہیں لیکن قیاس چاہتا ہے کہ بصاق کا ہم معنی ہوگا۔ اسی قیاس پر "منزد گربہ" اور "حاور گربہ" کا ترجمہ بھانی لوٹن اور بلی لوٹن" کیا گیا ہے۔ زبد البحر فارسی میں کف دریا ہندی میں سمندر پھین اور پنجابی میں سمندر جھگ اسی اصول پر مبنی ہے۔ اس قسم کی بیسیوں مثالیں دی جاسکتی ہیں یہ امر یاد رہے کہ فرہنگ نگار جس چیز کو ہندی کہتے ہیں وہ نہ برج ہے نہ پنجابی نہ راجستانی اور نہ بنگالی و گجراتی۔ ہندی سے ان کی مراد یہی اردو ہے تو

اس عہد کے مسلمانوں میں بالعموم رائج تھی۔ اس نے ان بعید زمانوں میں بھی اس قدر ترقی اور وسعت اختیار کرلی تھی کہ پنجاب۔ بنگالہ۔ گجرات اور ہندوستان میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے اسکی دلیل ہمارے پاس یہ ہے کہ مذکورہ بالا فرہنگ نویس باوجودیکہ مختلف مقامات سے تعلق رکھتے تھے۔ کوئی مالوہ کا ہے کوئی بنگالہ کا ہے۔ اور پنجاب پنجاب کا جہاں مختلف زبانیں بولی جارہی ہیں اور ان لوگوں کا اپنے اپنے وطن کی زبانوں سے واقف ہونا بھی لازمی ہے لیکن اپنے لغات میں وہ وطنی زبانوں کے الفاظ نہیں دیتے بلکہ اسی عام زبان کے جو تمام ملک کے مسلمانوں میں مشترک ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ الفاظ ان تمام لغات میں عام ہیں۔ یہ خیال نہ کیا جائے کہ چونکہ فرہنگ نویس ایک دوسرے سے نقل کرنے کے عادی ہوتے ہیں اس لیے یہ الفاظ ان لغات میں عام ہو گئے ہیں۔ اس خیال کی تردید آسانی سے کی جاسکتی ہے۔

اب ہندی الفاظ کے ذخیرے میں بعض ایسے الفاظ بھی نظر آتے ہیں۔ جو اگرچہ اصلاً فارسی ہیں۔ لیکن فارسی والوں نے ان کو متروک قرار دے دیا ہے مگر چونکہ اردو میں برابر استعمال ہوتے رہے ہیں۔ اس لیے فارسی خوانوں نے ان کا شمار ہندی الفاظ میں کرلیا ہے یا بعض وجوہ سے ہندی میں انھوں نے دوسرے معنی پیدا کر لیے ہیں بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جو فارسی خوانوں نے ہندوستان میں ایجاد کیے لیکن فصحا نے ان کو تسلیم نہیں کیا۔ اور فارسی سے خارج کردیئے گئے لیکن چونکہ عام رواج میں تھے اس لیے انھیں تسلیم کرلیا گیا۔ یہاں چند مثالیں دی جاتی ہیں۔

انگشتانہ لازمی طور پر فارسی لفظ ہے جو انگشتوانہ سے بنا ہے۔ وہ لوہے کی ایک ٹوپی ہے جس کو درزی سوئی [illegible] محفوظ رہنے کی خاطر سیتے وقت انگلی میں پہن لیا کرتے تھے [illegible] کے لیے اور لفظ وضع کر لیے۔ مثلاً

"انگشت داں" اور "آہن آشیاں" وغیرہ۔ اب آخری لفظ کی تشریح میں صاحب مؤید الفضلا کہتے ہیں۔

"درہند انگشتانہ گویند"۔

ظاہر ہے کہ اس ہندی سے مصنف کی مراد بھاشا اودھی زبانیں وغیرہ نہیں ہیں بلکہ اردو جس کا قدیم نام ہندی ہے گویا اردو بولنے والوں میں یہ لفظ کثرت کے ساتھ استعمال ہو رہا ہے۔ فارسی خوانوں نے اس کو ہندی تسلیم کر لیا۔ لفظ "کماس" کی شرح میں مصنف مذکور کہتے ہیں۔

کوزہ گرد و پہن بر مثال کشت از چوب و سفال و جز آں کہ زیر بغل آویزند اکثر درویشاں و شباناں دارند"۔

وہ اس تشریح پر قناعت نہیں کرتے بلکہ آخر میں اضافہ کرتے ہیں کہ:۔

اہل ہند آنرا کچکول گویند"؛

ہم جانتے ہیں کہ کچکول فارسی لفظ ہے۔ وہ فارسی میں جب بھی مستعمل تھا اور اب بھی لیکن چونکہ کچکول ان کے زمانہ میں اردو بولنے والے کثرت سے استعمال کرتے تھے اس لیے انھوں نے اس کو اردو کا لفظ مان لیا۔

یہی مصنف "بارگیر" کے معنی بیان کرتے وقت کہتے ہیں:۔

"در قنیۃ الطالبین بمعنی ہودج است کہ آنرا عماری نیز گویند و ہند امباری"

عماری عربی لفظ ہے۔ جاہلوں نے بگاڑ کر اس کا انباڑی بنا لیا اردو میں آج بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

ایک اور لفظ "قلاب" کی شرح میں تحریر کرتے ہیں۔

"کنیزک۔ ہندش بردہ گویند"۔

مصنف موصوف "بدل" کے معنی ہندی میں "کابل" بتاتے ہیں حالانکہ کابل عربی میں

سست کے معنی دیتا ہے لیکن اردو میں وہ بزدل اور نامرد کے مفہوم میں آنے لگا اسکی تائید دکنی ادبیات سے ہوتی ہے جس میں کاہل فی الواقع بزدل کے معنی دیتا ہے چنانچہ محمد امین دکنی :-

توہم اک باگ کو ماریں یہ دس مل ہموں کو کیا بھیں بوجھے ہو کاہل

صاحب مویدالفضلا خبزراں کے ذکر میں لکھتے ہیں۔

"چوبے است ہندش بیت گویند"

بیت درحقیقت فارسی بید کی بگڑی شکل ہے جس طرح پلید سے پلیت اور مدد سے مدت بنے ہیں علیٰ ہذا ردپاک ہے جسے اردو میں رومال کہتے ہیں اس لفظ کی ترکیب فارسی ہے مگر ایرانی اسے تسلیم نہیں کرتے یہی حالت لنگی کی ہے۔ اب جس زبان میں انگشتوانہ کو انگشتانہ۔ کاس کو کچکول۔ عماری کو انبارکی۔ ردپاک کو رومال۔ کنیز کو بردہ۔ خبزران کو بیت۔ پلید کو پلیت۔ مدد کو مدت۔ اور لنگ کو لنگی کہا جاتا ہے۔ اردو کے سوا کوئی اور زبان نہیں ہو سکتی اس لیے ہمیں یقین کر لینا چاہیئے کہ اردو ان ایام میں موجود تھی اور تغلقوں کے دور سے پیشتر ہی مکمل ہو کر ایک حالت پر قائم ہو گئی تھی۔ سیدوں اور پٹھانوں کے دور میں جب دیسی زبانوں میں شاعری کا چرچا ہوا اردو میں بھی گجرات و دکن میں شروع ہو گئی۔ ان ایام میں جو اس زبان کی ترقی کی رفتار دیکھی جاتی ہے اس سے گمان ہوتا ہے کہ اگر مغلوں کا حملہ ہندوستان پر مخل اندازنہ ہوتا تو اردو بہت جلد سرکاری اور درباری زبان بن جاتی اور اس میں تصنیفات و تالیفات کا سلسلہ جیسا کہ دکن و گجرات میں دیکھا جاتا ہے شروع ہو جاتا۔ لیکن مغلوں کی آمد نے اس زبان کی بڑھتی امیدوں کو دو ڈھائی فیصدی کے لیے ملتوی کر دیا ایرانی عنصر جو امراا ور علماء کی صورت میں پھیل گیا اس نے ایک مرتبہ اور

فارسی کے ٹمٹماتے چراغ کی بتی اکسا دی اور تیل ڈال دیا اور ملک میں ایک مرتبہ اور فارسی کا دور دورہ گیا۔

میں یہاں مذکورۂ بالا لغات سے ان ہندی الفاظ کے نمونے سپرد قلم کرتا ہوں لیکن یہ یاد رہے کہ میں نے ان کتابوں کو شرفنامہ احمدی کے سوا بچشم خود نہیں دیکھا ہے کیونکہ یہ تمام کتابیں قلمی اور نایاب ہیں اور اسلاف کے ذہنی و علمی کارناموں سے ہماری بے خبری ایک ایسا پردرد افسانہ ہے جس کو دہرانے کی مجھ کو یہاں فرصت نہیں۔ ملک میں ایک بھی کام کا کتب خانہ نہیں۔ ہمارے محترم معاصر جبکہ لاکھوں روپیہ انگریزی کتب خانوں کے بنانے میں صرف کر دیتے ہیں مشرقی کتابوں اور مشرقی کتب خانوں پر ایک پیسہ خرچ کرنے کیلئے تیار نہیں۔ جن بزرگوں کے ہاں بدبختی سے یہ کتابیں مقید ہو گئی ہیں وہ زر وزاری کی پروا نہیں کرتے اور ان کے دکھانے تک کے روادار نہیں نہ خود فائدہ اٹھانے کے اہل ہیں اور نہ دوسروں کو ان سے افادہ کا موقع دیتے ہیں۔ کہتے ہیں ہمارے بزرگوں کی یادگار ہیں لیکن جس مجرمانہ غفلت سے بزرگوں کی یادگاریں رکھی جاتی ہیں ناگفتہ بہ ہے اور دیمک ان کو چاٹتے ہیں اور جب وہ چیزیں دنیا کے کسی مصرف کی نہیں رہتیں۔ کنوئیں میں پھینک دی جاتی ہیں۔ دریاؤں میں بہا دی جاتی ہیں۔ یا نذر آتش کی جاتی ہیں اور یہ آخری حشر ہوتا ہے ان بزرگوں کی یادگاروں کا۔ خدا رحم کرے ہماری اس جہالت پر جس کے طفیل ہزاروں نسخے سالانہ برباد ہو رہے ہیں۔

اگرچہ اصل لغات میری نظر سے نہیں گذرے ہیں لیکن کتاب مؤید الفضلا ۹۲۵ھ جس کو نولکشور نے چھاپ دیا ہے۔ میرے زیر نظر ہے۔ اسی کی سند پر میں نے فرہنگ نامہ قواس کے بعض الفاظ گزشتہ سطور میں نقل کیے ہیں اور اسی کی سند پر ادات الفضلا زبان گویا اور رقیۃ الطالبین سے استفادہ کیا ہے۔ شرفنامہ احمد

منیری اور ریاض الادویہ سے براہ راست استفادہ کیا ہے لیکن مجھ کو شبہ ہے کہ مؤید الفضلا میں کسی غیر مصنف نے ہندی الفاظ کی قدیم شکلوں کو بدل کر موجودہ یا اسکی قریب شکلوں میں لکھ دیا ہے مثلاً گھرگٹ کا گرگٹ۔ یا کھکھر کا کگڑی بنا دیا ہے۔

اداة الفضلا از قاضی بدر الدین دہلوی تالیف سنہ ۸۲۲ھ

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
اسکوب	چھت	آفتاب پرست	گھرگست
ادنیخ	لہسورہ	آرخ	ماسہ
اید	بہال	آدنگ	ملگنی
اداة	مور	تابول	تنبول
تخم کتاں	السی	تلی	بھانڈی
درائے	گھنٹی		

زفان گویا از مصنفات ملا رشید بدر ابراہیم برادر جامع شرف نامۂ منیری۔

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
آہن ربا	کانک	ادتب	برہمن	اظفار الطیب	جیٹھیہ کھیر
اسرب	سیسا	آبردد	باپچھڑ	آس	مورلر
اشتبرش	پھال	تختۂ استرس	ہل	بادبر	پھرکی
بوق	بھیر	بادرد	ہری	پیازک	لوند
پرنگ	پنیل	پالادان	ہالکہ	پنجپایہ	کیکرو
جوبہ ہا	چاپیل	چہ بلبس	اولتی	چقندر	دیدس
چادرغز	اکرودت	چکاچک	چکہر	حرزدن	سنکہ
خیارحز	باندریوری	خرچکوک	بھنتل و کچری	درخت سفتہ	بھنور

فتنۃ الطالبین قاضی شہ ابن باب

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
آسیب	دکھہ	الغاناخ	پالک	الہد	بندی
اشتخار	ساجی دکھار	انبیر	سنداسی	اہلل	ہوبیر، کنکول مرچ
ام غیلان	جوانسہ	ایتقان	ترمڑا	آذرگون	سورج مکھی
ادیش	سانتھ	بحدب	پیٹھا، کھنڈ	زنج	زنج دھتورہ
بوتیمار	بگ و بگلہ	بیدانجیر	ارند	بادبرنگ	بادھبرنگ
باطن (کذا)	سہنجہ	بلطان	چولائی	بیپل	پیپل و مرچ
پوپل	سپاری	پاپیدام	پاسی	پرازدہ	پیڑا
تغارہ	کھڑہ	تختۂ گوئی	لٹو، بھونیرا، بھوا	شجب کافور	کاکرڑا سنگی
جمرج	جاکلہ	جبود	تاڑ	جامۂ غوک	کائی
جعد	بھنکرہ	جیہ	جوگ درب	جنبیہ	کٹاری
چشپیرہ	چنچنہ	خلۂ چوب	کروال	خراد	کویل
خر	گدھا	خرزیر	بھوبھل	غرمنہ	نکہ، بھوتری
خرپق	سرسوں	خارمغیلاں	ککر	داہل	ملہلہ
دوامہ	لٹو، بھورہ	دیہ	کوپا		

شرف نامۂ احمد منیری ۸۶۲ھ و ۸۷۹ھ از ابراہیم قوام فاروقی۔

یہ کتاب فتنۃ الطالبین مذکورۂ صدر سے اقدم ہے اسکے مولف مولانا ابراہیم فاروقی بنگالہ کے رہنے والے ہیں اس فرہنگ کی تالیف میں کھوں سفے ذخار گویا۔ ادات الفضلا. فوائد الفضلاں. اصطلاحات شعر. لسان الشعر. لغت فرس اسدی. موائد الفواد صحاح تابع الاسلامی، تبیان. عجائب البر والبحر. عجائب البلدان. تاریخ طبری، تحفۃ العراقین رسالۃ النصیر، برمک نامہ، روضۃ الانوار... نفحۃ الریحان. فائد القلوب. دیوان الادب

اجمان حسینی وغیرہ سے امداد کی ہے۔ اسکے علاوہ زندہ لوگوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ مثلاً امیرزین الدین ہردی المخاطب بہ فتح خاں جو اس عہد میں ملک الشعرا بنگالہ تھے۔ اور محمد شیرازی اور شیخ واحدی وغیرہ

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
آسا	جھنجھوائی	آہن ربا	چوبک	الوا	کھوکتوا
آسیب	دبکر	آفتاب پرست	گھراگیت	آہن جفت	بھالہ
اردی بہشت	چیت	ادلنخ	لہوورہ	آزخ	مستا
اسپناخ	پالک	انگزو انگوزہ	ہینگ	اشتہ خوار	جواسہ
اکار (باغبان)	کودیری	آہک	چونہ	استرنگ	لکھناں
آذنگ	ملکنی	ارزن	چنیہ	آفستہ	موتھ
بنانج	سوکن	بادبہ، بازدہ	لٹوہ	بلادر	بھلاوہ
بندش	گالہ	بنو ماشو	منک	بناغ	لکری
برک (چقیاں)	بھیلی	ساگ	سہرہ (سہرا)	بورک	کھنکھندی
بھرک	کرہ (گرہ)	بشگ	نہال	بان	سہجنہ
بحران	کھرچینی (کھرچن)	باخہ	کچھوا (کچھوا)	تیک	گھن
پنج پایک	کبکرہ	پنرگان	تھال	پانلہ	کراہی
پلہ	ہلاس	ریچہ الباد عشقہ	اکاس بیل	تختہ بند	پتی
نرتزک	ممولا	تورک	لولی	تسمہ	پانی
تشی	ساہی	جائہ غوک	سوال	جوال	لون (گون؟)
جالی	پیلو	چغندر	گانگلو	چارمغز	اکھروٹ
جلانک	کبروزہ	چوپلیں	اوتنی	چرچہ	بلائی

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
چغانہ	سرمنڈلی	چوبہ	بیلن	خاکستر	راکھ
خشکا مار	جلندھر	خربوز	گادر	خزدوک	گبردہ
خیک	کھال	خردل	رائی	خفتگان	آنکھ (انگا)
خرزہرہ	(کنیر)	خرفہ	لونگ	خرہ	کھل
دردک	گرہی (گرہ)	دولنگ	اساہل	درخت سنبہ	کھتورا
(غدغہ)	کدکدی	دیوچہ	جوگ	درائے	گھانتی
روناس	مجیتہ	راسو	نیول	رشاشہ	بھوہیری
ردسے	بھنگار	زرت	جوار	زرہناد	کچور
زغیر	السی	زاک	پھٹکری (پھٹکری خام)	زغناک	ہچکی
زلہ	جھیکر	زدالہ	پہیرہ	سریج	کجہالہ
سنج	کجہالہ	سراغوچ	کونجی	سرند	سوال
سوسمار	گوہ	سلیاگ	گھن	سلبل	جھر
سنداں	نہالی	سادہ	رسوت	سفتہ	ہنڈی
سکرہ	کلوزن	سقلی	کراہی	شیرہ تاب	چکنی
شنبیت	میتھی	شکنج	بدھ	شود	شولی
شب بار	جوار	شخار	ساجی	شخنک	ہیچکی
شیرداں	کھیری	شخار	بلائی	طلق	ابہر
غلیج	کرکدی (گدگدی)	شوشک	ادوس	غنک	لانہ
فلہ	پیوسی	قولنج	باسور	قزامتر (فلاوند)	چڑکی
قرصک	برسولہ	کسیلا	کھیلا	کت	کھٹ (کھاٹ)

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
کنک انجیر	گولر	کنار	بیر	کشنیز	دھنیہ
کاغ	جکال	کاکل	کانس	کان	کھان
کلبتین	سنداسی	کاڑیرہ	کرر	کامہ (لبنہ)	سوالی
کلادہ	انی	غلولہ (علوی)	لدو ہندی	کلونہ	کونجی
کلوندہ	گگری	کمان گرہ	غلول (غلیل)	کورہ	بھتی
کوفتہ	پلہری	کاسنی	کسنی	گوالانج (حلوائی)	لاپہ
گذر	گاجر	گز	جھاؤ	گوشخارک	کنلالی
گردوں	گدی	گیرہ	جکری	لہفت	گدی
لوس	جھلہ	شگلیں وفادار (کھوپڑ)	جولی (جوئی)	موز	کیلا
مقناطیس	جونک	منڈل	منڈلہ	مولو	سنگی
ماہچہ	سولی	دشم	بھاپہ	یاقوت سرخ	پدم

(مؤید الفضلا ۹۲۵ھ)

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
آفتاب پرست	کنول	آہن جفت	گوشت ترنج وپیہ	گوشت ترنج وپیہ	بجوریکا گود
آمرنج	سندر	ابجوج	اگر	انگزد انگوزہ	ہینگ
اذان الفار	موساکنی	آبخور	گھات	آبار	سیسہ
اسفر	ساہی	آہار	ماندی (کلف) کھرپا	استنزار	سور
اسیرسور	موزمویں	اسپرکاہ	کاندل	ادبر	جبتہ
ارزز	چانول	ابن عرس	نیؤل	اصل السوس	ملٹھی
افیتوس	سالک	الماس	ہیرا	اشراش	سریشی

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
اگموط	صناول	الوا	گنوار	آزلودرخت	بکاین
اسرنج	سندور	ادبنج	لیسوڑہ	آزرخ	ماسہ
آزاد	بکم (نیم)	اجمود	کہودار، جوائن	اسطوخودوس	دھاتورہ
استرغوار	جانوراسہ	آسترنگ	لکہمنا	اونگ	ملکنی، الکنی
اسفیل	کندا	اساردن	بندکمر	اشلان	مورسوکھا
رشتہ	چلوہ	اجمودہ	جواین	اسمانہ	چھتہ
املہ	آنولہ	اہیانہ	تالو	انچہ	دھوکہ
ایلدانہ	ایلاچی۔ الاچی	اسرع	ہیرادوکھی زنگیات	افرع	گنجہ
انباغ	سوکن	آک	آک۔ مدار	اکلیل الملک	اسپرک گھموی
انک	سکاوسیہ	اراک	پیلو	انارشک	ناکیر
انجزک	مردا	انجلک	کھیلا	اربیاں	چھینکر (مچھلی)
اشنان	چوکہ	انبو	چھوہارا	انگورسیاہ	کالی داکھ
اشنوشبہ	چھینک	الوسیہ	جامن	آنسنہ	موتھ
آہنجہ	ہاتھ	انجزہ	انگن کے بیج	بارنب	سویا
بابونج	ابرم سار بسوتھل	بازیج	بھنگہ	بخار	بھاپ
بازیار	کسان	بلادر	بھلانواں	بزیادہ	جادتری
بندش	گالہ	بنوماش	مونگ	باک	سہرہ
بکوک	بجھجہ	ببانک	گوند	بشنک	نہائی
بادرنگ	رام تلسی	بددل	کابل	پربھن	لونیا کاساگ
بکہان	کلتھی	بیخ سوس	ملٹھی جیٹھی	بردزن	بارزہ

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
باقلہ	باکلہ	ہلیلہ	ہیڑہ	بویا	دونا مردا
لوبی	گندہ	بھارنگی	موندھاکر	تپک	گھن
پاتلہ	کراہی	پاخرہ	ادنبہ	پشتہ خانہ	کھٹ چھپر مسہری
تنگار	سہاگا	تیر	کری	ترترک	ممولا
تزہ	تیزک	توزک	لوبیا	تقویم	پترہ
تسمہ	پاتی	تالکی	دھنیہ	ثقار	رائی
بدحد	جھینگر	جنبہ	جمدھر	چوغا	کنتھا
		چقندر	گنگلو		

ریاض الادویہ ۹۴۶ھ از حکیم یوسفی

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
اہل	ادرقہ	شغال	سیاہ	راسور	نول
سرب	سکہ	اترج	بجورہ	سرگین گاؤ	گوبر
اوخر	گندپھل	نسیج العنکبوت	مکڑی کا جالا	برنج	چاول
خرگوش	کرمہ	آزاد درخت	درخت نیم	اسفاناج	پالک
آس	[illegible]	آراک	چھلرہ	اظفار الطیب	نکھ
آشنان	لانی	املج	آنولہ	آنبہ	انب
بذر کرفس	اجمود	بذر القرطم	دونیہ کا بیج	بذر الجزر	گاجر کا بیج
بذر القثد	کھیرے کا بیج	تخم خیار	ککڑی کا بیج	بذر الریحان	تلسی کا بیج
بذر الشبت	سوئے کے بیج	بسفائج	مونگا	بستان افروز	تکلا
لسان الحمل	جیوتری	ہندوانہ	کندہ	ہلیلج	بہیڑہ

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
بلادر	بھلاوہ	بندوق	ریٹھہ	بیض	آنڈہ
تربد	نسوت	تمر ہندی	آملی	توتیہائے ہندی	ہریا تھوتھہ
بستاں	چوچک	ثوم	لسن	جادرس	کنگنی
جدوار	نربسی	ملخ	تدی	جذر	گاجر
جزمازج	مائیں	جوز بوا	جعفل	جوزالماثل	دھتورا
جوزالقئی	من پھل	حب النیل	عشق پیچاں کا بیج کنڈ کرک	حب القطن	بنولہ
حب الملوک	جمال گوٹہ	خار خشک	گوکھرو	حمص	بنکرہ
حلبہ	میتھی	انگوزہ	ہینگ	نخود	چنا
حمام (کبوتر)	پربوہ	حمار	گدھا	حنظل	تماں
حنا	مہندی	گندم	گیہوں	خبازی	سونچل کا بیج
خنزر	ریٹھی	خروع	آرنڈ	خواطین	گینچوہ
خفاش	چمگودری	خیار	کھیرا	خیارزہ	کہکری
بذرالنبج	خراسانی اجوائن	بذرالفجل	مولی کا بیج	بذرالکتاں	السی کا بیج
دارچینی	تج	ماکیان	کوکری	دخاں	دھواں
خون	لوہو	روغن کنجد	میٹہ تیل	مگس	ماکھی
طلا	سونہ	بادیان	سونف	راتینج	رال
مسک	مکھن	زرنیخ	ہرتال	زرنب	سینتی
زعفران	کیسر	زنجبیل	سونٹھ	سیماب	پارہ
سازج	پترج	ساگ	سال	سپستاں	لسوڑہ
ککنار	بیر	سرطان	کیکڑہ	سعد	موتھہ

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
مسلیخ الحیہ	کانچلی	سنگ پشت	کچھوا	ماہی	مچھلی
سنبل الطیب	چھڑ	گربہ	بلائی	موی	بال
شونیز	کلونجی	صدف	سیپ	صمغ	گوند
صندل ابیض	اوجلہ چندن	صندل احمر	رکت چندن	پسنجول	سبہ
غوک	میدکی	طاؤس	مور	طباشیر	بنسلوچن
سپرز	تلی	سم بز	بھیڑی بکرے کے کھر	عدس	مسور
کنجشک	چڑیا	عظم	ہاڈ	عفص (ماخوذ)	ماجوپھل
عقرب	بچھو، ٹھوہ	عنب الثعلب	مکو	عود	اگر
غزالہ	ہرن	فاختہ	فندگی	موش	چوہیہ (چوہا)
ترب	مولی	فضہ	روپا	تخم کرفش	اجمود
فلفل اسود	مرچ	غوفل	سپاری	فوہ	مجیٹھ
فیل	ہاتھی	قاقلہ	الاچی	قرنفل	لونگ
قسط	کٹھ	نیشکر	گنا	قصب	بانس
قطن	روئی	زاک زرد	کاہی	قلط	کلتہ۔ موٹھ
اشنخار	ساجی	خارپشت	جنگلی چوہا	کبریت	گندھک
جگر	کلیجا	کرفس	اجمود، کلادہ	کراث	گند
کوکی	کونج	کرک	گینڈ	کرسنہ	اوجری
کشنیز	دھنیا	کلیہ (گردہ)	بوکر	کہربا	کپور
شیر	دودھ	گوشت	ماس	فوج	میندھر
مروارید	موتی	الماس	ہیرا	آب	پانی

اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف	اصل لغت	ہندی مرادف
مرزنجوش	مردہ	زہرہ	پت	مقل ازرق	کوگل
نمک	لون	موز	کیلا	جوزہندی	نارلیل، چلہری
نمک	بھوس، پورا	نل	چینی وچنیتہ	نیلوفر	کرل پھل
		درد	پھول		

پنجاب میں اُردو

"پنجاب میں اردو" اردو زبان کی تاریخ میں ایک نیا باب ہے جس کا ابتک کسی نے مطالعہ نہیں کیا ہے بلکہ خود اہل پنجاب بھی عموماً اس سے بے خبر ہیں اور اسی ناواقفیت کی بنا پر فی زمانہ پنجاب میں یہ عقیدہ لوگوں کے دلوں میں قبولیت حاصل کر رہا ہے کہ پنجاب پر اردو کا کوئی حق نہیں ہے، کچھ گردی کے بعد جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا دور آیا کمپنی کے انگریزی اور ہندوستانی عہدیداروں نے اس اجنبی زبان کو مدارس و دفاتر میں داخل کر کے رواج دیدیا یہ رائے ان نوجوانوں کی ہے جن میں اوصاف کے علاوہ وطن پرستی کے جذبا بیدار ہیں یہ خیال کس حد تک غلط ہے اوراق آیندہ کے مطالعہ سے کافی واضح ہو جائے گا

حقیقت یہ ہے کہ اردو جس طرح ہندوستان کے اور صوبوں میں اسی طرح پنجاب میں برابر بولی اور سمجھی جاتی رہی ہے۔ پنجاب سلطنت اسلامی کا ایک جزو تھا اور سلطنت کا صوبہ ہونے کی حیثیت سے اردو کو یہاں اسی قدر دخل حاصل تھا جیسا سلطنت کے اور صوبوں میں قدیم زمانہ سے یہ زبان کم و بیش رائج رہی ہے۔

اردو کے لیے اہل پنجاب کی طبعی مناسبت اور قدیم اردو پر پنجاب کا اثر دیکھکر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اردو پنجاب کے کسی خطے یا ضلع کی زبان تھی، اس سوال کا کوئی جواب ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ پنجابی اور اردو میں ہندوستان کی دیگر زبانوں کے مقابلہ میں قریب ترین مماثلت موجود ہے۔ ان کی صرف و نحو ہم قواعد و مسائل میں باہم تطابق ہے۔ اور ساٹھ فیصدی سے زیادہ الفاظ یا مشترک ہیں مزید برآں جن امور میں یہ زبانیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں ان میں ہمیں اضافت دیں "سو ہو کرنا چاہیے۔ مثلاً اردو کی اضافت ... کے، کی کے بجائے پنجابی میں دا، دے

اور ڈی آتا ہے اگرچہ تصریف میں دونوں زبانیں متفق ہیں۔ گویا کاف اردو کے ساتھ اور دال پنجابی کے ساتھ مخصوص ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو کی اضافت ایک زمانے میں رائج تھی۔ اس کے ثبوت میں اگرچہ ہمارے پاس کوئی قدیم دستاویز موجود نہیں لیکن جب ہم پنجاب کے دیہات وقصبات پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بیسیوں موضعوں اور قصبوں کے نام کے ساتھ جزو کلمہ بن رہی ہے۔ مثلاً ڈسکا۔ فاضلکا۔ امروکا۔ بھڑکا۔ پٹھنکا۔ ویرکا۔ جاگکے۔ جنڈ دکے۔ خانکے۔ کالے کے۔ کاموں کے۔ سیجن کے۔ بلوال کے۔ ماچھی کے۔ منجو کے۔ مریدکے۔ بساد ہوکے۔ دھر کے۔ تیجو کی طبیاں۔ مدّوکی۔ اوری۔ پتوکی۔ نارکی۔ خانکی۔ جھام کی۔ کیمو کی۔ رحیم کی۔ چوہڑ پڑی وغیرہ اس قسم کے نام پنجاب میں کثرت کے ساتھ ملتے ہیں۔ یہ امر ظاہر ہے کہ جس تیزی سے زبان بدلتی ہے اس تیزی کے ساتھ ملک کے جغرافیائی نام نہیں بدلا کرتے اس لیے ان مقامات کے ساتھ اردو کی اضافت کا موجود ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ یہ اضافات پنجاب میں قدیم الایام سے ہیں اور ایک وقت استعمال میں آرہی تھیں۔ لیکن جب موجودہ پنجابی کی لہر آکر ملک پر چھاگئی۔ پرانی زبان کا شیرازہ بکھر گیا۔ یہ بھی یاد رہے کہ یہ اضافات نہ صرف جغرافیائی اسما میں ملتی ہیں بلکہ اور الفاظ میں بھی موجود ہیں۔ مثلاً پی کا۔ باپکا گھر اس کا مرادف میکا۔ جس کی ترکیب بھی وہی ہے۔ یعنی پیکے۔ نانکے۔ دادکے۔

ادھر ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم اردو زیادہ تر پنجابی اثرات میں ہے یعنی آج جن باتوں کی تشریح سے اردو عاجز ہے۔ پنجابی زبان آسانی کے ساتھ ان کی تشریح کر دیتی ہے۔ اس قسم کی متعدد مثالیں گزشتہ اوراق میں درج کی جا چکی ہیں یہاں ایک اور مثال دیتا ہوں۔

رسالہ معراج العاشقین مولانا عبدالحق صاحب بی اے آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو نے تاج اردو کی قدیم میں شائع کیا ہے۔ یہ رسالہ حضرت صدرالدین

سید محمد حسینی گیسو دراز بندہ نواز متوفی ۸۲۵ھ کی طرف منسوب ہے اور اردو کا غالباً قدیم ترین نمونہ ہے اس رسالہ میں ایک فقرہ آتا ہے۔

"دو معراج تن ممکن الوجود۔ اس کا نگہبان اسرافیل نفس لوامہ جو اس خمسہ کی آنکھ سوں غیر نہ دیکھنا۔ سو غفلت کے کان سو غیر نہ سنتا سو وسواس کے ناک سو بد بوئی نہ لینا سو۔ بخلی کی زبان سو غیر نہ بولنا سو۔ مغروری کے ... کوں غیر جاگا نہ دوڑانا سو غفلت ہوا غضب ان پانچ خواص کا راقبہ کرنا پیر کے ملکن کا مشاہدہ کرنا۔ ذکر قلبی کو شریعت کے کانسے میں پلایا۔"

فقرہ میں مصادر کے آخری میں سو کا استعمال نہایت عجیب ہے اور اردو زبان ... کی تشریح سے قاصر ہے۔ اب اسی "سو" کا استعمال پنجابی میں آج بھی موجود ہے جو ضمیر غائب کا ... کرتا ہے۔ مثلاً "جانا سو"۔ اسے جانا (ہے) "کیتو سو" اس نے کیا ... مذکورہ بالا فقرہ میں ہے۔ ان امور سے ظاہر ہے کہ پنجابی اور اردو کے تعلقات ایک دوسرے کے ساتھ بہت گہرے ہیں۔

شمالی ہندوستان میں جس میں دہلی بھی شامل ہے اردو کی قدیم یادگاریں گیارہویں صدی ہجری سے زیادہ قدیم نہیں ملتیں۔ اور تعجب ہے دیکھا جاتا ہے کہ پنجاب میں بھی اسی صدی سے تالیفات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پنجاب میں مولانا عبدی کی تصنیف رسالہ فقہ ہندی سب سے قدیم ہے جو ۱۰۸۴ھ میں بعہد اورنگ زیب عالمگیر لکھا جاتا ہے۔ عبدی کی تحریک ہمارا خیال ہے۔ برابر جاری رہی ہے۔ لیکن محمد شاہی دور تک کسی اور تالیف کا سراغ نہیں چلتا۔ ان ایام میں قصبہ بٹالہ میں شیخ محمد فاضل الدین کے ہاتھوں اس تحریک کو بہت تقویت ملتی ہے۔ ان کے فرزند غلام قادر مثنوی رمز العشق کے مصنف ہیں۔ صوفی حلقوں میں یہ مثنوی بہت مقبول رہی ہے۔ نہ صرف اسکی شرح لکھی ہے بلکہ اسکی تقلید میں فقیر اللہ مثنوی درمکنوں ۱۲۰۴ھ میں لکھتے ہیں۔

اور میاں نور محمد المعروف بہ میاں بھبیل ولد میاں تنھوں مثنوی فتح الزم ۱۲۵۰ھ میں تصنیف کرتے ہیں۔

ریختہ کی طرز کی نظموں میں سب سے قدیم ریختہ شیخ فرید الدین گنج شکر متوفی ۶۶۴ھ کی طرف منسوب ہے۔ علاوہ بریں ان کے بعض اردو فقرے بھی ملتے ہیں ان کے بعد شیخ عثمان اور شیخ جنید اور منشی ولی رام کے ریختوں کی باری آتی ہے جو گیارہویں صدی ہجری سے تعلق رکھتے ہیں۔ بارہویں صدی کی متفرق نظموں میں زیادہ تر صوفیانہ نظمیں داخل ہیں جن میں سے اکثر غوث الاعظم کی شان میں ہیں ایسی نظمیں جو کثیر تعداد میں ملتی ہیں اس لیے میں نے صرف چند انتخاب کرلی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان زیادہ تر خانقاہ نشینوں کی گود میں پلی ہے وجہ ظاہر ہے کہ ان بزرگوں کا تعلق زیادہ تر عوام الناس سے تھا دیسی اور پردیسی ان کے فیض سے طالب تھے۔ لوگ دور دور سے اپنی مرادیں لے کر ان کے پاس جاتے تھے۔ اس ملکی زبان کا جاننا اس میں بات چیت کرنا ان کے لیے ضروری تھا۔ دوسرے صوفی پیشہ لوگ اکثر سیاح اور جہانگرد ہوا کرتے ہیں اور ان دو ایام میں ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں بولی جاتی ہے۔ اس لیے سیاحوں۔ صوفیوں اور سپاہیوں کے لیے اس زبان کا جاننا از بس ضروری تھا۔

دیکھا جاتا ہے کہ یہ نظمیں اکثر اوقات الم خیز اور فریاد مندانہ ہیں اور مصرع

سنو پکار دکھی کی ابا شہ جیلاں

کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں اسکی وجہ ان زبانوں کے سیاسی انقلابات میں مضمر ہے جو پنجاب میں رونما ہو رہے تھے۔ ان کے اوزان بسا اوقات ہندی ہیں یا ایسے ہیں جو قدیم سے ہندی خوانوں نے فارسی سے لے لیے ہیں۔ قافیہ ان میں چنداں نہیں ہے اور مربع و مخمس کی شکل میں ہیں۔

تغزل، دہلی مرکز کے قیام کے بعد پنجاب میں دیر سے پہونچتا ہے جس کے اثر میں
فارسی بحور و جذبات پنجاب کی نظموں میں روشناس ہوتے ہیں۔ اگرچہ ایہام گوئی
جس پر دہلی کی ابتدائی شاعری کا دار و مدار تھا یہاں کبھی کامیاب نہیں ہوئی۔
پنجاب نے اپنے ادبی تعلقات دہلی و دکن سے سیاسی مصائب کے باوجود برابر قائم رکھے
ہیں۔ سید بلاقی ولی اورنگ آبادی۔ سراج دکنی۔ شاہ ابرو خاں۔ اشرف وغیرہ سے
یہاں کے باشندے نہ صرف واقف ہیں بلکہ انھیں اسی شوق و ذوق کے ساتھ پڑھتے
ہیں جس طرح نظامی سعدی اور حافظ کو پڑھتے ہیں اس عہد کی بیاضیں ان شعرا کے کلام
سے پر ہیں سید بلاقی کا مولود نبی بحد مقبول تھا اس کے کئی نسخے میری نظر سے گذرے ہیں محمد افضل
کا بارہ ماسہ بکمال شوق سے پڑھا جاتا تھا اور ولی کا کلام بڑے اشتیاق کے ساتھ لوگ پڑھتے ہیں
۱۸۰۱ء میں رنجیت سنگھ کا دادا چڑت سنگھ ندی کی جنگ میں اپنی بندوق کے پھٹنے
سے مارا جاتا ہے اور ہمیں سخت تعجب ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ نامدار خاں دت
اس کا مرثیہ اردو زبان میں لکھتا ہے۔ سکھوں کی تاریخ میں اردو صرف اسی موقع پر
نمودار نہیں ہوتی بلکہ اس تاریخ سے دس سال بعد جب جے سنگھ (کنیہ مثل) کا اکلوتا
فرزند گوربخش سنگھ عین میدان جنگ میں گولی کے زخم سے ہلاک ہوتا ہے (اسکی بیوی
سداکور نے اپنی بیٹی بعد میں رنجیت سنگھ کو بیاہ دی) ہم دیکھتے ہیں کہ محمد غوث
بٹالوی گوربخش سنگھ کا مرثیہ اردو میں لکھتا ہے۔

پنجابی شاعروں اور ناظموں کے متعلق جو اطلاع آئندہ اوراق میں درج ہے
زیادہ تر عام شائقین کی بیاضوں سے حاصل کی گئی ہے۔ اسی لئے یہ اطلاع مختصر
ناکافی اور غیر متعین ہے۔ ان کے زمانوں کے متعلق بھی ضروری قیاس و احتمال
سے کام لیا گیا ہے اور ان کے تقدم و تاخر کی بابت بھی نکتہ چینی کی گنجائش ہے اور یہ
خامیاں اسلئے ہیں کہ اس خاص مضمون پر اطلاع حاصل کرنے کا بظاہر کوئی ذریعہ نہیں

معلوم ہوتا پنجاب میں بدقسمتی سے اس وقت کوئی جامع کتب خانہ موجود نہیں ہے اور نہ ابتک اہل پنجاب کو مشرقی کتب خانہ بنانے کا احساس ہوا ہے۔

آخر میں چند کلمات ان بزرگوں کی زباں دانی کے متعلق بھی ضروری معلوم ہوتے ہیں ان کے کلام کو جانچتے وقت ہمیں اپنے زمانہ کے معیار تنقید سے کام نہیں لینا چاہیئے اور یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ لوگ پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں جہاں اردو مادری زبان نہیں ہے اور اب سے ڈیڑھ دو سو سال پہلے اردو کا معیار مختلف تھا۔ میں مانتا ہوں کہ ان کے خیالات بلند نہیں ہیں اور نہ زبان بامحاورہ ہے اور اکثر حالات میں پنجابی لہجہ غالب ہے تاہم ان کے مطالعہ سے ہمارا مقصد شاعری سیکھنا نہیں ہے، بلکہ صوبہ پنجاب میں اردو کی نشو ونما اور اسکی ترقی کا مطالعہ کرنا خود اردو کے قدیم اساتذہ میں آج جو ہم دلچسپی لیتے ہیں وہ محض علمی اور تاریخی نقطۂ نظر سے ہے ان بزرگوں کے واسطے بھی ہمارا نقطۂ نظر یہی ہونا چاہیئے اس تمہید کے بعد پنجاب میں اردو کا تبصرہ شروع کیا جاتا ہے۔

شیخ فریدالدین گنج شکر متوفی سنہ ۶۶۴ھ

ساتویں صدی ہجری میں شیخ فریدالدین مسعود ایک عجیب و غریب ہستی ہیں۔ ملتان کے قصبۂ کوتوال میں پیدا ہوئے اور ملتان میں تعلیم پاتے رہے۔ ممالک اسلامیہ میں سیاحت بھی کرتے ہیں، مشہور صوفیوں سے ملاقات کرتے ہیں اور دہلی جاکر قطب الدین بختیار کاکی اوشی کے مرید ہو کر پاک پٹن میں سکونت اختیار کر لیتے ہیں اور سنہ ۶۶۴ھ میں اسی مقام پر وفات پاتے ہیں۔ شیخ فارسی و پنجابی کے شاعر ہیں اور کچھ حصہ ان کے کلام کا اب تک محفوظ ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اردو بھی بولتے ہیں اس قسم کے ان کے کئی فقرے ان کے سوانح نگاروں نے اتفاقیہ اپنی تصنیفات میں نقل کیئے ہیں چنانچہ۔

مولانا برہان الدین صوفی ابھی خورد سال ہی تھے کہ ان کے والد شیخ جمال الدین

ہانسوی مرید شیخ فرید الدین کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم کی بیوی "مادر مومناں" شوہر کی وصیت کے مطابق اپنے فرزند خواجہ برہان الدین صوفی کو لے کر حضرت گنج شکر کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ شیخ نے خواجہ برہان الدین کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کی خورد سالی کا لحاظ نہ کر کے اپنی بیعت میں لے لیا اس پر مادر مومناں معترض ہوئیں اور ہندی زبان میں بولیں۔

"خواجہ برہان الدین بالا ہے۔"

یعنی کم عمر ہیں۔ شیخ فرید الدین نے ہندوی زبان میں جواب دیتے ہوئے کہا۔

"مادر مومناں! پونوں کا چاند بالا ہوتا ہے۔"

یہ واقعہ میں نے سید محمد بن سید مبارک کرمانی متوفی ۷۷۰ھ کی تصنیف "سیر الاولیا" سے نقل کیا ہے جس میں مذکورۂ بالا ہندی فقرات بلفظہ درج ہیں۔

ایک روز شیخ فرید الدین اپنے پیر خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کو وضو کرا رہے تھے اتنے میں حضرت کی نگاہ ان کے چہرے پر پڑی۔ دیکھا کہ آنکھ پر پٹی بندھ رہی ہے آپ نے دریافت کیا۔ بابا آنکھ پر پٹی کیوں باندھ رکھی ہے۔ بابا فرید نے ہندی زبان میں جواب دیا۔

"آنکھ آئی ہے۔"

شیخ نے جواب دیا۔

اگر آئی ہے ایں را چرا بستہ آید"۔

(جواہر فریدی صفحہ ۲۰۸)

جن ایام میں بابا فرید گنج شکر سرسہ میں حضرت خواجہ عبد الشکور کے مزار پر آتے تھے۔ ایک دن سرسہ کے لوگ جنھیں یہ معلوم کرنے کا اشتیاق تھا کہ باصا مزار پر جا کر کیا کرتے ہیں۔ ان کے راستہ میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ جب آپ کو معلوم ہوا ناراض ہوئے اور ہندی زبان میں فرمایا۔

"سر سہ سر سہ کبھی سر سہ کبھی نہ سہ"۔ (جواہر فریدی ص۲۵۵)

ان فقرات سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان ساتویں صدی میں اپنے امتیازی خصوصیات نمایاں کر چکی ہے۔ یعنی اس میں وہ خصوصیات موجود ہیں جو اس کو ایک طرف برج سے اور دوسری طرف پنجابی سے ممیز کرتی ہیں۔ "ہوتا ہے" نہ پنجابی ہے نہ برجی اس سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ اہل پنجاب ان ایام میں اردو بول اور سمجھ سکتے تھے۔

ذیل کی نظم بھی حضرت بابا فرید گنج شکر کی طرف منسوب ہے، جس کے لیے میں جناب سید نجیب اشرف صاحب ندوی اور سید عبد الحکیم صاحب ناظم کتب خانہ الاصلاح دسنہ ضلع پٹنہ کا منت پذیر ہوں۔ یہ نظم سید اشرف صاحب نے دسنہ لائبریری کے بعض بوسیدہ اوراق قدیم سے حاصل کی ہے۔ جن پر حضرت بابا کے اقوال فارسی بھی درج تھے اور ناظم صاحب نے ایک نقل نہایت مہربانی کر کے میرے پاس بھیج دی ہے۔ وہو ہذا:-

وقت سحر وقت مناجات ہے — خیز دراں وقت کہ برکات ہے

نفس مبادا کہ بگوید ترا — خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے،

با دم خود کہ ہمدم ہشیار باش — صحبت اغیار بُری (کذا بُری) بات ہے،

با تن تنہا چہ روی زیں زمیں — نیک عمل کن کہ وہی سات ہے،

پند شکر گنج بدل و جان شنو — ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے

پنجاب میں نظم سب سے پیشتر لکھی گئی ہے اور نثر نسبتاً کم ملتی ہے۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ اس سلسلہ میں بہت کچھ ذخیرہ تھا۔ لیکن موجودہ نسلوں کی عدم اعتنا سے اکثر حصہ جو قلمی تھا برباد ہو گیا ہے اور جو کچھ باقی ہے وہ بھی عنقریب برباد ہونے والا ہے مسٹر قیامت؟ سے اہل پنجاب کی عام بے پروائی نے ہماری تلاش کے کام کو اور بھی

شکل بتادیا ہے۔ پنجاب اگرچہ مسلمانوں کی اکثریت پر نازاں ہے لیکن یہاں کوئی ایسا کتبخانہ موجود نہیں جو مسلمانی مخطوطات اور ان کے ذہنی و دماغی کاموں کا صحیح معنی میں جامع ہو۔ ذیل میں جو مواد پیش کیا جاتا ہے وہ اندکے از بسیار کا مصداق ہے

شیخ عثمان

پنجاب میں اردو شاعری دکن سے بعد اور دہلی کے معاصر شروع ہو جاتی ہے ابتدائی نمونے بہت کم ملتے ہیں اور جس قدر ملتے ہیں ان میں تخلص موجود نہیں قدیم نمونے زیادہ تر ریختہ کی شکل میں ہیں اور ان میں فارسی بہت غالب ہے اور مقامی اثر بھی حاضر ہے۔ ان نظموں کی بعض خصوصیات بھی ہیں۔ مثلاً اکثر مسمط طرز کی ہیں۔ قافیہ کی پابندی سے آزاد ہیں اور ردیف پر قناعت کی گئی ہے جیسا کہ میر جعفر زٹلی اور شیخ جیون کے کلام میں مشاہدہ ہو چکا ہے۔ یہ نظمیں ہندی اوزان میں لکھی گئی ہیں اور فارسی اوزان میں بھی الفاظ بعض اوقات پنجابی لہجہ میں تلفظ کیئے گئے ہیں۔

ابتدائی نمونوں میں جو کم از کم گیارہویں صدی ہجری کی ابتدا سے تعلق رکھتے ہیں تمام غزل فارسی ہے صرف ردیف اردو ہے۔ مثلاً ذیل کا ریختہ:۔

عاشق دیوانہ ام آؤ پیارے حبیب — از ہمہ بیگانہ ام آؤ پیارے حبیب
اے نظرت آفتاب برمن مکن تتاب — جان و جگر شد کباب آؤ پیارے حبیب
اے دل و دین جان من درد تو درمان من — ذکر تو سامان من آؤ پیارے حبیب
زان لب شیریں شکر بار دہ درد گہر — ساز مرا بہرہ ور آؤ پیارے حبیب
چند کشی کشتہ را عاشق آشفتہ را — بے دلم و بے نوا آؤ پیارے حبیب
دمبدم انتظار یک نظرم واگذار — عاشقم و خستہ دار آؤ پیارے حبیب
اے تو کس بیکساں مونس بیچاں لگاں — غمخوار آوارگاں آؤ پیارے حبیب

حکم ترا بندہ ام نزد تو شرمندہ ام   زار و سر افگندہ ام آؤ پیارے حبیب
وقت بشام گذشت کار نیامد ز دست   پشت زغمہا شکست آؤ پیارے حبیب
در بدر و کو بکو نعرہ زنان سو بسو   دیدن تست آرزو آؤ پیارے حبیب
روز و شبم انتظار دم بدمم بے قرار   دیدہ چو ابر بہار آؤ پیارے حبیب
بر دل عثمان غریب رحمت خود کن قریب   زانکہ تو ہستی مجیب آؤ پیارے حبیب[1]

اس غزل میں ہم دیکھتے ہیں کہ اردو نے صرف انگلی پکڑی ہے آئندہ چل کر وہ پہنچا بھی پکڑے گی یہ ریختہ حضرت مجدد الف ثانی سرہندی علیہ الرحمۃ متوفی ۱۰۳۵ھ کے پیر بھائی حضرت شیخ عثمان جالندھر کی یادگار ہے خزینۃ الاصفیا میں شیخ عثمان کا ضمناً ذکر آجاتا ہے لیکن اس کا سن وفات نہیں ملا۔ اسی طرز کا ایک اور ریختہ ہے جس کے مصنف کے حالات سے ہم واقف نہیں ہے۔

منم مشتاق دیدارت اری ٹک ور کن گھونگٹ   بجان و دل خریدارت اری ٹک دور کن گھونگٹ
نہ بینی نیند مجھ آئے نہ تجھ بن بات مجھ بھائے   نہ فرداں اندن جائے اری ٹک دور کن گھونگٹ
اگر تو یوسف ثانی وگر تو ماہ تابانی   اگر تو شاہ خوبانی اری ٹک دور کن گھونگٹ
عجب رفتار تو داری عجب گفتار تو داری   چہ حسنت نادرے داری اری ٹک دور کن گھونگٹ

شیخ جنید

اسی قرن کے اور بزرگ ہیں۔ ان کا اسم گرامی جنید ہے۔ اور جماعت صوفیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے حالات زندگی نامعلوم ہیں۔ آئندہ نظم ان کی ہے۔

دلا غافل چہ می جسی کہ اپنی صبح تھیں ڈریئے   جو روز مرگ در پیش است اتنی نیند کیوں کریئے

---

[1] بوساطت مولانا عبد اللہ صاحب بالقابہ۔

چو وزداند رکمیں باشد کرے جو نیند بنجارا — نباشد سود یک جیتل گوادے مول بھی سارا
بدین بیائے دہ روزی بڈہائی کالی کیوں کریئے — اگر صد سال عمرت شد نہایت ایک دن مریئے
چہ منزر وری دریں دنیا سدا اس جگ نہیں رہنا — ہمیں رہ ہے کہ درپیش است سبھی اس پنتھ سے چلنا
کجا رفتند آں ساہاں کہ جن کی بار تھی ہستی — گرفتند جلئے در صحرا گئے سب چھوڑ کر بستی
کجا رفتند آں مرداں کہ بانکاں ٹوپیاں دہرے — ہمہ در خاک خپتیند جنہاں تھیں سبھی تھیں ڈردے
کجا رفتند آں یاراں جنہاں تھیں جیونی تیرا — چناں رفتند زیں عالم کہ کلھہ نا گیا پھر تیرا (کذا)
کجا رفتند آں حوراں جنہاں ئے نین تھے بانکے — چناں بگذاشتند خانہ نہ پھر گھر بار دہر جھانکے
کجا آں ماہرو خوباں جو موسر کند اوتے پاتے — نہ نام و نے نشاں ماندہ جو گل گل بہہ ماتے
کجا سوداگران منعم جنہاں کے بار تھے ماندھے — کلالاں خاک ایشاں بردند کھرے کچھ بار تن ہاندے
دراں وقتیکہ تو میری نہ دنیا کام تجھ آئے — کسے کو داد دخشندہ دہی کچھ ساتھ بھی جائے
نہ اینجا خویش کس باشد نہ کوسی یار کو یاری — نہ کس مونس بود دیگر نہ بھائی باپ مہتاری
ترا در گور بسپارند پھر کر لوگ گھر آدے — ہمیشہ با خدا کارت نہ کوہی آوے چھر کاوے

دراں درگاہ بے رشوت بنجانوں کیوں رہے پردا
جنیدا مرداں باشد کر اس سیار تھیں ڈردا

ہندوستان کی طرح پنجاب میں ہم دیکھتے ہیں کہ اردو مشائخ کی خانقاہوں میں سب سے پہلے پرورش پاتی ہے اور گھٹنوں چلنا سیکھتی ہے۔

منشی ولی رام

شاہجہاں کے دور میں منشی ولی رام صاحب عربی و فارسی و ہندی میں شعر کہتے تھے اور ولی تخلص کرتے تھے۔ دارا شکوہ کے منشی خاص تھے۔ ان کی مثنوی ملقب بہ مشش وزن مطبع نادر العلوم میں چھپ چکی ہے۔ غزل ذیل میں ان کا نمونہ کلام ہے۔

چہ دل داری دریں دنیا کہ دنیا سے چلانا ہے | چہ دل بندی دریں عالم کہ سر پر چھوڑ جانا ہے
چو ہنگام اجل آید بکارت گکھ نہ گکھ آید | بچھائی کاہ کی تیری وہی تیرا بچھانا ہے
قبا و چیرہ رنگیں ہمہ از تن تو بکشانید | وہی ہیگی کفن کی چادر جو تیرا خاص بانا ہے
ہزاراں کھانا گر داری پر از حلوا پلاو رنگیں | دیویں دو بہشت ار دادا جو تیرا خاص کھانا ہے
بہ مادر پدر فرزنداں برادر ہا کہ می نازی | وہی تجھ کو جلائیں گے جناں پر سیت ٹھانا ہے
تو مہماں آمدی این جا شدی خود خانہ خاوند | تو اپنے آپ کو بھولا کسی کو نا پچھانا ہے
شراب سرخ می نوشی اجل کردی فراموشی | مرن کو دور مت سمجھو عجب یہ تک بہانا ہے

طلب دیدار می دارم کہ روز ادل شفاعت ہا
بسار ومت وکی راما کہ آخر رم رانا ہے۔

(خزینۃ العلوم۔ درگا پرشاد نادر۔ مفید عام ۱۸۶۹ء)

مولانا عبدی

۱۰۸۲ھ میں فقہ ہندی نامی ایک رسالہ بعہد عالمگیر پنجاب میں لکھا جاتا ہے اسپرینگر نے فہرست کتب خانۂ اودھ میں اس کو محشر نامہ کے نام سے موسوم کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کتاب کا نام محشر نامہ نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ فقہ ہندی۔ اس کا یہ خیال بالکل درست ہے۔ لیکن وہ اس رسالے کے ناظم کا نام محمد جیون عرف محبوب عالم متوطن جھجر بیان کرتا ہے اور خاتمہ سے دو شعر نقل کرتا ہے۔

فقہ ہندی کو مومناں انو زباں پر یاد | مسئلہ آدے دیں کا موں نہ ہوئے فساد
سن ہزار چوتھے زیج رمضان (کذا) | اورنگ شاہ کے دور میں نسخہ ہوا تمام

اور شعر افتتاحی حسب ذیل نقل کرتا ہے۔

اللہ مولا پاک ہے جو جگ سرجن ہار | جن دہا یار صدق سوں کوئے اترسے پار

میرے زیر نظر نقہ ہندی (مملوکہ پروفیسر سراج الدین آذر ایم۔اے) ہے جو ۱۲۳۳ھ کی نوشتہ ہے۔ اس میں خاتمہ کا پہلا شعر اسپرینگر کے منقولۂ بالا شعر کے مطابق ہے اور شعر دوم یوں ہے۔

سنہ ہزار چہ ہتر بیچ ماہ رمضان تمام
اورنگ شاہ کے دور میں نسخہ ہوا انظام

مگر شعر افتتاحی یوں ہے:-

حمد ثنا سب رب کوں خالق کل جہاں
لائق حمد ثنا کے اور نہ کوئی جان

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسپرینگر کے سامنے دو مختلف رسالے ایک ہی جلد میں ساتھ بندھے ہوئے تھے جن میں فقہ ہندی کا نمبر دوم تھا۔ اسپرینگر نے دونوں رسالوں کو ایک سمجھا اس لیے ابتدائی شعر پہلے رسالہ کا دیا۔ اور خاتمہ فقہ ہندی سے نقل کر دیا اسی لیے اس نے مصنف کے نام میں بھی غلطی کھائی ہے۔

فقۂ ہندی مصنف عبدی ہے نہ کہ محمد جیون۔ عبدی کا نام اس شعر میں آتا ہے

کیتے مسئلہ دین کے عبدی کہے آئین
فقہ ہندی زبان پہ بوجھو کرو یقین

اس کے علاوہ رسالہ کی زبان اس قدر پنجابی آمیز ہے کہ اس کو ہریانی زبان میں کسی طرح داخل نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کا صحیح نام پنجابی اردو ہے۔ ذیل کے اشعار سے ناظرین خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔

حمد ثنا سب رب کوں خالق کل جہاں
لائق حمد ثنا کے اور نہ کوئی جان

علم شریعت نال کے بھیجا پاک رسول
جو کچھ بھیجا رب نیں سب ہم کو قبول

یا رب اپنے فضل سوں بیحد بھیج درود
نبی محمد مصطفٰے تجھ سوں ہو خوشنود

بھیجوں اسکی آل پر اور اصحاب تمام
تس بھیجوں احباب پر بہت درود سلام

کیتے مسلہ دین کے عبدی کہے آئین
فقۂ ہندی زبان پر پوچھو کرو یقین

مطلب مسئلہ بوجھنا فرض عین کے جان — عربی ترکی فارسی ہندی یا افغان
علم شریعت بوجھنا فرض عین کے جان — بالغ عورت مرد کوں جو ہوئے مسلمان
چار علم سب فرض ہے بوجھو کرو قیاس — علم توحید نماز ہے روزہ حیض نفاس
تس کے پیچھے مومنا تہتر فرقہ جان — بہتر فرقہ دوزخی سو تبعہ شیطان
رافضی خارجی جبریہ مرجیہ بھی جان — جمریہ قدریہ ہر یکے سو بارہ فرقہ مان
فرقہ بہشتی مصطفےٰ اور اصحاب تمام — یہ فرقہ اسلام کا سنت جماعت نام
تس پر چار امام ہے چار رکن اسلام — ابوحنیفہ شافعی مالک احمد نام
سنی ہو دس چیز سوں یہ مسئلہ کر دیا — تفضیل دے دو شیخ کوں دوستی دو داماد
دو امام پیچھے نماز کر دو قبلہ کو جان — دو جنازہ پر نماز کر مسح دو موزہ آن
دونوں عید نماز کر اطاعت دو سلطان — راضی ہو تقدیر پر دو گواہی جان
گناہ کبیرہ بوجھنا لازم کر کے جان — اشراک باللہ اور مارنا ناحق مسلمان
سحر کرنا اور بھاگنا بیچ غلبہ کفار — عاق کرنا ماں باپ کا جو ہیں مسلم دیندار
کھانا مال یتیم کا بیاج کھانا جان — نو ہیں کبیرا متفق اور خمر و پچھان

دو ہاتھ نکالے ہاتھ سوں جب آکھے تدبیر — سر نہ چھپائی رفع کرائے صاحب تدبیر
چار انگلی کے فرق سوں (ہری) دھر کے دو پانو — جوتوں کھڑا نماز میں دیکھ سجدہ کی ٹھانو
دیکھ رکوع میں پانو کو سجدہ ناک تمام — قعدہ بیچ کنار کو کاندھا وقت سلام
حی علی الفلاح نہا ڈا ہوئے امام — قد قامت الصلوٰۃ شروع کرے امام
طرف قبلہ کر انگلیاں سجدہ کر بیچ ہاتھ — مونڈ برابر بیٹھ کے راکھ رکوع کے ساتھ
گھٹنہ دھر بھی ہاتھ سر سجدہ کوں لیاؤ — سر اٹھاؤ بھی ہاتھ کوں پیچھوں گھٹنہ اٹھاؤ

اس تصنیف کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بعض فارسی افعال کا استعمال

دیکھا جاتا ہے جیسے

لب بینی کے بال لے سارے ناخن چین ختنہ چھوٹی ازار کرسنت جان یقین

دیگر سے

استنجا سنت خاک سوں ڈھیلہ پتھر ساتھ چوب روئی اور برف سوں جو زنہار داست

دیگر سے

عیدگاہ کی راہ میں پکار کہے تکبیر پچھوں دوگانہ عید کی قربانی واجب گیر

عبدی پنجابی میں بھی ایک شاعر گذرا ہے جو رسالہ مہندی کا مصنف ہے اب رسالہ مہندی اور فقہ ہندی کی زبان میں قرابت قریبہ موجود ہے جس سے میرا خیال ہے کہ دونوں رسالوں کا مصنف ایک ہی شخص ہے مثلاً۔

فقہ ہندی سے

مسئلے آدمی دین کے مول نہ ہوئے فساد

دیگر سے

کیتے مسئلے دین کے عبدی کہے امین

رسالۂ مہندی سے

آکھاں وقت سوال دے مول نہ ہونے فساد

دیگر سے

واجبات نماز دے عبدی کہے امین

دونوں رسالوں کا وزن بھی ایک ہے اور جملوں کی ترکیب اور بندش پنجابی طرز میں ہے۔

ناصر علی سرہندی

آبِ حیات میں مذکور ہے کہ استاد ولی نے ناصر علی کو لکھا تھا ؎

اچھل کر جا پڑے جو مصرعِ برق　　اگر مصرع لکھوں ناصر علی کوں

ناصر علی نے جواب میں لکھا ؎

باعجازِ سخن گر اڑ چلے وہ　　ولی ہرگز نہ پہونچے گا علی کوں

پنجاب میں علی کی غزلیں ایک وقت میں بہت مقبول تھیں اور اب بھی پرانی بیاضوں میں مل جاتی ہیں۔ یہاں علی کے اردو کلام کا نمونہ ایسی بیاضوں سے دیا جاتا ہے جو محمد شاہ کے عہد میں یا اس سے چند سال بعد نقل کی گئی ہیں۔

نین تیرے ساغرِ حنا کے بھیتر اچھوں لب سوں بل پڑیگا　　ہو گئی نرگس خجل چمن موں نگلوں کی اکھیاں میں گل پڑیگا

دو تین کاری تھیں کہ جانی حیران کرتی لوگن کے تائیں　　خرابِ ہوگا تمام عالم جب ان نین موں تجلی پڑیگا

تمن کے ابرو کمان دستی پلک ہے خنجر چو تیر ناوک　　نظر غضب کی نہ دیکھ ساجن کوئی بچا یا او قتل پڑیگا

علی ملاحت تیرے سخن کی اگر زلیخا سنے گی کبھوں

مصر میں سودا دگر ہو دیگا درم نہ یوسف کا مل پڑیگا

(از بیاض پرتاب سنگھ نوشتہ سنہ ۹ جلوس محمد شاہی)

سجن تیرے حسن کا قرآں پڑھا ہے میں نظر کر کر　　نہیں پائی غلط اوس میں لکھا زیر و زبر کر کر

تیرے غم کا مجھے سوحن ہوا ہے کافیہ کافی　　شرح ملاں درس میں لسنی ہے بس بدر کر کر

معانی اور بیاں بھیتر بدیع اس کو سمجھتا ہوں　　پڑھی ہے حسن تیرے کی مطول جیسی فکر کر کر

کلام العشق ہمنا کوں سنا حکمت سوں منطق ہوں　　وگرنہ اس مطول کوں رکھا تھا مختصر کر کر

اصول اور ہندسہ کب لگ پھروں تکمیل اے یارا　　ہدایہ عشق کا غالب ہوا مجھ پر اثر کر کر

مگر دردی ساجن کے ہویا پیدا خط مشکیں لیا ملک سلیمانی مگر موراں ملک کر کر
جرس تجھ کاروان کا سن علی آں شوخ بے پروا کیا ہے بازہستی کا دے عزم سفر کر کر

(از بیاض نوشتہ محمد شاہ مرقومہ ۱۱۶۱ھ)

ایضاً

چندے سے مکھ پر بحال تکیں نپٹ شوخی ٹلک رہا ہے عجب ہے یاراں کی اک زنگی بملک پر دی اٹک ہا ہے
بت فرنگی تو قبل ہمار کھے جو برعکس جبیں دمادم ہوا ہے ہیوما جگت میں مشکل کہ تیغ ابرو سرکٹ ہا ہے
علی تفکر مقام جس کموں ہوا ہے حاصل زوصل جاناں جو چشم نرگس ہوا ہے حیراں بوصل دلدار چھلک ہا ہے

(از بیاض پرتاب سنگھ، نوشتہ ۹ سنہ جلوس محمد شاہی)

علی کا کلام فارسی ترکیبوں کی بنا پر محمد شاہی عہد کے شعراء کے کلام سے ممیز ہے
بگر دردی ساجن آں شوخ بے پروا ایت فرنگی بقتل ہمنا۔ جو چشم نرگس۔ جو تیر ناوک ایسی
بندشیں ہیں۔ جو قدیم شعرائے دہلی کے ہاں کمیاب ہیں۔ برخلاف اس کے پنجاب کے
شاعر ایسی ترکیبیں لانے کے عادی ہیں۔

شیخ ابوالفرج محمد فاضل الدین بٹالوی متوفی ۱۱۵۱ھ

بٹالہ سرزمین پنجاب میں ایک مردم خیز شہر ہے۔ میرزا نورالعین واقف فارسی کے
مشہور شاعر کا مولد و منشار یہی شہر ہے۔ بارہویں صدی ہجری میں اس شہر میں
مشائخ کا ایک مشہور خاندان ظہور میں آیا جس کے جد اعلیٰ شیخ ابوالحسن علی بغدادی معروف
بہ بدیع الدین شہید حسینی جیلانی ہیں۔ آپ بسبیل سیاحت عراق سے ہندوستان وارد
ہوئے اور یہیں رہ پڑے۔ عوام الناس میں عربی لباس کی بنا پر آغائے نام سے مشہور
ہو گئے۔ آپ کا مزار موضع سہاری من مضافات پنجاب ہے۔ آپ کے اخفاد میں ابوالفرج
محمد فاضل الدین بٹالوی نے خاص شہرت حاصل کی ہے۔ آپ شیخ محمد افضل

لاہوری کے مرید ہیں۔ بیس سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر تلاش معاش کی غرض سے شاہی لشکر کی شمولیت کی امید پر وطن سے نکلے۔ جب بٹالہ پہونچے۔ کچھ ایسے سوانحات پیش آئے کہ شراکت لشکر کے ارادہ کو ترک کر کے یہیں رہ پڑے اور تصوف ذوق لینے لگے آپ نے چالیس کتابیں اور رسالے اپنی یادگار چھوڑے[۱] ایک روایت[۲] ہے کہ تصانیف کی تعداد ایک سو سے زائد ہے۔ ان میں سے قصیدہ خمریہ حضرت غوث الثقلین پر آپ کی عربی اور فارسی شرح اور ترجمۂ مواعظ الرحمٰن کے نام ہم تک پہونچے ہیں۔ ۷ ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ میں بہتر برس کی عمر میں انتقال فرماتے ہیں غم عام تاریخ وفات ہے آپ کے والد کا نام سید محمد عنایت اللہ ہے جو شاہجہاں و عالمگیر میں سیالکوٹ کشمیر۔ کابل وغیرہ مقامات میں متفرق اوقات پر قاضی القضاۃ رہے ہیں اور خانبہادر کے خطاب سے سرفراز تھے آپ نے عربی اور فارسی علوم کی تحصیل مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی کے نواسہ ابوالحسن رحمتہ اللہ علیہ اور میاں محمد غوث لاہوری سے کی ہے

حضرت محمد فاضل بھی اردو میں شعر کہتے تھے۔ ان کا اور سید دلی اورنگ آبادی کا زمانہ تقریباً ایک ہے۔ یہاں میں آپ کی ایک مناجات جو عربی اور اردو میں ہے درج کرتا ہوں ؎

ناہی مرا چھٹ تم کوئی انظر بحالی یا نبی
ہے رین دن غفلت بڑی انظر بحالی یا نبی

اس فصل سوں راکھو مجھے من عزل درجات العفا
فریاد کرتا ہر گھڑی انظر بحالی یا نبی

بیٹھا ہوں خرابی میں پڑا الطفل شوا لخلق نحیف
اس غم ستی چھاتی سڑی انظر بحالی یا نبی

اس شرم سوں مجھ مکھ نہیں حتی ارے ضوالعفا
ہے مرگ بھی سر پر کھڑی انظر بحالی یا نبی

---

[۱] تذکرۃ الابرار غلام محی الدین بن عبدالکریم قادری پشاوری

[۲] بدر محی الدین صاحب خط (بحوالہ شرائف غوثیہ) از درگاہ فاضلیہ بٹالہ۔

برقع شریعت سیں سکھو حتی کوں بنو رو کرم ۔۔۔ اس عشق سوں کر کھل جڑی انظر بحالی یا نبیؐ
رو رو دکھوں رو رو دہر دن تقضا بقضا عاصیا ۔۔۔ افواج عصیاں سوجھڑی انظر بحالی یا نبیؐ
داکھو تھیں داکھو تھیں لی لیس غیر ک یا ملاذ ۔۔۔ نا ہیں مرا چھٹ تم ستی انظر بحالی یا نبیؐ

فاضل پکارے رین دن اشفع شفیع المذنبیں
فریاد کرتا ہر گھڑی انظر بحالی یا نبیؐ

(از بیاض مملوکۂ پروفیسر آزاد)

شیخ محمد نور

شیخ محمد فاضل کے پیر بھائی شیخ محمد نور ہیں۔ جو شیخ محمد افضل کے مرید ہیں ان کی ایک اردو مناجات یہاں نقل کرتا ہوں۔

بہر خدا تو اے صبا بغداد جا کر فریاد کر ۔۔۔ دربار میراں شاہ کے کہہ منتی مجھ سر بسر
ڈوبا ہیں غم کے چاہ سوں کر فضل مجھ بہر خدا ۔۔۔ تم بن مرا کو یو نہیں ہیں دست عاصی کا پکڑ
روتا ہیں اپنے حال سوں غفلت ستی حیراں ہویا ۔۔۔ زحمت سو مجھے مضطر کیا دیو دشفا خود کرم کر
تیرے مرید جو خاص ہیں ان کے سنگا ہوں میں سگ ۔۔۔ بہر خدا اور مصطفےٰ کر لطف کی مجھ پر نظر
حق نے تجھے سرور کیا دلیاں میں تم سر تاج ہو ۔۔۔ ہمسایا نہ کوئی نا ہوئے تیرے جیہا تا دن حشر
صد حیف مجھ عاصی تئیں تم حا ہوئے میر اسا ہیں ۔۔۔ دل کی سیاہی نا او ٹھے عالم کے تم ہو راہبر
بختوں کے جس گنا) مالے ہوئے وہ بار کلے آکر ۔۔۔ مجھ اسلئے کچھ نام کی ہے درد دل میں جان بہتر
تم سار کا جس پیر ہو او س کو نہیں پرواہ کچھ ۔۔۔ پائے دو جگ میں عافیت تیری نظر سوں سنگ وذر

ملہ فارسی کا پر تو ہے جیسے لوبے از کلنگان ۲ مجھ ۳ جیا ۴ کچھ۔

چاہو اگر مرُے تائیں زندہ کرو اک پل منے ۔ تم کی صفت مہ[1] کیا کروں تم سا نہیں کو یو دگر
خدا ڈیکے مر گرداب موں فکراں مستی مجنوں ہو یا ۔ مرنے میں کچھ باقی نہیں جیتا ہیں تم کی آس پر
قوت کہی[2] تجھ صبر کی ہے بیقراری روز و شب ۔ تم سیں مطلب آرام کی بد وہم تجھ گے دور کر
تم کی محبت دل مرا لیتا ہے اپنے دام سوں ۔ حق رب جا واثق مجھے پاؤں میں دنیا دین میں نہ
دلوے خدا توفیق گر تمکا اسم ہر دم پکڑ دل[3] ۔ تجھ اسم اعظم اسم ہے مشہور ہے عالم بھتر
پوچھا ہے کر تحقیق میں عالی تری درجات ہے ۔ صدقہ علی حسنین کا آفرق مجھ کے قدم دھر
دامن لگے گی لاج تجھ سن عاجزی مجھ کو شہا ۔ محفوظ کر دل جان بی دو جگ گا میرے خطر
دارو مبارک لب ستی تجھ کا کہو خود فیض سوں ۔ دل کی قساوت سب گوا روشن کر دسینہ جگر
عصیاں میں غرقاب موں سکی نہیں مجھ سے سوئی ۔ تجھ بارہی میں آگرا ہوں ناتواں بے بال و پر
کر کر تصدق تا تو کے باطن مرکی لے خبر ۔ رکھ شاد دنیا دین موں تجھ نفس شیطاں کا نہ ڈر
حق کی حضوری بخش تجھ مجلس محمد مصطفیٰ ۔ وہ قرب نبیا کر مجھے دو جگ ہواں میں شاد تر
بن دیکھنے اے شہا زندگی میری برباد ہے ۔ چہرہ مبارک تجھ دکھا تجھ سوں فدا دل جان و سر
غم کی تباہی سے چھوڑا کر دشمن تجھ سیں ہر بلا ۔ تو بادشاہ دو سرا مشکل مری آسان کر
افضل سائیں نائب تے میرے ٹھاکر نے دست جی ۔ برکت انھوں کے نام کی مجھ سیں گوا ہر شور و شر

میں تو رعاجز رات دن ہے درد تیری مدح کا
واصل خدا سے کر مجھے بے رنج بے محنت ضرر

یہ خانقاہی اُردو کے نمونے آج ہمارے کانوں کو نہایت عجیب معلوم ہوں گے لیکن ہماری تاریخی دلچسپی کی رو سے ان پر نگاہ ڈالی چاہیے۔ یہ تبرکات ایسے عہد کی یادگار ہیں جبکہ ابھی دہلی میں بھی سناٹا تھا اور میر و سودا کی غزل خوانی شروع

---

[1] میں [2] گئی [3] پڑھوں [4] ہوویں [5] پکڑنے۔

ہونے میں ایک عرصہ درکار تھا۔ ہمیں اس نظم کی بعض خصوصیات کو یاد رکھنا چاہیئے کر فضل مہجہ۔ مجھ پر فضل کر۔ میرا کوئی نہیں۔ میرا کوئی نہیں۔ دلیاں میں۔ دلیوں میں تیرے جیہا۔ تیرے جیسا۔ تجھ نام کی۔ تیرے نام کی۔ مہجہ کے اوپر۔ میرے اوپر۔ رحم سار کا۔ تم سرنگا۔ تم کی صفت میں کیا کردں۔ تمھاری صفت میں کیا کروں تم کا اسم ہردم پھردں۔ تمھارا اسم ہردم پڑھوں۔ بن دیکھنے تہجہ۔ تیرے دیکھے بغیر۔ مہجہ دیکھا۔ مجھ کو دیکھا۔ بعض الفاظ جو غلط تلفظ دیا ہے۔ مثلاً کرم قدم وغیرہ پرانی اردو میں اسی طرح بولے جاتے ہیں۔

موسیٰ

اسی عہد کا ایک ترجیع بند دیا جاتا ہے جس کے مالک موسیٰ ہیں ان کے حالات معلوم نہ ہوسکے ؎

ہم جیر نوں لاگے آن تیرے	جو پاویں درسن داں تیرے
دو جگ پر احسان تیرے	سبہ بندہ ہیں سلطان تیرے
سب وحش طیور انسان تیرے	لاگے ہیں دھیان اولیاں تیرے
دہارے ہیں عرش نشان تیرے	ہیں صدقہ اور قربان تیرے
کردں کوں بدر منیر میرے	یا غوث الاعظم پیر میرے
دو جگ میں شکر شیر ہو تم	یا داتا حضرت پیر ہو تم
رتبہ موں عرش منبر ہو تم	دکھیا کے دھیرج دہیر ہو تم
سبہ دلیاں بیچ امیر ہو تم	ہر اول اور اخیر ہو تم

قادر ہر ہر تقدیر ہو تم　　ہر شے موں بلا نظیر ہو تم
کر دل کوں بدر منیر میرے　　یا غوث الاعظم پیر میرے
تم محی الدین جیلانی ہو　　تم سانچے قطب ربانی ہو
تم سچے محبوب سبحانی ہو　　تم برحق غوث صمدانی ہو
تم حوض کوثر کے بانی ہو　　ہر مشکل کی آسانی ہو
کر دل کو بدر منیر میرے　　یا غوث الاعظم پیر میرے
میں عاجز تجھ دربار کھڑا　　کہنا تیرے دوار کھڑا
تجھ نام کا سے ادھار کھڑا　　کرتا ہوں یہ تکرار کھڑا
رنجیدہ دل لاچار کھڑا　　کاندھے پر غم اسوار کھڑا
مجھ ساتھ کا کھیوا پار کھڑا　　یا پیر میں پاپی دار کھڑا
کر دل کوں بدر منیر میرے　　یا غوث الاعظم پیر میرے
تم صحی پیراں سر پیراں جی　　تم سانچے حضرت میراں جی
تم کھولو بند اسیراں جی　　مجھ دکھ کی کاٹ زنجیراں جی
تم اکھیں[1] دیت بصیراں جی　　تم خوشی کی دیت دلگیراں جی
تم دھیرج دیت ادھیراں جی　　کیا ہند دکن ایراں جی
کر دل کوں بدر منیر میرے　　یا غوث الاعظم پیر میرے
نہیں غرضی مال منال کا ہوں　　آشفتہ تیرے جمال کا ہوں
مزدی تجھ جاہ و جلال کا ہوں　　شیدا تجھ قیل ار قال کا ہوں
میں بھکھو[2] کا تیرے وصال کا ہوں　　دیوانہ اسی خیال کا ہوں

---

[1] آنکھیں [2] بھوکا۔

میں منگتا اسی سوال کا ہوں — میں غرضی اس احوال کا ہوں
کر دل کوں بدر منیر میرے — یا غوث الاعظم پیر میرے
تو بادی راہ ہدایت کا — تو معنے فیض کی آیت کا
حامی ہیں روز عنایت کا — کافی ہیں کرم کفایت کا
ہیں داعی فضل رعایت کا — والی ہیں عین عنایت کا
ہے سایہ تیرے رایت کا — یہ شوق مجھے بغایت کا
کر دل کوں بدر منیر میرے — یا غوث الاعظم پیر میرے
تجھ مینھ کی کیتھا سیناہوں — کٹ ماسیس کپر لے سیتا ہوں
تجھ یاد کی بھکیا کیتا ہوں — اور خون جگر کا پیتا ہوں
تجھ نام لئے سیں جیتا ہوں — میں نیک عمل سیں ریتا ہوں
تجھ در کی ماٹی لیتا ہوں — مکھ پر یہ خاک رہیتا ہوں
کر دل کوں بدر منیر میرے — یا غوث الاعظم پیر میرے
تم غم مجھ دل سیں دور کرو — یہ بات میری منظور کرو
مجھ دشمن چکنا چور کرو — آتش میں دل منور کرو
سینہ کوں پر نور کرو — عشق اپنے سوں معمور کرو
مے اپنی سوں مخمور کرو — یہ پار ہمارا پور کرو
کر دل بدر منیر میرے — یا غوث الاعظم پیر میرے
ہم بیکس دیکھیں اور تیرا — مشہور جگت موں شور تیرا
ٹیکی موں باندھا چور تیرا — وہ چور تیرا میں دھور تما
رکھتا ہوں ڈیرا اور در تیرا
. . . . . .
ایماں ہے شکر معمور تیرا — . . . . . .

کروں کوں بدر منیر میرے — یا غوث الاعظم پیر میرے
ہر بوٹ ادگن کی بھاری ہے — مجھ لاگی آس تمھاری ہے
تجھ نام پر پورٹ اتاری ہے — دیکھ ایسی شکل ہماری ہے
میں تجھ درس پکھاری ہے — تو دستگیر نستاری ہے
مجھ سوخت رین اندھاری ہے — یا پیر مرے ایہ یاری ہے

کروں کوں بدر منیر میرے
یا غوث الاعظم پیر میرے

(از بیاض - پروفیسر آزاد)

یہ نظم اگرچہ ہم مصنف کے عقائد سے متفق نہیں، سادگی جذبات وادائے بیان کے لحاظ سے بلند پایہ رکھتی ہے۔ پنجاب میں حضرت شیخ عبدالقادر کے نام پر ایسی ہزاروں مناجاتی نظمیں لکھی گئی ہیں۔ بارھویں صدی میں پنجاب کی سیاسی ابتری نے اور بھی ان کو فروغ دیا ہے۔ عالمگیر کی وفات کے بعد وہ دور شروع ہو جاتا ہے جس کو پنجاب کے سیاہ ورق کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس عہد میں اس سرزمین پر آفتوں پر آفتیں ٹوٹیں، بلاؤں پر بلائیں نازل ہوئیں۔ سکھوں کی تاخت وتاراج، نادر کی آمد اور احمد شاہ درانی کے حملے ایسے واقعات ہیں جنھوں نے یہاں کے باشندوں کے قلوب کو یاس اور ناامیدی کے جذبات سے معمور کر دیا۔ قاعدہ ہے کہ مصیبت میں خدا یاد آتا ہے۔ لیکن خانقاہی اثرات میں پنجاب نے حضرت غوث الاعظم کو یاد رکھا۔ اور انھی کا کلمہ اکثر پڑھا۔

حضرت غلام قادر شاہ متوفی ۱۱۷۶ھ

شیخ محمد فاضل کے فرزند اور جانشین حضرت غلام قادر شاہ ہیں۔ جو علم و عمل زہد و تقوی۔ ریاضت و مجاہدات اور حال و قال میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ آپ کا لقب اہل اللہ ہے۔ تصوف میں متعدد تصنیفات آپ کے قلم سے نکلی ہیں جن میں سے صفاء المرات کا ہم تک نام پہنچا ہے۔ شب یکشنبہ ۵ ربیع الثانی ۱۱۷۶ھ میں رحلت کی۔ مخدوم فوت آپ کی تاریخ وفات ہے۔ اور غلام تخلص ہے۔

ان کی اردو مثنوی رمز العاشقین ان کے والد بزرگوار کی زندگی ہی میں تصنیف ہو چکی تھی۔ کیونکہ اس میں انھوں نے اپنے والد کو خطاب کر کے بعض شعر لکھے ہیں۔ یہ مثنوی میر اثر کی مثنوی خواب و خیال سے جو ۱۱۵۹ھ کی تصنیف ہے۔ اقدم ہے۔ اس مثنوی کے دو نسخے میرے پاس ہیں۔

(۱) محمد جان کے قلم کا نوشتہ ہے جو مصنف کے مرید اور سالے ہیں اور مصنف کی زندگی ہی میں اسکی کتابت کرتے تھے۔

(۲) ۱۲۰۴ھ کا نوشتہ ہے۔ عنوان کتابت پر سنہری اور رنگین گلکاری ایرانی تقلید میں ہو رہی ہے۔ خاتمہ میں یہ عبارت درج ہے "نسخہ متبرکہ رمز العشق تصنیف حضرت غلام قادر شاہ قدس سرہ ساکن بٹالہ تمام گردید ۱۲۰۴ھ" دونوں نسخے نسخ میں ہیں۔ بارھویں اور اس سے پیشتر قرون کی اردو تالیفات بالعموم خط نسخ میں ملتی ہیں۔ اور مسلمانوں نے گویا اس خط کو ہندی زبانوں کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ آج بھی پنجابی، سندھی اور پشتو زبانیں نسخ ہی میں لکھی جاتی ہیں اگرچہ اردو نے فارسی کی تقلید میں نستعلیق بعد میں اختیار کر لیا۔

اس مثنوی کا وزن عروضی خالص ہندی ہے۔ پنجابی لہجہ کی تمام خصوصیات اس میں موجود ہیں۔ اس مثنوی کی شرح شیخ کے پوتے شیخ ابواحمد محمد شاہ المتوفی سنہ ۱۲۲۴ھ نے لکھی ہے۔ اسکے متعلق صاحب تذکرۃ الابرار لکھتے ہیں۔

"دررمز العشق تصنیف جد بزرگوار خود بغایت شرح مرغوب وپسندیدہ نوشتہ و درکشف حقائق و تصوف بیان اسرار و اصطلاحات حضرات صوفیہ تعمق فراواں و تحقیق بسیار نمودہ"۔

رمز العشق میں عربی الفاظ کا استعمال کثرت کے ساتھ دیکھا جاتا ہے ایک وجہ تو اسکی یہ ہے کہ تصوف کی تمام اصطلاحات عربی ہیں۔ دوسرے حضرت غلام قادر شاہ صاحب خود عربی کے فاضل ہیں۔ اور اس زبان سے زیادہ مزاولت رکھتے ہیں ذیل میں مثنوی کا نمونہ عرض ہے۔

افتتاحیہ:۔

وہی وہی نہ دوجا کوئی — پرگھٹ ہو یا محمد ہوئی۔
احمد محمدؐ ایک پچھانوں — ایک ہی دیکھو ایک ہی جانوں
حمد کہو اور بہت درود — فہو الحامد المحمود
اول آخر باطن ظاہر — ناہیں اس سے کویو باہر
انا من نورہ سنو بیان — والکل نوری دہر دھیان
سمجھ لیو اور بوجھو بات — ایک ہی ذات ہے ایک ہی ذات
سبہ بڈیائی اسے مسلم — صلی اللہ علیہ و سلم
صلی اللہ علیہ و آلہٖ — ومن اشتاق بنور جمالہٖ
سیما شیخی عبدالقادر — نعم المولیٰ نعم الناصر
فاضل شاہ کا لے کر نام — سنو حقیقت کہے غلام

دل سوں سنوں حقیقت ساری ایک حقیقت سب موں ساری
آپ سنے اور آپ سناوے کیا کہے کچھ کہا نہ جاوے
وہی سمیع، بصیر، علیم ناہیں اس کا کوئی سہیم
کان دلبر لاشی معہ شیئاً وھوالان کما کان کہیا
غیر کہاں ہے دیکھا پیارے آپ ہی آپ ہے ہر ہر جا رے

سات مراتب بوجھ پیارے ہر ہر کے ہیں حکم نیارے
ست گر سوں توں کر تحقیق ناں ہو ملحد ناں زندیق
فرق ار جمع موں فرق پچھان پھر دونوں کو ایک ہی جان
بوجھ لیو تنزیہ کیوں خوب ناں ہو ملحد ناں محجوب
بھی تشبیہ کوں جانوں نیک پھر دونوں کوں مانوں ایک
ظاہر موں ہے وحدت کثرت باطن موں ہے کثرت وحدت
قدم وجوب کے سبھ اسماء جانوں فاعل فی الاشیاء
ازلی ابدی ہیں درکار نافہ معطل ناں بے کار
اس شہد موں ہے مسجود فہو القاصد والمقصود
یوں ہے سب اسماء کیانی حادث جانوں اور نقصانی
اس مظہر میں راکع ساجد فہو الطالب وہو العابد
بندے کا ہے طاعت کام واعبد ربک سنوں کلام
کرو عبادت دن اور رات شرک ار شک سوں ہووے نجات
کرو عبادت شرع آئیں حاصل ہووے نور یقیں
جس کو ناہیں شرح گواہ جانوں اس کوں تم گمراہ

حق نے کہیا نورِ مبین — شرع کوں بیچ کتاب متین
جس کوں حاصل ناں یہ نور — طبع ہوا کا ہے مغرور
ناں ہوا اس کوں قرب وصال — شرع بناہے قرب محال

ازخاتمہ ؎

دین دنی کا پشت پناہ — والی میرا فاضل شاہ
قطب حقیقت شمس یقین — نور محمد سر الہ
عارف کامل دل آگاہ — نور محمد سر الہ
اول آخر ظاہر باطن — ہاتھ ہمارے اس کا دامن
ناہیں اس بن کو یو میرا — اس کا ہوں میں اس کا چہرہ
ناں کسی سوں مجھ کو کام — وہی ہے مولا وہی غلام
اپنے شہ کا لے کر نام — کہیا رمز العشق تمام
حمد کہوں ار بہت سلام — اول آخر نیک کلام
یارب صل علیہ و آلہٖ — واجعلنی فی حبہ و آلہٖ
اللّٰھم بنور جمالہٖ — شرفنی بالحال و قالہٖ

آیندہ نعتیہ غزل حضرت غلام قادر شاہ کی تصنیف ہے۔ میں اس کے صرف چند اشعار پہ اکتفا کرتا ہوں ؎

سب دیکھو نور محمد سب دیکھو نور محمدؐ کا — سب بیچ ظہور محمدؐ کا سب دیکھو نور محمدؐ کا
وہ نقطہ علم ازل کا ہے اول ہر اول کا ہے — وہ مجمل ہر مجمل کا ہے سب دیکھو نور محمدؐ کا
وہ منشا اسما کا ہے وہ مقصد سب اشیا کا ہے — وہ سر ظہور خفا ہے سب دیکھو نور محمدؐ کا
کہیں ظاہر ہو مشہور ہوا کہیں باطن ہو مستور ہوا — کہیں ناظر ہو منظور ہوا سب دیکھو نور محمدؐ کا

کہیں کلمہ حق کا نور اللہ کہیں بیچ پنگوڑے عبداللہ سبحان اللہ سبحان اللہ سب دیکھو نور محمدؐ کا
کہیں شمع کہیں پروانہ ہے کہیں دانہ کہیں دیوانہ سے کہیں یار کہیں بیگانہ ہے سب دیکھو نور محمدؐ کا
وہ آپ ہی آپ عیاں ہویا کہیں کثرت کا ساماں ہویا ہر شان ہو وہ ہر شان ہو سب دیکھو نور محمدؐ کا
کہیں غوث تمام کہایا ہے کہیں مولانا دہرایا ہے
کہیں عبد غلام کہایا ہے سب دیکھو محمدؐ کا

شیخ نصیر الحق

شیخ فاضل الدین کے مرید شیخ نصیر الحق ہیں۔ یہ فارسی۔ ہندی۔ پنجابی اور اردو کے شاعر ہیں۔ اردو میں انھوں نے خصوصاً بے شمار نظمیں لکھی ہیں۔ نصیر اور نصیرا تخلص کرتے ہیں۔ مناجاتیں۔ تو تا برہی اور رکھر دلی اکثر لکھتے ہیں۔ ان کا کلام بہت ہے میں صرف بعض مثالیں یہاں دیتا ہوں۔

اے نصیرا وقت ہے یہ وقت پھر نہ پائیے سر کاٹ لے کر ہاتھ پر آگے پیا کے جائیے
صورت نہ سیرت کچھ مینے کس راہ پیا کون پائیے فاضل سائیں ہے بوالفرح ان کے تصدق جائیے
آتش پڑی ہے سر مرے اس عشق دھندوکار کی بھنہ تن جلا کولا کی صورت بھی انگار کی
بجلی پڑی مجھ غیب سیں اس ابر آتش بار کی فاضل سائیں کو جا کہہ یہ خبر اس بیمار کی
جھانکی دکھا دیو کی کر کرم اس آزار پہ قربان کر سب جان و تن اس غوث قطب بے بدا پہ
جو نام سن سن کا نیتے تھے یہ دہا مجھ آئیاں ہے رسے جیا اکیلا کروں فخ جان یکیاں ہائیاں
تلوار جمدہر سار کی لے تیر تر کش آئیاں تجھ بن گرا ابکچھ نہیں اے شاہ فاضل سائیاں۔

جوگن بھئی میں اے پیا ہو ہو تیری پکار کی
فاضل سائیں پیہیا دیہو نیں ابتر بازی ہار دی

دیگر مناجات تصنیف حضرت نصیر الحق

یاغوث سید محی الدین لیتے خبر اس راز کی — گر کر تصدق پایوں کا جھانکی وہو دیدار کی
ہاہیڑ سے پڑ سے برہوں اگن جلتا پڑا مجھ رین دن — مجھ کوں بتا دو وہ سجن دیوے خبر دلدار کی
راکس برہوں جب لیا اس ماس سب جن کھا لیا — اب ہاڈ کھاوُں تھا لیا جو کچھ ہے اس خونخوار کی
دیکھے بناق پیارے سجن کیوں کر کٹھوں من رین دن — لیا دو مجھے دیو دو کٹھن ہوئے مکھ چنچباز کی
دیو دکھائی لے پیا تم بن سکوں کیوں کر جیا — برہوں مجھے بیکل کیا طاقت نہیں اس بہار کی
نس دن مجھے ہے رونا رو رو مجھے جی کھو دنا — یہ مو کھا ہو سیں دکھ نا نشتر لگی ہے سار کی
کب لگ میاں دکھ موں جو دل بار خنجر میں مردوں — سر کاٹ کر آگے دھروں کر بیٹھ اس دلدار کی
وہ پیر پیر راہ ہے سب جگ کا شاہنشاہ ہے — وہ محی الدین دلخواہ ہے ہو خاک اس دربار کی
فاضل سائیں کرنا کرم چرنوں لگی کی کر شرم — لیاؤ مجھے دیو دو تم جہاں کی دیلا دو یار کی

کہہ اے نصیرا کیا کروں برہوں کی بکھ میں جر مروں
جر سنے نہ ہر گز دم بھر دل یہ تھوڑا نا گفتار کی

شاہِ مُراد

شاہ مراد غالباً اسی عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں ان کے حالات سے واقف نہیں۔ نمونۂ کلام ذیل میں عرض ہے۔

اب کیا کرے کوئی رے جیا جب انکھوں سے پیا دور ہو یا — تن لکڑی ہو جل اکھ بجھا یہ سینہ گرم تنور ہو یا
وہ نور سجن کوں حسن نے دیا یہ چاند چوس کا حق نے دیا — یہ سورج ہے وہ آپ پیا پر نور ہو یا مشہور ہو یا
وہ قد پیا کا قامت ہے یا شعلہ نور قیامت ہے — یہ قد نہیں ہے قیامت ہے وہ دھوم پڑی ہے شور یا
تیرے مکھڑے پر اک خال پیا جس دیکھا گھر پامال کیا — یہ نقطہ ہے بسم اللہ جو مصحف پر منظور رہو یا
وہ خال لبوں کے نہو پڑا جیوں ناچل پر عاشق بھور پڑا — بازر پر آکر جو پڑا یا قند شکر پر مور ہو یا
بن پانی محمود نہیں بن جانی دل مسرور نہیں — بن درد عمل منظور نہیں جو عاشق ہے مغفور ہو یا

اس خاکی تن کون چارہ کروں سر صدقہ تیر دارے کروں تجھ باج نہ دوجا یار کروں یا نازک تن منظور ہویا
جس سرانا الحق جان لیا تس خون جگر کا چھان لیا سر کہکر جیو قربان کیا وہ چڑ سولی منصور ہویا
وہ مجنوں آپی لیلیٰ ہے وہ یوسف آپ زلیخا ہے وہ موافق آپے عذرا ہے مشتاق ہو خود مغرور ہویا
دن رات پیا بن سوتی ہوں دو نین بتجو بھر روتی ہوں کہ لعل شراب سے دھونی ہوں نت رونا مجھ دستور ہویا
تمے درسن کی مدماتی ہوں تری کاج سونت بڑانی ہوں تمے گن کی مالا گاتی ہوں گ تاراں تن طنبور ہویا
دن رات جو تیری چاہ مجھے یہ آگ برہ کی ناہ مجھے نت جلتے ہیری ماہنہ مجھے سرمہ تن کوہ طور ہویا

یہ شعر عجب مستاد سوں ہے یہ دل پر جس آباد معمول ہے
یہ ریختہ شاہ مراد سوں ہے مقبول ہو یا منظور ہو

یہاں ایک ضروری امر کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اوپر میں نے جس قدر پنجابی اردو نظموں کے نمونے دیئے ہیں وہ اس تحریک سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے جو بارہویں صدی کے ربع دوم میں دہلی میں ولی اورنگ آبادی کے دیوان یا خود ولی کے آمد سے تعلق رکھتی ہے۔ میر حسن کا بیان ہے کہ ولی عہد عالمگیری میں دہلی آئے۔ لیکن آزاد ۲ سنہ جلوس محمد شاہی اس کی آمد کا سال بتاتے ہیں۔ میں آزاد کے بیان کو ترجیح دیتا ہوں کیونکہ ولی کا محمد شاہ کے عہد میں دلی میں موجود ہونا خود ولی کے ایک شعر سے جو مولانا آزاد نے آب حیات میں نقل کیا ہے ثابت ہے سے

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

گویا بقول آزاد ولی ۱۱۳۵ھ میں دہلی میں وارد ہوئے اور اس عہد سے دہلی میں اردو غزل گوئی عام رواج پا گئی ورنہ اس سے پیشتر شعرا کے لیے فارسی یا بھاشا کا میدان کھلا ہوا تھا جس میں وہ اپنی طبیعت کی صنعت گری کی بہار دکھاتے تھے اردو میں غزل گوئی کی بنیاد اگرچہ ولی کے عہد سے بہت قدیم ہے۔ لیکن ہندوستان میں ولیت کا تاج ولی کے سر پر ہی دکھا گیا۔ چنانچہ ہمارے قدیم تذکرہ نگاروں نے اسی کو اردو

شاعری کا آدم مانا جاتا ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں ولی کے طفیل اس قسم کی شاعری جو فی الحقیقت مسلمانوں کی طبیعت اور رجحان کے زیادہ مناسب تھی رواج میں آئی۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ تحریک بڑی سرعت کے ساتھ اس عہد کے تعلیم یافتہ طبقہ کے قلوب میں گھر کر گئی کیونکہ اس شاعری کا دارومدار زیادہ تر فارسی جذبات پر تھا اور فارسی خواں گھر گھر میں موجود تھے درحقیقت اردو شاعری فارسی کا پرتو ہے۔ فارسی کے تمام قواعد منجملہ عروض و اقسام شعر کو اس میں منتقل کر لیا گیا ہے۔ وہی بحریں ہیں وہی ردیف قافیہ کی پابندی۔ وہی خیالات و جذبات، صنائع و بدائع، تشبیہات استعارات و تلمیحات وغیرہ وغیرہ لیکن پنجاب کی نظموں کے گزشتہ نمونے کئی امور میں مختلف ہیں اول توان کی بحریں زیادہ تر مقامی ہیں دوسرے ان میں اگرچہ ردیف کی پابندی کی جاتی ہے لیکن قافیہ کا لانا لزوم مالا یلزم مان لیا گیا ہے پھر وہ جذبات میں فارسی سے مختلف ہیں ہندی میں عاشق اکثر عورت ہوتی ہے۔ ان نظموں میں بھی یہی خصوصیت موجود ہے وہ فارسی صنائع و بدائع و تشبیہات سے بالکل عاری ہیں اور اس شاعری کا مدار ایہام پر نہیں ہے جیسا کہ ہم ولی اور اسکے پیروؤں میں دیکھتے ہیں۔ ہم کو تعجب آنا چاہیئے کہ اردو کے دو مختلف مرکزوں میں دونوں تحریکیں ایک ہی وقت میں مصروف کار ہیں لیکن ایک کو دوسری کی خبر نہیں ہے۔

اس صدی کے تیسرے برس میں دہلی کی تحریک پنجاب پہونچ گئی ہے اور مختلف نظموں میں ہم اس کا اثر دیکھتے ہیں سب سے پیشتر جذبات میں اور زبان میں تبدیلی محسوس ہوتی ہے پرانے الفاظ اکثر متروک کر دیئے جاتے ہیں اور تکلف رفتہ رفتہ مذاق میں غالب آنے لگا۔ قدیم سادگی برطرف ہو جاتی ہے۔ اور طبائع میں میلان زیادہ تر تصنع کی طرف پیدا ہونے لگا۔ بحریں فارسی اختیار کر لی جاتی ہیں اور ردیف و قافیہ کا التزام ضروری مان لیا جاتا ہے۔

محمدؒ جان

محمد جان حضرت غلام قادر کے مرید اور رسالے ہیں۔ تصنیف میں صاحب تصنیف اور فارسی و اردو میں شعر کہتے ہیں۔ یہی محمد جان مثنوی رمز العشق کے کاتب ہیں جس کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے میں اپنے عزیز شاگرد سید ذکاء اللہ تھرڈ ایر اسلامیہ کالج کا ممنون ہوں کہ انھوں نے چند اوراق محمد جان کی نظموں کے ... بہم پہنچائے۔

محمد جان ... پنجاب کی نظموں میں دہلی کا پرتو نظر آنے لگتا ہے اور فارسی بحروں کا رواج ہو جاتا ہے۔ نمونہ کلام ؎

بلبل کی طرح دل کے جھنجھلانے کون کیا کہیئے
زنجیر میں زلفوں کی پھنس جانے کون کیا کہیئے

رو رو کے عبث دل کے جلجانے کون کیا کہیئے
بسمل ہو تڑپتا ہے مر جانے کون کیا کہیئے

کیا کام کیا دل نے دیوانہ کوں کیا کہیئے
سر اپنے کو ہر صبح پتھر سوں ٹپکتا ہوں

کر یاد پری رو کی رو رو کے سسکتا ہوں
دو نین دو دریا کر دوں زین پھرکتا ہوں

کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہیئے
کچھ کرتے ہوائے یار و مجھ زار کی اب کاری

پلکوں کی خدنگوں سیں دل پر ہے ستم گاری
دلبر کے جفا سیتی ہر وقت گھبر باری

ہر صبح کا وہ رونا ہر شام کی یہ زاری
کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہیئے

کر یاد تیری ... جی وارنے کرتا ہوں
سر کاٹ کے گردن سوں تجھ پاؤں پہ دھرتا ہوں

تجھ تیغ تلے اگر دم ایک نہ بھرتا ہوں
ہنستا ہوں خوشی سیتی پھر شوق سیں مرتا ہوں

کیا کام دل نے دیوانے کوں کیا کہیئے
تجھ تیغ تلے کہ تو سر اپنے کوں دھر دیجئے

خونابہ انکھوں کا ہر شام و سحر پیجئے
مرتا ہے لکھا سر پہ کیا اور پہ دھر دیجئے

قسمت موں لکھا جو ہے دنیا موں سو بھر لیجیے — کیا کام کیا دل نے دیوانے کوں کیا کہیے
آذیج نہ کر ہم کوں ڈر اپنے خدا سیتی — کیا قتل غریبوں کوں کرتا ہے حیا سیتی
تن چھوڑے ہی پڑنے ہے تجہ جور و جفا سیتی — رو کے رشکے پر لکھتا ہوں ہجراں کی بلا سیتی
کیا کام کیا دل نے دیوانے کوں کیا کہیے — کیا پوچھتے ہو مجھ سیں غم یار کا کھاتا ہوں
کر لخت جگر اپنا آنکھوں سے بہاتا ہوں — محبوب کیے ہجراں میں دن رین لنگھاتا ہوں
گزرے ہے جو کچھ مجھ پر دلبر کوں سناتا ہوں — سنتے ہو اوے یارو کچھ چشم مروت ہے
مرتا ہوں میں غم سیتی کچھ تجھ میں فتوت ہے، — خوں آنکھوں سیں جاری ہے کچھ مجھ میں نفوت ہے،
کچھ میری کر دلداری کیا ایسی اخوت ہے، — کیا کام کیا دل نے دیوانے کوں کیا کہیے
سنتا ہے محمد جان کیا گریہ و زاری ہے — خاموش صفت ہوناں کیا بات پیاری ہے
وہ فضل کرے اپناں یہ بات نیاری ہے — مغرور عبادت پر احسان شماری ہے

کیا کام کیا دل نے دیوانے کوں کیا کہیے

یہاں ایک نامعلوم شاعر کی غزل کے چند شعر دیئے جاتے ہیں جن کے لیے گویا انشاء اللہ خاں نے مصرع "بحرِ رجز میں ڈال کے بحرِ رمل چلے" لکھا ہے اس میں پہلا رجز میں دوسرا رمل و رجز میں تیسرا رمل میں اور چوتھا رمل و رجز میں ہے چنانچہ:

اس شمع رو کوں دیکھ کے دل جل گئے دیوانہ ہوا — تیری گرہ کا کیا گیا میں سب سیں بیگانہ ہوا
ہے تجھے میوے کی خواہش چل توڑ لیجئے باغ میں — تیری تو خاطر باغ میں انگور بیدانہ ہوا
بیوفائی مت کرو اے لیلیٔ صاحب جمال — مثل مجنوں کے معاشر مست دیوانہ ہوا
اے صنم تم مت نہ پوچھو بات میرے حال کی — تیرے کناں کو دیکھ کر میں آپ دردانہ ہوا

اس نقص کے باوجود زبان میں بے حد اصلاح ہوگئی ہے۔

میاں احمد

غزل ذیل ایسی بیاض سے منقول ہے جو سنہ ۱۱۶۱ھ میں لکھی گئی ہے ؎

چوں شب گذشت صبح چو ہی تب سمجھ پری
جاگن نہ ہوا ایک گھری تب سمجھ پری

جب مرگ کا پیالہ پیا آنکھ کھل گئی
جب کھاٹ پر جو دیہ دھری سب سمجھ پری

تو تنک نہالیوں سے نجھے فکر نا ہوا
جب ایٹ نہ زیر سیس دھری تب سمجھ پری

جس وقت یار چھوڈ چلے ہم رہے نکو
منکر نکیر پوچھ دھری تب سمجھ پری

حساب کا جو وقت ہوا آنکھ کھل گئی
چیتھی عمل کی آپ پڑہی تب سمجھ پری

عمر اتمام گذر گئی عمل نہ ہوئی
جب عمر کی دوپہر ڈھلی تب سمجھ پری

احمد کوں (کذا) طرف کوئی نہیں جز خدا رسول
جب فضل پر امید دھری تب سمجھ پری

محمدؐ

محمدؐ بارھویں صدی کے منتصف دوم سے علاقہ رکھتے ہیں۔ مربع آیندہ انہی کا کلام ہے ؎

قرباں خدا کے ہوں جس راہ دکھلا ہے
اور ہوش دیا مجھ کوں جس سیتی یہ کھالا ہے
محبوب مرا سندر سب جگ کا اوجالا ہے
اور عرش و فرش کے بیچ سب جیز میں بالا ہے

دل اپنا میں خوں کر کر آنکھوں سے بہاتا ہوں
اور خون جگر تائیں ہر آن میں کھاتا ہوں
فریاد و فغاں سیتی اک دھوم مچاتا ہوں
پھر یار نہ پہنچا ہے یہ کون سا چالا ہے

آہوں سے مری بدری افلاک اوپر چھائی
سینے سے نکس آتش ہو برق عجب دہائی

نینوں سے برس بوندیں ہر نہر اچل آئی
اس عشق کی شورش کا کچھ راہ نرالا ہے
دن رات تڑپتا ہوں اس یار کی صورت کوں
آدم گیا مجھ سوں پچھتا ہوں جہورت کوں
تا جاں سیں قدم کر کر جا یار کی مورت کوں
سر کاٹ دھروں آگے یہ طور سکھالا ہے
بن یار کے اب جینا دشوار نظر آئے
تا جان نکس جاوے یا اس کی خبر آوے
محبوب نہیں آتا کس طور صبر آوے
لا چلد اگن لاکر جیو جان کو جالا ہے
اے شاہ مرے والی مرتا ہوں بنا تیرے
مجھ سار کے تجھ در پر کتنے ہی پرے پھیرے
الفت میں تیری برہن رہتی ہیں مجھے گھیرے
پھر ہاتھ سیں گل لالے گرد در یہ بہالا ہے
تم غوث جہاں کے ہو سکھ بخش تمہارا ہے
دکھیا ہوں پرامرتا تجھ آگے پکارا ہے
دیدار دکھا اپنا تم ہجراں نے مارا ہے
نو کر ہوں ترے در کا تیرا ہی سنبھالا ہے
تجھ طرف پڑا دیکھوں شاید کہ کرم ہووے
اس جلنے سیں چھٹ دن چار میری سکھ یاد ے
دل لاتی سیں نکس آوے اور دکھ کو سبح دھووے
دنیا کے تعلق سبھوں یہ دیس نکالا ہے
بس کر توں محمد اب اس قصۂ عجائب سوں
کس کس نے کیا اور اک اس بات غرائب سوں

پیر اپنے سیں تو جا کر کر دور نوائب کوں
جن پیر کی صورت سوں سب جگ کا اجالا ہے

(از بیاض پروفیسر آذر)

بدھ سنگھ

بدھ سنگھ کا زمانہ بارھویں قرن ہجری کے نصف ثانی سے تعلق رکھتا ہے اسکی غزل ایسی بیاض سے نقل کی جاتی ہے جو ۱۱۸۱ھ سے قبل کی نوشتہ ہے۔ وھو ہذا

ڈھونڈا بہت جن یو میں پایا نہیں ہنوز
ملیا رقیب سا نہ جو آیا نہیں ہنوز
لذیک نگاہ ترچھی ہوا خاک سار دل
دامن لے دم کے ہاتھ لگایا نہیں ہنوز

شمشیر چشم کھینچ ڈراتے ہو کیا سجن　　سر مرے کے رنگ سوں آب دو آیا نہیں ہنوز
اس زلف پیچدار کیا پیچ پیچ دل　　مار سیہ کوں ہاتھ لگایا نہیں ہنوز
بدھ سنگھ نہ ہو تو بیدل از اغماض دلفریب
گر ہے جواب خاص خط آیا نہیں ہنوز

بارہویں صدی کے ایک پنجابی سنگھ سے اس سے بہتر نمونہ شاعری کی توقع کرنا غالباً ہماری زیادتی ہوگی۔

خفیہ بیگم

ایک دلچسپ پہلو اس عہد کا یہ ہے کہ عورتیں بھی اردو میں شاعری کرنے لگی ہیں ان میں خفیہ بیگم خفیہ تخلص والدہ میر صابر ہیں۔ ذیل کی غزل انھیں کی یادگار ہے ؎

آشنا سخن ہے دل میں سمائی ہو جاوے گی　　جہاں منھ سے بات نکسی پرائی ہو جائے گی
اب پھول سے جدا نہ کرو عندلیب کوں　　فصل خزاں میں آپ جدائی ہو جائے گی
اس رسی سے دور کرو زنگ کینہ کا　　تب تو دلوں میں آکے صفائی ہو جائے گی

لہ ایک دن سودا کے یہاں میر سوز تشریف لائے۔ ان دنوں شیخ علی حزیں کی ایک غزل کا چرچا تھا جس کا یہ مطلع ہے۔ بیگر فتیم بجاناں سر رہے گاہے۔ ادم از لطف نہاں دا اشتہ ہے نگاہے
میر سوز مرحوم نے اپنا مطلع پڑھا ؎
نہیں نکہ ہے مرے دل کی اپا ہے گاہے　　اے فلک بہر خدا رخصت آہے گاہے
مرزا سنکر بولے کہ میر صاحب بچپن میں ہمارے پشورہ کی ڈومنیاں آیا کرتی تھیں یا تو جب یہ لفظ سنا تھا یا آج سنا ہے میر سوز بچارے ہنس کر چپ ہو رہے۔ (آبحیات)

یا تو فغاں کرے گی مری کوچہ او سے اٹھ — یا آہ میری تیر ہوائی ہو جاوے گی
میرے بلانے سے ترا کچھ گھٹ نہ جاوے گا — بر عاشقاں میں میری بڑائی ہو جاوے گی
میرا خیال لوگوں نے بگڑا ہے آکے کیوں — ناحق کسی سوں میری لڑائی ہو جاوے گی
اس دعوی میں تو خفیہ خدا کوں دکھوں گی میں — اس کی طرف تو ساری خدائی ہو جاوے گی

میر صابر

میر صابر نے اس کا جواب دیا۔

کب جاتے تھے تو جھ سیں جدائی ہو جاوے گی — غم کی منادی دو کھ کی دوہائی ہو جاوے گی
ہونے دے مجھ کوں اپنا تصدق اب یک بار — کچھ اس تمھیں پیارے تیری بھلائی ہو جاوے گی
گر سینہ صاف ہو کھلے بنداں گلے لگو — اتنے میں دل کی کامروائی ہو جاوے گی
ابرو کی چیں دور کر آخر سنو گے تم — یہ ترشی ایک روز مٹھائی ہو جاوے گی
دیکھو نگاہ قہر سوں آوے اگر رقیب — اوس بے حیا کوں چشم نمائی ہو جاوے گی
صابر یہ بات جس نے کہی آفریں اوسے — جہاں منہ سے بات نکسی پرائی ہو جاوے گی

مخمس ذیل بھی اسی عہد کا معلوم ہوتا ہے ؎

بات پر خوف ٹھگا لگا ہیگا — راہ میں چور کا دبا ہے گا — دین اندھار موں غار ہیگا
بے تجھے سودنا خطا ہیگا — جاگیو جاگنا بھلا ہیگا
جاگدے پر نہیں پڑے کوئی چور — جاگدے پر نہیں کرے کوئی زور — جاگنے کا نفع جو ہیگا زور
جاگنا خوب ہے خصوصاً بھور — جاگیو جاگنا بھلا ہیگا
اے بتاؤ تو تجھے نہیں سونا — سودنا پونجی ہاتھ سوں کھونا — پونجی پھر نا نہ تار ہا تھ میں ہونا
بے خبر اس سرا مو تہیں سونا — جاگیو جاگنا بھلا ہیگا
اے مسافر تجھے ہے جانا دور — ماندہ ہو کر تھکا ہیں بیکنا چور — اس سرا بیچ تو نہ ہو مغرور

نیند کے ہاتھ مارے گئے ہیں سور جاگیو جاگنا بھلا ہیگا

کون اس ٹھانو میں ہاں ٹھہرا ڈاکہ ہے ہاتھ موں دویں صحرا باہر و پر نہ بھول وہ لہرا
باہر و ہوت اپنا گھیرا جاگیو جاگنا بھلا ہیگا

ہیں جو کوچھ کرنا ہے سو کر لے آج پھر نہ ہر دے گا یہ تیرا اراج الٹ مارین گے تیرے سر سوں تاج
اس وقت کیا رہے گا تیرا لاج جاگیو جاگنا بھلا ہیگا

کوچھ سمجھ بوجھ اے ناداں اپنی غفلت سوں تو نہ ہوشاداں رات کو سنتا ہیں تو اپنے کان
دمبدم بولتے ہیں گشتی بان جاگیو جاگنا بھلا ہیگا

ساتھ تیرے رہیں فرشتے دو نیک و بد کرتا ہیں سو لکھیں او قبر میں پوچھوں گے فرشتے دو
اس وقت کیا جواب دے گا او جاگیو جاگنا بھلا ہیگا

رحمٰن

اگر مجھ باغ میں دیکھے تو بلبل درچمن لرزے میرے غم کی اگن سنکر دوزخ کی اگن لرزے
جنیئو پہنکر گل میں کروں پھر بت پرستی میں مرا ثابت کفر دیکھکر یکایک برہمن لرزے
اگر مجنوں کی تربت پر گزر جاؤں دیوانہ ہو جو میرے حال کو دیکھے تو مجنوں درکفن لرزے
اگر رحمٰن کہیں جگ میں سخن خوبی نزاکت سوں عجب کیا ہے غزل سنکر مگر سادا کن لرزے

(از بیاض پروفیسر آذر)

نعمت اللہ

جس دل میں ہے غم یار کا عشرت کیے تئیں کہہ کیا کرے جو تشنہ لب یار کا شربت کے تئیں کہہ کیا کرے
جو عشق کی آتش میں جل کر طالب ہو یا دیدار کا دوزخ سیتی وہ ڈرتا نہیں جنت کے تئیں کہہ کیا کرے
جو عشق کے بازار میں بدنام اور رسوا ہو یا طالب نہیں وہ نام کا غیرت کے تئیں کہہ کیا کرے

اسباب دنیا ترک کر جو بے سر و ساماں ہو رہا حاجت اسے کیا مال و دولت کے تئیں کہہ کیا کرے
لقماں افلاطون جیسے دنیا سیتی جاتے رہے دارو نہیں کو چہ موت کا حکمت کے تئیں کہہ کیا کرے

جب عشق خوباں از ازل ہے نعمت اللہ کے نصیب
تقدیر پھرے کس طرح قسمت کے تئیں کہہ کیا کرے

(از بیاض پروفیسر آذر)

بارہویں قرن کا ربع آخر پنجاب میں بے شمار شعرا دیکھتا ہے جو کثرت کے ساتھ اردو میں شاعری کرتے ہیں زبان صاف ہو جاتی ہے ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ ان کے کلام میں اور ہندوستانیوں کے کلام میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس عہد کے شعرا میں ان لوگوں کا شمار ہونا چاہیئے۔ نامدار خاں دت محمد غوث بٹالوی دشاد۔ پر سر ودی (پسر ودی) خوش دل۔ فدوی۔ شاہ مراد۔ رام کشن۔ وارث شاہ وغیرہ لیکن سب سے پیشتر بعض ایسی نظموں کا ذکر کیا ہے جو سکھوں کی تاریخ سے گہرا تعلق رکھتی ہیں اور ان کی تاریخ تصنیف ہم کو معلوم ہے۔

نامدار خاں دت[1]

رنجیت سنگھ کا دادا چڑت سنگھ سکر چکیا مثل کا بانی ہے جو امیر سنگھ کی بیٹی سے شادی کر کے بہت طاقتور ہو گیا۔ ابتدا میں اس نے ایمن آباد کے مغل فوجدار کو قتل کر کے شہر کو لوٹ لیا۔ ۱۸۵۰ء میں اس نے گوجرانوالہ میں ایک قلعہ تعمیر کیا جس پر حاکم لاہور

---

[1] دت موہیال برہمنوں کی ایک شاخ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بھار دواج رشی کا لڑکا ان سے متنفر تھا اور اپنی محنت اور زور بازو سے کما کر کھانا چاہتا تھا جب افلاس سے مجبور ہوا تو اس نے سپہ گری سیکھی اور اس فن میں ماہر ہو گیا۔ اس کا نام (بقیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمایئے)

نے اس کی بڑھتی ہوئی طاقت کو پست کرنے کیلئے اس پر چڑھائی کی لیکن چڑت سنگھ انہیں اس کے اتحادی جان توڑ کر لڑے۔ اور حاکم کو شکست دی۔ اس فتح نے چڑت سنگھ کے حوصلوں کو اور بھی بلند کیا۔ ۱۷۶۲ء میں احمد شاہ کے ہندوستان آنے پر چڑت سنگھ نے اپنے اہل و عیال کو جموں بھیجدیا اور افغانی فوجوں کے دائیں بائیں لگا رہا۔ احمد شاہ کی واپسی کے بعد چڑت سنگھ نے وزیر آباد کو لوٹ لیا اور وہاں کے مغل فوجدار کو نکال کر خود شہر پر قابض ہو گیا اسکے بعد احمد آباد پر قبضہ کر لیا۔ روہتاس اس نے نور الدین خاں بامیزئی سے چھین کر دہنی چکوال، جلال پور پنڈ دادن خاں پر قبضہ کر لیا۔ صاحب خاں عامل پنڈ دادن خاں نے بھاری رقم دیکر اپنی جان بچائی ۱۷۷۴ء کے قریب جموں کا راجہ رنجیت دیو اپنے فرزند اور ولی عہد برج راج سے سخت ناراض تھا اور چاہتا تھا کہ برج راج دیو کے بجائے اپنے فرزند دلیل سنگھ کو ولیعہد بنائے۔ برج راج دیو نے چڑت سنگھ کو اپنی امداد کے لیے بلایا۔ چڑت سنگھ حقیقت سنگھ اور جے سنگھ (کنہیہ مثل) کے ساتھ مل کر ۱۷۷۴ء میں ایک بڑی فوج کے ساتھ

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) درون اچارج تھا۔ یہی بعد میں کوروں اور پانڈوں کا اتالیق مقرر ہوا اور مہابھارت کی جنگ میں سپہ سالار تھا۔ درون اچارج کی اولاد نے سپہ گری کو اپنا پیشہ بنا لیا چنانچہ اس کی اولاد میں محسوب ہیں یہ لوگ بہادری اور سخاوت میں مشہور ہیں اور خیرات لینے کے بجائے خیرات دیتے ہیں چنانچہ دت دانے دان کے پورے ہاتھی کے سخی تیغ کے سورمے کئی دت حسینی کہلاتے ہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ حضرت امام حسین کی مدد پر دشمنوں سے لڑتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ملک عرب میں بھی ان کا راج تھا۔ راہب جو عرب کے تخت پر بیٹھا دت تھا۔ بعض ایسے واقعات کی بنا پر کہا جاتا ہے دت سلطان آدھے ہندو آدھے مسلمان (گلشن موہیالی از گوری شنکر) یہ اطلاع مسٹر کنہیا لال ایم۔ اے نے بہم پہنچائی ہے۔

جموں کی طرف روانہ ہوا۔ رنجیت دیو نے مقابلہ کے لیے چمبہ کانگڑہ نورپور، بسوہر سے اور بھنگی مثل سے منگوائی۔ بسنتی ندی کے قریب مقابلہ ہوا اور ایک غیر فیصلہ کن جنگ ہوئی جس میں اتفاق سے چڑت سنگھ اس کے کسی ہمراہی کی بندوق پھٹنے سے ہلاک ہو جاتا ہے اس وقت نا مردار خاں دت چڑت سنگھ کا مرثیہ لکھتا ہے۔

افسوس ہے جہاں کے ثبات اور قرار پر
اس باغ بے وفا کی خزاں اور بہار پر
اس پیر زال عروس نما کے نگار پر
دو دن کی زندگانی بے اعتبار پر
دل بستگی نہ کر دم بے اعتبار پر

احوال چڑت سنگھ کا لکھتا ہوں فی المثل
پہونچا جب اس کا حکم قضا سیں دم اجل
آیا ولایت اپنی سی لے کر ہجوم دل
فرصت نہ دی قضا نے چلا چل میں ایک پل
آیا اجل کا شبر ہرن کے شکار پر

آیا ہجوم فوج سیتی کر کے اضطراب
جیوں صبح دم جلال سوں چڑھتا ہے آفتاب
تنہا ہوا اپنی فوج سوں کر جنگ پر شتاب
ہنگامہ و ہجوم مخالف نہ کر حساب
یک بارگی وہ بڑھ کے چلا کارزار پر

دل سوں غروب اپنی شجاعت کا دھر چلا
گویا کہ رخصت اپنے رفیقوں کو کر چلا
تقدیر کے حساب سیتی گرچہ مر چلا
لیکن خیال مرگ سیتی بے خبر چلا
پوچھا نہ کچھ جو کھیل ہے دم کے شمار کے

جیدھر سوں توپ ہکلا چلتی تھی بے شمار
آیا اسی طرف سے صدا کرتا مار مار
تھی ہاتھ میں تفنگ ولایت کی برق دار
کر جانگی کوں چاک پیالہ پڑی شرار
کندھے سوں ٹیکی جلد گئی سر کو مار کے

لہ تاریخ پنجاب (انگریزی) از سید محمد لطیف۔

اور کرگئی تفنگ کی چھپر دماغ میں — چوں تند باد پون کا جھونکا چراغ میں
تھا منتظر نہنگ اجل کا سراغ میں — عالم کے دلموں داغ لگا اور داغ میں

افسوس ایسے مرکا مرنا دیار پر

تیری قضا سوں چہرہ بندوق تیز تھا — یک لخت دور کاسۂ سر ریزہ ریزہ
ہر سو صدائے کوچ دم خیز خیز تھا — دھوون نہ تھا جہاں کہ مگر رستخیز تھا

عالم کے دلموں داغ لگا یادگار پر

دنیا میں چند روزہ جو ہے زندگی مراد — اوس مرد کو بخوبی و نیکی کریں گے یاد
دنیا میں نیک نام تھا عقبیٰ میں رہئے شاد — لکھتا ہوں مجمل اس کی تاسف کا یا داد

تقریر بات فرض تھی یہ نامدار پر

(از بیاض پروفیسر آذر)

یہ نظم اسکے معاصر نظموں سے جو دہلی اور لکھنؤ میں ان ایام میں لکھی جا رہی تھی زبان کے لحاظ سے کم نہیں ہے۔ بیان حقیقت اور جذبات کی ادائیگی میں انتہا درجہ کی سادگی سے کام لیا گیا ہے اور مبالغہ نام کو بھی نہیں۔ واقعات ایسے پیرایہ میں ادا ہوئے ہیں جو بالکل قدرتی اور فطری ہیں۔ ذرا مصرع ع

"جوں صبح دم جلال سو چڑھتا ہے آفتاب" پر غور کرو بعض الفاظ ایسے ہیں جن سے مصنف کے پنجابی ہونے کا سراغ چلتا ہے مثلاً جھنکا بجائے جھونکا، چہرہ بمعنی ریزہ کرچ۔

تاریخ کے برخلاف نامدار خاں کا بیان ہے کہ خود چڑت سنگھ کی بندوق تھی جو پھٹی اور خود چڑت سنگھ کے ہاتھ میں پھٹی۔ یعنی کوئی چنگاری جاگی سے اڑ کر بندوق کی پیالی میں (نیل کے استعمال سے پہلے اسکے بجائے بندوق کی نالی میں ایک سوراخ ہوا کرتا تھا جس سے بارود کا تعلق باہر سے کوٹھی کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ یہ سوراخ جو باہر کی طرف سے پیالی کی شکل کا ہوتا تھا پیالی کہلاتا تھا۔ جاگی یعنی بتی کے ذریعہ

سے پیالی کی بارود آگ لگا لیتی تھی اور کوٹھی کے بارود کو مشتعل کر دیتی تھی جس سے بندوق چلتی تھی) اتفاقیہ گر گئی۔ چڑت سنگھ نے بندوق پھینک دی اور اسکی بعض کرچیں اچھل کر اسکے سر میں لگیں جس سے اس کا سر پاش پاش ہو گیا۔ ہمیں اس بیان کو چڑت سنگھ کی وفات کے سلسلہ میں زیادہ صحیح تسلیم کرنا چاہیئے۔

محمد غوث بٹالوی

سکھوں کی کنہیا مثل کا بانی جے سنگھ ہے۔ یہ موضع کاٹھ کا جو لاہور سے ۱۵ میل جنوب میں واقع ہے۔ باشندہ تھا۔ ۱۷۶۳ء میں احمد شاہ ابدالی کی پنجاب سے واپسی کے بعد جے سنگھ نے قصور پر حملہ کیا۔ اور ایک ماہ کے محاصرہ کے بعد اس پر قابض ہو گیا جے سنگھ سرہند کی اس جنگ میں بھی شامل تھا جس میں زین خاں رہ جاتا ہے اس کے بعد جے سنگھ ایزد بخش رئیس گھروٹہ کو ایک سخت جنگ کے بعد اپنا مطیع کر لیتا ہے نورپور، وتارپور اور سیبہ کے روسا اسکے باجگذار بن جاتے ہیں بکمریہ کو بہت جلد تسخیر کر لیتا ہے۔ بعد میں سنسار چند والی کٹوچ کی امداد کے لیے جو کانگڑہ کا دعویدار تھا روانہ ہوتا ہے اور فتح کر کے خود قابض ہو جاتا ہے۔ قصور پر سخت جنگ کے بعد دوبارہ قابض ہوتا ہے مگر نظام الدین خاں پھر اس پر قبضہ کر لیتا ہے بٹالو کو گلانور رام گڑھیا مثل والوں کا قبضہ تھا۔ جے سنگھ نے جسا سنگھ رام گڑھیہ کو ستلج سے مار نکال کر ان مقامات پر بھی قبضہ کر لیا۔ لیکن جے سنگھ نے مسلمانان بٹالہ کو سخت اذیتیں پہونچائیں۔ شرفا کو لوٹ لیا اور ان کے مکانات جلا دیئے۔ حضرت شیخ غلام غوث بٹالوی (متوفی ۱۱۹۸ھ) کو جو حضرت شیخ غلام قادر کے فرزند اور جانشین تھے قید کر دیا اور ان کا اثاث البیت تک لوٹ لیا۔ اسی سلسلہ میں ان کا بے نظیر کتب خانہ لوٹ لیا گیا۔ مصنف تذکرۃ الابرار اس کے متعلق کہتا ہے۔

تا آنکہ قدم در جہاں وقاحت گذاشتہ دست تعدی بر اماکن و ساکن آنحضرت دراز کردہ متاع واثاث و مواد و اسباب تردمی و جمیع اثاث البیت بغارت بردند خصوصًا جواہر نایاب کتب کہ از نوادر روزگار عجائب عالم بود بہ چندیں مساعی جمیلہ و انواع ترددات جمع آمدہ شب و روز در مدرسہ شریفہ مستعمل طالب بود بدست آنخناں جہال فتاد کہ کتاب را از کتاب دا فرق نمی کردند۔"

۱۱۹۸ھ (۱۷۸۴ء) میں سنسار چند والی کوٹ کچ، جسا سنگھ رام گڑھیا اور مہا سنگھ سرکردہ شکر چکیہ مسل نے باتفاق ہم دیگرے جے سنگھ پر چڑھائی کی اور موضع اچل کے پاس بٹالہ سے آٹھ میل کے فاصلہ پر فریقین میں جنگ ہوئی جے سنگھ کی فوجیں اسکے فرزند گوربخش کے زیر کمان تھیں۔ گوربخش بڑی بہادری سے لڑا۔ لیکن موت کا کیا علاج قضا رکار ایک تیر اس کے سینے پر آ کر لگا جس نے عین میدان جنگ میں اس کا کام تمام کر دیا۔ سپہ سالار کی موت نے جنگ کا فیصلہ کر دیا اور جے سنگھ کو شکست مل گئی۔ بوڑھا جے سنگھ اپنے نوجوان اکلوتے بیٹے کی وفات دیکھکر بد دل ہو گیا۔ اس نے تیر و ترکش پھینک دیئے گھوڑے سے اترا اور زار و قطار روتا ہوا دشمن کی گولیوں کی زد میں جا کھڑا ہوا۔ غنیم اس بوڑھے جنگ آزما کے نوحہ و شیون سے بے حد متاثر ہوا اور کسی نے اس پر حملہ نہیں کیا۔

گوربخش سنگھ کی وفات کے موقع پر بٹالہ کا ایک شاعر محمد غوث جو بٹالہ کی کچہری میں گوربخش سنگھ کی فوجداری میں ملازم تھا۔ اس کا مرثیہ لکھتا ہے۔ مرثیہ چونکہ دراز ہے اس لیے یہاں چند اشعار پر قناعت کی جاتی ہے ؎

بہار اندر آیا جو باغ جہاں — قضا سوں پڑی جھول باد خزاں
گرا آہ پاؤں سے سرو رواں — پڑا ہر طرف میں یہ شور و فغاں

کدھر ہے گوربخش سنگھ پہلواں
ہوا ہے یہ ماتم سوں غم بیشمار
سر اپنے پہ غم سوں اٹھا خاک ڈار
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں
بدی ساعت اندر کیا اس نے جنگ
چھوٹی غیب سے گولیے از تفنگ
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں
کیا اس قدر رن میں جاکر نزار
بحکم قضا کار پروردگار
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں
ہوا گل ہے جے سنگھ جی کا چراغ
منایا گوروں نے خوشی کا چراغ
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں
پڑا شہر میں ماتم کا ہر سو بسو
نہ جیتا رکھا سنگھ کو ست گرو
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں
ہوا درد سوں چاند سورج سیاہ
رضا ہے خداوند کی واہ واہ
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں
لکھا ہے نوشتہ موں بہ ابتدا
سبہا افسوس اندر ہے شاہ و گدا

کدھر موتیاں والا ہے نوجوان
جگت اس مصیبت سوں ہے بیقرار
تاسف سوں کہتے ہیں سب شہروار
کدھر موتیاں والا ہے نوجواں
ہوا قافیہ زندگانی کا تنگ
لگی پہلو پر آ جو تیر خدنگ
کدھر موتیاں والا ہے نوجواں
کہ دشمن ہوا کھا گئے کوں تیار
یہ حکمت ہوا پڑ گئی بیکار
کدھر موتیاں والا ہے نوجواں
خزاں اندر آیا جو ایکا باغ
جگر موں لگا غم کا ہر ایک کوں داغ
کدھر موتیاں والا ہے جوان
زمانہ موں ہوتی ہے یہ گفتگو
نہ پوری ہوئی اسکی کچھ آرزو
کدھر موتیاں والا ہے نوجوان
سیاہ پوش بیٹھے ہیں فوج و سپاہ
پڑے لوگ روتے ہیں سب دادخواہ
کدھر موتیاں والا ہے نوجوان
کہاں رہ سکے ہے قضائے خدا
ستم یہ ہوا ہے نہایت بڑا

کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں | کدھر موتیاں والا ہے نوجواں
رہا یوں ہی سب ملک کا بندوبست | اجل نے دہی بارہ آئی شکست
لکھا تھا خدا نے یہ روز الست | کہ افسوس ہے سنگھ ملتا ہے دست
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں | کدھر موتیوں والا ہے نوجواں
دلاور جوانمرد وہ شیر تن | چکھا کوں اٹھا جانباز یا وطن
جوانی کے جوبن کا تھا وہ رتن | بچھوڑا اجل نے کیئے سو جتن
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں | کدھر موتیاں والا ہے نوجواں
خزینے دفینے پڑے ہی رہے | دو شالا اور لاچے دھرے ہی رہے
طویلہ میں گھوڑے کھڑے ہی رہے | شتر بازد کے گڑے ہی رہے
کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں | کدھر موتیاں والا ہے نوجواں
یہ کیا ہو گیا ہے ستم سخت آہ | بٹالہ کے سر سوں گیا بادشاہ
اسی درد سوں رات دن ہے سیاہ | ترنکار ست گور کیے اپنی چاہ

کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں
کدھر موتیاں والا ہے نوجواں

(از بیاض پروفیسر آزاد)

اس نظم کو بھی گوربخش سنگھ کے واقعہ وفات کے متعلق موجودہ تاریخ سے اختلاف ہے۔ بقول محمد غوث وہ گولی سے مارا جاتا ہے اسکے پہلو میں لگتی ہے تاریخ کا بیان ہے کہ اس کے سینہ پر تیر لگا تھا میں غوث کے بیان کو ترجیح دوں گا کیونکہ یہ مرثیہ گوربخش سنگھ کی وفات کے بعد لکھا گیا ہے۔

غزل آیندہ بھی محمد غوث کی ملک ہے ۔

گر میرے یار کوں خدا لیا دے | ناتواں شکر حق بجا لیا دے

دل تو خدا ہے میرا اس کے سوا — قاصد اس کوں شتاب جا لیاوے
اپنے آنے سو گر کرے کچھ عذر — دستخط اس کا پھر لکھا لیاوے
گر وہ آزردہ ہو ہے مجھ سیتی — کر کے منت اوسے منا لیاوے
اب ہووے جو کوئی مجکوں بھی — پاس دلبر کے جا ملا لیا وے
یا سجن میرے کوں بہر عنواں — جس طرح جانے وہ رجھا لیاوے

ہو رہا ہے غلام غوث اس کا
جو کوئی یار کوں ملا دیا وے

دل محمد دلشاد پسروری

اُردو کے علاوہ فارسی کے زبردست شاعر ہیں۔ پورا تخلص دلدم۔ قرن دوازدھم ان کا زمانہ ہے۔ نام دل محمد ہے۔ چنانچہ دیوان سے

... نام کنی گر از لطف شاد کامم — بنام دلشاد شہرہ آرم دل محمد خوش دل زتو بادا

دیگر سے

شاد آں کہ دل محمد اسمش — دلشاد ازاں تخلص ماست

پرسرور (پرسرام پور) جس کو آج کل پسرور کہا جاتا ہے وطن ہے اردو دیوان اس عقیدہ کی تعریف کرتا ہے۔ چنانچہ سے

خوش آں وطن بکمالات ملاحت آبادان است — جہاں غیب و شہادت سرور و جہاں ست
اگر تو ذائقہ آب پرسرور چشتی — ملاحتش بدرون حلاوتش پنہاں ست
ولایتے نمکیں اندرون بردن شہرش — عجب مدار کہ شہر عجائب لیلہ من ست
یکے دو دست عجب تال آب شش پہلو — بشش جہات بہ تیاب گو کہ آں ست
دلیل شادی دلشاد نام ایں شہر است — کہ پرسرور طرب بخشش عالم دل و جاں ست

تعلیم کے لحاظ سے جن کمالات کے وہ مدعی ہیں اس شعر میں درج ہیں ؎

از علم و شعر و تاریخ فقہ و سلوک و اخلاق
دارد تمام لیکن دلشاد زر ندارد

یعنی فقہ تصوف ۔ اخلاق ۔ تاریخ اور شعر میں ماہر تھے۔

دلشاد ایک ایسے دور انقلاب میں گذرے ہیں جو پنجاب کی تاریخ کا تاریک ترین ورق ہے ۔ مغلیہ سلطنت اپنے تنزل کے آخری مراحل طے کر رہی ہے نادر کے بعد احمد شاہ ابدالی نے اپنے مشہور حملے شروع کر دیے ہیں اور سکھ جماعت غارت و رہزنی میں مصروف ہے ۔ قتل و خونریزی کا بازار چار سو گرم ہے علم و فضل کا چرچا چھوٹ گیا ہے ۔ جہالت اور تاریکی ملک پر چھائی ہوئی ہے ۔ پنجاب کے اس دور ظلمت کے ساتھ ساتھ دلشاد کی شاعری کا زمانہ بھی متوازی گامزن ہے ۔ دوسرے الفاظ میں بارھویں صدی کے نصف دوم کے تمام واقعات ان کی آنکھوں کے سامنے ہوئے ہیں ۔ اور ان واقعات عصری کی جھلک ان کے کلام میں موجود ہے کبھی وہ افغانوں کے ہاتھ سے نالاں ہیں ۔ اور کبھی سکھوں کے مظالم پر لعنت بھیج رہا ہے مصیبت اور بدحالی میں قاعدہ کہ انسان کو خدا بہت یاد آتا ہے مذہب سے مذہبی لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے ۔ اولیاؤں اور مشائخ سے لو لگائی جاتی ہے یہی کیفیت دلشاد کے قلب کی ہے ۔ کبھی رسول عربی کی خدمت میں اپنی فریاد لے جاتے ہیں حضرت علیؓ سے استغاثہ کرتے ہیں ۔ کبھی مہدی آخرالزماں کو بلاتے ہیں کبھی حضرت عیسیٰ کو پکارتے ہیں ۔ اور کبھی غوث الاعظم سے ملتجی ہیں مثلاً کہتے ہیں ؎

غم ہجوم آورد مارا یا رسول اللہ اغث
درچنیں وقتے خدا یا رسول اللہ اغث

دیگر ؎

غلوی کردہ سگاں شیر حق کجا رفتی / بہ پنجہ از سر پرشور و مار بر آر

زہندیاں سحر ملک ما بشام رسید / تو از نیام بہ پنجاب ذوالفقار بر آر

دیگر ؎

امام مہدی آخرالزماں بیا وقت است / ندانم است تو شنید کہ ظہور یا قسمت

دیگر ؎

نفرست مہدے خویش تا کفر انشاند / از حد گذشت اکنوں میعاد یا محمدؐ

دیگر ؎

دیں را چو محی دینت احیا کند بہ پنجاب / ہاں عیسیٰ زماں را ارشاد یا محمدؐ

دیگر ؎

غم شد دو چار من دگر یا غوث اعظم الغیاث / خوں میرود زیں چشم تر یا غوث اعظم الغیاث

اس صدی میں غوث الاعظم کی غیر معمولی مقبولیت کا راز پنجاب کے ان سیاسی اثرات کے پرتو میں مفہوم ہو سکتا ہے جن کے تاریک بادل اس ملک کی فضا کو گھیرے ہوئے تھے اس سے پیشتر متعدد نظمیں ایسی نقل ہو چکی ہیں جو بالخصوص غوث الاعظم کی شان میں ہیں۔ جب ہم دلشاد کی آواز فریاد اس طرح بلند ہوتی دیکھتے ہیں تو قیاس کر سکتے ہیں کہ پنجاب پر ان ایام میں کیا قیامت گذرتی ہے۔ مذہباً اگرچہ سنت جماعت ہیں لیکن حُبِ علیؓ سے غافل نہیں ہیں۔ محرم میں وہ ماتم حسینؑ زندہ کرتے ہیں۔ ان کی کئی نظمیں شاہد ہیں۔ پنجتنؑ پاک سے بھی عقیدت ہے ؎

ذکر مدح پنجتنؑ داریم در د پنج وقت / در مخمس گوئی اے دلشاد ناچاریم ما

دیگر ؎

ہمچو دلشاد از دلائے پنجتنؑ / وا ہلئے اقلیم پنجابیم ما

پنجاب اور پنجتن کی رعایت میں کئی اشعار لکھے ہیں لیکن یہ شعر نہایت عجیب ہے ؎

پنجابیے کہ نیست در و حبِ پنجتن　　پنجابیت غیر پسند نیست زین دیار

اپنے وطن سے بیحد محبت کرتے ہیں۔ ذیل کے ابیات ملاحظہ ہوں ان سے کس قدر محبت ٹپک رہی ہے۔ امام برخوردار کے بیحد معتقد ہیں ؎

اول از لاہور میگویند　　اہلِ اخبار ہند تا بخشش
شہر ... دور میگویند　　کان علم و شعور میگویند
شہر حور و قصور میگویند　　حسن ہر خانہ اش ہمی منبند
شکر پیاشہ ... لیشی　　مردم و مرغ و مور میگویند
طرفہ بزم حضور میگویند　　از مزار امام برخوردار
تیغ ہر دا ... ابا　　مزہ آب شور میگویند
شہر و بلدیت دور میگویند　　زین ولایت کجا ز دم لشاد
خاک دروازہ اش ہمی بنبند　　سرمۂ کوہ طور میگویند

تاریخی لحاظ سے دیکھتے ہوئے ان کے ہاں سب سے پہلے تلمیح دہلی کے قتل عام کی طرف ہے جو ۱۱۵۱ھ/۱۷۳۸ء میں ہوتا ہے۔ کہتے ہیں ؎

قتل عام است در جہان آباد　　آخر این غمزۂ تو نادر نیست

دوسرے تلمیح نواب یحیٰی خان اور قتل رائے جپت رائے دیوان لاہور کے متعلق ہے ؎

در جہان گر ہمسر اسکندر و خاقان شود　　از شجاعت تابع نواب یحیٰی خان شود
گر مخالف ہمچو عکس آئینہ نواب را　　میشود شخصے مقابل صورت بیجان شود
انتقام قاتلان رائے جپت رائے را　　آید از تیغ تو در پنجاب گر عریان شود

زکریا خان کی وفات پر کچھ عرصہ کے بعد یحیٰی خان ان کا خلف صوبہ دار لاہور بنا دیا گیا۔ سکھوں کی ایک جماعت ایمن آباد کے مویشی پکڑ لے گئی۔ ان کی سزا دہی کے لیے لکھپت رائے دیوان لاہور بھیجے گئے۔ سکھوں نے شاہی فوج کا مقابلہ کیا اور دیوان جسپت رائے معرکہ میں مارے گئے۔ صوبہ دار یحیٰی خان کو اس پر طیش آیا اور اس لیے اپنے وزیر لکھپت رائے کو ایک بڑی فوج کے ساتھ ان کی سرکوبی کے لیے متعین کیا۔ وزیر نے سکھوں کو بڑی تعداد میں قتل کیا۔ اور ایک ہزار کے

قریب قیدی گرفتار کر کے لایا۔ جو ۱۱۵۹ھ ۱۷۴۶ء میں لاہور میں قتل کیے گئے۔

۱۱۶۲ھ ۱۷۴۸ء میں میر منو صوبہ دار لاہور چار محال (پسرور۔ گجرات۔ سیالکوٹ اور اورنگ آباد) بروئے معاہدہ احمد شاہ ابدالی کے حوالی کر دیتا ہے اور شاہ ان محال کا صوبہ دار بلند خاں سدّوزئی کو مقرر کرتا ہے۔ دلشاد اس بلند خاں کے خیر مقدم میں لکھتے ہیں ؎

خبر ز عالم بالا است قمریاں بہ چمن | بلند خاں چو سہی سرو صنو داز رسید
زمین مقدم نواب منعم الدولہ | بہار راد گرآب بروئے کار رسید
ہزار شکر خدا کآب رفتہ پنجاب | دگر زمین قدومش بجو بہار رسید
نظام چار محال تو حق کند دلشاد | سحر بگوش بشارت ز چار یار رسید

اس عہد کے قبل یا بعد رنجیت دیو والی جموں جو ۱۱۹۶ھ ۱۷۸۲ء میں ستاون سال راج کرنے فوت ہوتا ہے۔ پسرور پر قبضہ کر لیتا ہے۔ اس سلسلہ میں دلشاد کی آمد و رفت جموں میں بھی ہو جاتی ہے۔ جموں میں ان ایام میں مسلمانوں پر سخت مظالم توڑے جاتے ہیں حتیٰ کہ ان کو اذان دینے تک کی اجازت نہیں ہے۔ چنانچہ ؎

بسکہ منعت دریں شہر اذان جمعہ | نکند گوش کسے نالہ بیکاراں را
گریہ زانیست اثر در دل راجہ جموں | سبزہ بر سنگ نہ دید چہ کنہ ماراں را
موذیاں کردہ ہجوم اے شہ دولہ فریاد | تیغ گجرات سر ایست دل آزاداں را

دیگر ؎

مردمانش ز بس سنگ دل اند | جموں امروز سخت کہسار است

جموں سے پسرور صرف چالیس میل انگریزی کے قریب ہے۔ رنجیت دیو احمد شاہ ابدالی کا محکوم اور درانیوں کی فتح کشمیر کے وقت ۱۱۷۵ھ ان کا بڑا معاون رہا ہے رنجیت دیو نے دیوان نرائن داس کو ظفروال و دیگر علاقہ کا ناظم بنا کر بھیجا ہے راجہ

کے حکم سے نیا بندوبست اور پیمائش ہو رہی تھی۔ دلشاد کی معافی میں کچھ زمین ہے ان سے چہارم طلب کیا جاتا ہے۔ یہ عذر کر رہے ہیں۔ اسی طرح رام داس نامی کسی شخص کی دھرم شالہ ضبط کرلی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں دلشاد نرائن داس کی خدمت میں ایک غزل بھیجتے ہیں ؎

اے مبارک فال دیوان نرائن داس ما ‏ ‏ جز بہ لطف نادریں دوراں کہ دارد پاس ما
ایں ظفر وال از قدوم فیضت امن آباد گشت ‏ ‏ قلعہ دار الاماں شد منکہ منہاس ما
می نماید رخ بھلو دار از حسن اقبالت چو چور ‏ ‏ یارب آباداں محل عیش داستیاس ما
چور را از اکر شے کو ہتا خاں نامیموں قدم ‏ ‏ بر زمیں باشد ندا از بیری مماس ما
.... ضبط نقیبراں تا ختند ‏ ‏ ضبط کردہ دھرم سال و تکیہ رام داس ما
در تقاضائے چہارم ہائے ایں قصاب کار ‏ ‏ وضع میخواہند پائے چار ہاں زر داس ما
آخر ایں رسمی شاں تا کجا خواہد رسید ‏ ‏ کلک اینہا رشتہ دیا تیشہ دیا داس ما
بخشش آئمہ را ادہر منزلت مے گفتہ اند ‏ ‏ مے کمر حیتہا شود کار سگ کناس ما
عاقبت دولت سرائے راجہ رنجیت دید ‏ ‏ خانہ آباداں ہمیکردو پر از افلاس ما

چوں تو دانا کے پذیرد گفتہ ایں ناکساں
اے رضا جوئے دل خاص و عام الناس ما

معین الملک عرف میر منو سنہ ۶۷-۱۱۶۶ھ (۵۲-۱۷۵۱ء) میں احمد شاہ ابدالی سے شکست کھاتا ہے اور اسکے دربار میں حاضر ہوتا ہے۔ احمد شاہ نہایت تپاک سے اس سے ملتا ہے اور اسکی بہادری کی تعریف کرتا ہے۔ اور رستم ہند کا اُس کو خطاب دیتا ہے۔

دلشاد اس موقع پر غزل ذیل لکھتے ہیں ؎

معین دین پناہ دوراں امام ملت مدار گیہاں ‏ ‏ چراغ شرع و فروغ ایماں شہا ظاہر دہ عیش فردا
اذاں زد و فتح در رکابش کہ رستم ہند شد خطابش ‏ ‏ جبیں نہادن بخاک پایش مراد دنیا نجات عقبیٰ

فلک یکے کمترین غلامش کہ پشت خم کردہ در سلامش . معین الدین خاں خجستہ نامش ز عقل پیر و بہ بخت برنا

منم کہ در پر سرور باشم ز دور گشت چند دور باشم
ز حاضران حضور باشم اگر ز لطف تو باشد ایما

معین الملک کی وفات کے بعد آدینہ بیگ خاں پنجاب میں طاقتور ہو جاتا ہے وہ خواجہ میرزا خاں حاکم لاہور بنا دیتا ہے ۔ پر سرور میں جب میرزا خاں آتا ہے شاعر یہ غزل پیش کرتا ہے ؎

ز بزم عیش تو نواب خواجہ مرزا خاں — بکام کینہ وراں ایام زہر خند مباد
بجائے مے غم آدینہ را مبدل کن — بسینۂ تو غم زاہداں بلند مباد

معلوم ہوتا ہے کہ احمد شاہ ابدالی کی آمد کو ابتدا میں پنجاب نے بنظر استحسان دیکھا ہے ۔ اسی لیے شاعر مختلف مقامات پر نعرہ ہائے مسرت بلند کرتا ہے اور اس کے جانے پر تاسف ؎

باد نوروزی سحر گلشن بستاں رسید — مژدہ آمد کہ اقبال شہ دوراں رسید
ابر نیساں میرسد یا موسم باد بہار — یا بہ پنجاب اُردوئے شاہ دوراں رسید

دیگر ؎

ہائے پیران فقیران سہ دوراں — گر ز پنجاب و دامدہ رفتن مدہید

دیگر ؎

خیال سرو قدش گر ز دل در خواب برگردد — فغانم از گلو افغان از سیلاب برگردد
حواسم رفت چو ضیق النفس شد در گلو ہم — شہ افغان نمیدانستم از پنجاب برگردد

دیگر ؎

خبر آمد کہ شہ پیشاور آمد — سر آمد سرور آمد افسر آمد
گہے بشکست سر گہہ سینۂ کفر — شہ آمد صورت کرد فر آمد

لیکن دلشاد کا یہ اظہار مسرت زیادہ دیرپا نہیں ہے تجربہ اور افغانیوں کے سلوک نے انھیں سبق دیا کہ قصاب اور شبان میں بڑا فرق ہے چنانچہ آخر میں دلشاد کا نقطۂ نظر بدل جاتا ہے اور وہ افغانوں کے ہاتھ سے بھی دست بافغان ہیں ان کی غزلوں میں متعدد مقامات پر یہ جذبات موجود ہیں ؎

بخواب خوش چہ رود کس بملک ہندوستاں — بجوش زآمد افغان رسد فغانے چند
زلالۂ ہیچ نماندہ است غیر داغ سیاہ — بباغ ہند و اغماض باغبانے چند

دیگر ؎

مدتے شد کہ اشک افغان نیست — شاہ در دوراں نمی آید

دیگر ؎

افغان کہ بہند آید وگیرد سر خود را — دلشاد زآید شدہ او جائے فغان ست

لیکن دلشاد سب سے زیادہ سکھوں کے خلاف فریاد خواں ہیں یہ قوم رہزنی اور لوٹ مار سے بنی۔ مدتوں قزاقی اور قطاع الطریقی اس کا پیشہ رہا۔ زوال مغل اور احمد شاہ کے حملوں نے انھیں خروج دے دیا۔ آخر سکھوں نے لاہور پر قبضہ کر لیا۔ دلشاد ؎

فغاں ز آمد و رفت فضول ابدالی — بلا ہنود ..... بے شعور یا قسمت

سکھوں کے قبضۂ لاہور کی "تاریخ" جہاں خراب شدہ "۱۱۸۱ھ" ہے۔ اور شعر بالا میں شاعر اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے ؎

ایک اور غزل میں سکھوں کے لیے کہتا ہے ؎

الٰہی قطع ہستی کن سگاں گرگ تازاں را — زلا مقراض میگرداں سر این دو دازان را
حواسم آب شد از آتش دود سیہ کاراں — بکن بیروں ز پنجاب این شرار فتنہ سازاں را
جہاں در چنگل مردار خواراں سید آمد — خداوندا برین زاغان رہا کن شاہبازان

سفید صبح تک چینی سرشتہ پنجاب	زمودہ از صبا پامال فتاد میاد درا

پنجاب کی آنکھیں اس وقت بھی دہلی کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ عالمگیر ثانی کے بعد شہنشاہ عالم ثانی جب بنگالہ میں ۱۱۷۳ھ ۱۷۵۹ء میں تخت نشین ہوتا ہے دہلی پہنچتا ہے تو رشاد پنجاب میں اس وقت کو پورا شہرت دیتے ہیں۔ ــ

رشاد زمردہ بر دل خبر تازہ شنیدیم	شاہنشہ والا گہر آمد خبر اینست

زین خان سرہند کی جنگ میں ۱۱۷۷ھ سکھوں کے ہاتھ مارا جاتا ہے جب پسرور میں آیا تو رشاد کہتا ہے۔ ــ

چشم مردگان نشاط ز سر بر گرفتہ اند	ہنگام نو بہار بوقت خزاں رسید
یعنی بہ پسرور ز فرخندگی بخت	بادی ز جنت و ز جنت رشاد زین خان رسید

احمد شاہ ابدالی ۱۱۷۵ھ میں راجہ رنجیت دیو کی امداد سے کشمیر فتح کرتا ہے۔ نورالدین خان فاتح کشمیر اس کا پہلا صوبہ دار بنایا جاتا ہے۔ پھر بلند خان۔ پھر نورالدین ۱۱۷۹ھ میں خرم خان والی مقرر ہوتا ہے اور اواخر ۱۱۸۰ھ میں نورالدین خان تیسری بار صوبہ دار بنتا ہے۔ ۱۱۸۲ھ میں خرم خان دوبارہ صوبہ دار بنایا جاتا ہے۔ خرم خان کی آمد پر رشاد بعض دوستوں کی فرمائش پر ذیل کی غزل خرم خان کے خیر مقدم میں لکھتا ہے۔ ــ

مژدہ آمد کہ اقبال شہ دوراں رسید	زخم مرہم نو ز سحر در گلشن بستاں رسید
بر غیبان خبر سبز یا میہ شمیم باد بہار	یا بہ پنجاب پرودی شاہ دوراں رسید
چوں گل از باد صبا کشمیریاں خرم شدند	با فشان سبز و رنگیں فوج خرم خاں رسید

رشاد کی شاعری کی بعض ممتاز خصوصیتیں ہیں۔ وہ شعر گوئی اس لیے نہیں کرتا کہ اس کو ایک دیوان یادگار چھوڑنا ہے جیسا کہ اور شعراء نے کیا ہے بلکہ ضرورت، اقتصادی ماحول، دوستوں کی فرمائش وغیرہ ایسے محرکات ہیں جن کے اثر میں وہ شعر

لکھتا ہے اس لیے اس کا دیوان اس عہد کے واقعات کا آئینہ بن گیا ہے مجھ کو اس انداز کا شاعر سوائے اکبر الہ آبادی کے اور کوئی معلوم نہیں۔

دلشاد کے کلام پر سادگی غالب ہے ساتھ ہی صنعت تجنیس و مراعات النظیر کی رعایت دیکھی جاتی ہے وہ اکثر اپنی تشبیہ اور استعارے ملکی و دیگر امورات سے لیتا ہے۔ اس صنف میں وہ سب سے منفرد ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ اس صنف خاص نے اسکے کلام کو ایک زور دے دیا ہے۔ مثلاً یہ شعر ملاحظہ ہو۔

گفتار تو بگرفت جہاں از لب میگوں ‍ ‍ ‍ با فوج فرنگی شہ والا گہر آمد

دیگر

خیال سرو قدش گر ز دل درخواب گردد ‍ ‍ ‍ فغانم از گلو افغان وش از سیلاب برگردد

دیگر

درزمیں ہر دو ستہ تخم اشک می کاریم ما ‍ ‍ ‍ گر توئی نواب ما آخر زمیندار یم ما
اشک چشم خود بدست خود ہمی سازیم پاک ‍ ‍ ‍ صوبہ پنجاب زیر آستیں داریم ما

دیگر

عالم از شیریں کلامیہا مسخر کردہ ایم ‍ ‍ ‍ دور درانیم از قندھاری آئیم ما

دیگر

در نیے رشد کہ اشک افغاں نیست ‍ ‍ ‍ شاہ دردراں نمی آید

دیگر

قتل عام ست در جہاں آباد ‍ ‍ ‍ آخر ایں نمزدۂ تو نادر نیست

دیگر

رسید فوج بفوج اشک چشم ہمہ جا ‍ ‍ ‍ جہاں گرفت قشوں در درانی ما

ازیں ظرافت اور ہجو گوئی کے بھی اوصاف موجود ہے لیکن ہجو بہت کم لکھی ہے کسی

لالہ جی کو لکھا ہے ـــ

اے بندہ میاں دو عالم زندگی تست — ہشدار کہ گویند ازاں نام تو لالا

ان اشعار کو پڑھا ـــ

ہر خاں کہ پنجاب دریں دور زماں است — جانست بگفتن ندر دگر دہ نان است
نزاد لاد علی گوید واللہ اعلم — ہر کو نگر بہ بنہ کہ در ذات عوان است
از در فروشاں کہ بہر پیشہ تہا رند — ہر شیخ کہ بود کسے زئی پیر مغاں است
جم لپستہ ہر شہر در صد غول بیاباں — از نو متبہاں بیشت زمیں پر ز شہاں است
در مذہب عدلی ہمہ نانک۔ مشرب — ہر خانۂ ازمرد کیاں صاحب خانہ است
سید بہ ہند آل نبی داند خود را — سب از پے اصحاب جد خود بزبان است
ہر لا ولد یرا کہ از دنام و نشان نیست — زحیوت اداں گم شدہ در ہند نشاں است

دلشاد کا قلم ان آمدیات کے باوجود لطیف سے لطیف اور نازک سے نازک جذبات کے ادا کرنے کے قابل ہے۔ ملاحظہ ہوں یہ اشعار ـــ

پادشہ پروانہ بنگ منصب دان خویش را — زن لبس شوہر چرا سوزد دوان خویش را
در حضور شمع چوں پروانہا کرد نبا عشق — آں عشق ایں است سازد عشق آں خویش را
گر زما چوں شمع ایں پروانگی منظور نیست — خسرو از سوز دل افروز درداں خویش را
خسرو از عشق بازی کم از ہندو زن مباش — کز برائے مردہ سوزد زندہ جان خویش را

بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ دلشاد تیرھویں صدی کے آغاز کے بعد بھی زندہ تھے لیکن ہم ان کی تاریخ وفات سے بے خبر ہیں۔ اردو میں انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے اور اسی کو اپنی یادگار کا ذریعہ مانتے ہیں۔ چنانچہ ـــ

گذاشتیم بہر گوشش شعر ہندی خویش — بیادگاری ما ماندہ در کافی ما

لیکن آج یہ ذخیرہ مفقود ہے ممکن ہے تلاش سے دستیاب ہو سکے میں نے ان

کے اردو کلام کا نمونہ درج کرتا ہوں:-

دلبر ہے نوجوان پٹھانوں کرے گا گیا	بانکی ہے ان کی آن پٹھانوں کرے گا گیا
وا فنا خدا ہے جو ہیرے یوں کی دو کمان کا	یہ موتی اسکی کان پٹھانوں کرے گا گیا
اس لعل لب نے آکے کئی دل اٹھائے خون	اب کھا گئے ہیں پان پٹھانوں کرے گا گیا
شیشہ شہر اسے کا نہ بگڑ گا ہاتھ سے ستے کے	یہ دن سپر اندان پٹھانوں کرے گا گیا
غمزہ سوں تیر کش مژگاں کو سوار کر	ابرو کی لے کمان پٹھانوں کرے گا گیا
خنجر نگاہ چشم سے سو کشتار مار	یہ ذات کا پٹھان پٹھانوں کرے گا گیا
دلشاد کی بھی لیتے خبر اپنے واسطے	یہ شیر دوش خان پٹھانوں کرے گا گیا

سید محمد ولی اورنگ آبادی کی غزل کا مطلع ہے:-

پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا	شاید کہ مرا حال اسے یاد نہ آیا

دلشاد لکھتا ہے:-

گذرے ہیں کئی دن وہ پریزاد نہ آیا	شاید کہ مرا وعدہ اسے یاد نہ آیا
نے خط نہ کتابت نہ خبر کچھ نہ سندیسا	پیغام ہمارا کوئی برباد نہ آیا
اس دام میں افسوس پھنسے تھے کئی عاشق	جب ہم کو پھنسا کر گیا صیاد نہ آیا
اک زخم کا محتاج تھا تڑپا رہا بسمل	پھر مار کے شمشیر وہ جلاد نہ آیا
اس منتظر تھا بن کے شیریں نقش بہ دیوار	جب تیشہ گیا مار کے فرہاد نہ آیا

کہتے ہیں سبھی جھوٹ کے آنچل میں پری رو
کیا وجہ میاں ساتھ جو دلشاد نہ آیا

وارث شاہ

حضرت وارث شاہؒ پنجابی کے بہترین شاعر نے جنتے جی ہیں مولوی محبوب عالم
صاحب ایڈیٹر پیسہ اخبار کی ایک بیاض سے ان کی غزل درج ذیل کرتا ہوں

جن دن سے جدا مجھ سے ہیں سجن ان کا دل بیمار ہوا | اب کٹھن بنا کیا صبر کروں گھر بار مجھی بیزار ہوا
دن رات تمام آرام نہیں اب شام پڑی وہ شام نہیں | وہ ساقی صاحب جام نہیں اب پینا مے دشوار ہوا
بن جانی جان عذاب بھئی [illegible] شوق کدے نہیں | جو سامان کیا ہے اب بھی مت [illegible] ہوا
مجھے پی اپنے کو بیادو [illegible] مجھ [illegible] | یہ اگن فراق کی مجھ [illegible] سب تن من جل انگار ہوا
جب پی یاد [illegible] تب [illegible] | اس پی اپنے کی لاگن ہوت لاگ مجھے [illegible] ہوا
اب پی کے درشن جاؤں گی تب [illegible] | [illegible] پی کے ساتھ [illegible] ہوا
نت راگ پیار کے گاتی ہوں [illegible] | [illegible] ہوں [illegible] من [illegible] ہوا
تب مجنوں کال ہویا تھا جب لیلیٰ [illegible] کر دیا تھا | [illegible] اب تک [illegible] ہوا
سو میں اب مجنوں دار بھئی پڑ لیں [illegible] | اس پی اپنے [illegible] ہوا

جب وارث شاہ کہلایا نے تب [illegible] روح ملایا نے
تب سب [illegible] سولایا نے جیو جان لکھن اسرار ہوا

(از بیاض مملوکہ مولوی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر پیسہ اخبار)

۱؎ کاتب نے نام کے ساتھ علیہ الرحمۃ کا اضافہ کر دیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ اس کی مراد مصنف ہیر وارانجھا سے ہے۔

خوش دل

نام محمد ابراہیم ہے اور لاہور کے مشہور اہل خاندان چشتی سے تعلق رکھتے ہیں۔ انکے والد قاضی ضیاء الحق مع اپنے بزرگوار مولانا نظام الدین و برادر خورد بہاء الحق ایران سے ہندوستان آئے اور لاہور میں متصل گڑھی شاہو سکونت اختیار کی اور نواب خان بہادر نے اپنے فرزند یحییٰ خاں کا اتالیق مقرر کر دیا۔ مولانا ابراہیم علم و فضل میں یگانۂ زمانہ تھے لیکن لاہور میں سکھوں کے دخل کے وقت تمام جائداد سے بے دخل ہو گئے اور گھر لوٹ لیا گیا تھا۔ ایک مسجد میں جو مطبع کوہ نور کے بالمقابل تھی امامت کرنے لگے اور معلمی اختیار کر لی۔ پھر جنرل ونٹورا نے دو آنہ یومیہ دروازۂ لاہوری پر وہاں پر ان کا تقرر کر دیا۔ مولوی نور احمد چشتی مصنف "تحقیقات چشتی و یادگار چشتی و تحفۂ چشتی و عجائب چشتی" مولوی محمد ابراہیم کے پوتے ہیں۔ چشتی خاندان تقریباً دو صدی سے اپنے علم و فضل کے لیے مشہور رہا۔ آرہا ہے رنجیت سنگھ کے عہد کا سب سے ضخیم روزنامچہ جو بیس بائیس جلدوں میں اسی خاندان کا کارنامہ ہے۔ اس کا خاندان میں دستور تھا کہ تخلص اکثر اوقات ہم قافیہ اختیار کئے ہیں جو دل پر ختم ہوتے ہیں۔ مثلاً اثر دل۔ خوش دل۔ بیدل۔ یکدل۔ مولانا خوش دل ۱۲۰۱ھ میں انتقال کرتے ہیں اور "رضی اللہ عنہ" مادۂ تاریخ ہے۔ اگر تحقیقات چشتی میں ۱۱۹۵ھ اور حیات رشید میں ۱۲۱۶ھ یا ۱۲۲۰ھ ہے۔

مولانا خوش دل کا نمونۂ کلام ذیل میں پیش کیا جاتا ہے جس میں دنیا کو بڑھیا اور جسم انسانی کو چرخہ تصور کیا گیا ہے چرخہ کی یہ نظم پنجاب میں بہت مقبول رہی ہے ؎

۱؎ میں اس اطلاع کے لیے مسٹر مسعود علی چشتی کا جو خوش دل کی اولاد میں ہیں ممنون ہوں۔

عشق کے غم سوں ہو محزوں آہ دنیا سب مکر و فسوں
جو تو چاہے قادر کوں اس عالم سوں ہو بیروں
کدھر کی بودھیا کدھر کاتوں
چل رے چرخے چرخ چوں

اے رنگین دیوانہ ہو عالم سوں بیگانہ ہو
دل پر پروانہ ہو (کذا) وہ ہیگا بے مشبہ و نموں
کدھر کی بودھیا کدھر کاتوں
چل رے چرخے چرخ چوں

نابود سبھی آہ ہستی ہے بنیاد فرازش پستی ہے
کیا دولت خواب کی مستی ہے مت کر اتنا شور و جنوں
کدھر کی بودھیا کدھر کاتوں
چل رے چرخے چرخ چوں

تن چرکھا بودھیا سنسار میں کیا اس کا کرتار
جو دنیا دسے ایسی یار پرسے وہ اد کانے گوں
کدھر کی بودھیا کدھر کاتوں
چل رے چرخے چرخ چوں

آہ جیو میرا بھیا دیوانہ دنیا ساتھ بھوت بہتانا
بھول گیا اوسے اونا جانا اب کیا اس کا فکر کروں
کدھر کی بودھیاں کدھر کاتوں
چل رے چرخے چرخ چوں

کدھر گئے گوراور بہرام کدھر گئے صیاد اروام

کدھر گئے جمشید اور جام   کدھر گئے گنج اور قارون

کدھر کی بڑھیا کدھر کا توں

چل رے چرخے چرخ چوں

بلبل گلزار بقا کا ہو   قمری شمشاد فنا کا ہو
اب تار گرہ عشق و ہوا کا ہو   آہ خوب نصیحت ہے تجکوں

کدھر کی بڑھیا کدھر کا توں

چل رے چرخے چرخ چوں

بخشنا کرنا : نصیحت ....

جیون گرد سے تیوں گذشتہ ہے   مت کر اتنا فکر فسردوں

کدھر کی بڑھیا کدھر کا توں

چل رے چرخے چرخ چوں

کدھر گئے بہتر یعقوب   کدھر گئے یوسف محبوب
کدھر گئے طالب مطلوب   کدھر گئے لیلیٰ مجنوں

کدھر کی بڑھیا کدھر کا توں

چل رے چرخے چرخ چوں

آہ بخیر ارض و سما کا ہے   جان مرغ اسیر فنا کا ہے
نوک ابترت نام خدا کا ہے   آخر عدم ہے دنیا دوں

کدھر کی بڑھیا کدھر کا توں

چل رے چرخے چرخ چوں

کہاں سکندر ہے سلطان   دارا کہاں رفیع الشان
سب جگ کوں فانی جان   مجھو نہ کر مکر و فنون

کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرخ چوں
خودی تکبر سب کچھ چھوڑ   مت کر اتنا غوغا شور
جیسے چورا ہے کا ردو   باقی ہوا جو ناکر ہوں
کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرخ چوں
جو غفلت کے مدہ ماتے ہیں   عصیاں میں باز نہ آتے ہیں
پھر روز جزا پچھتاتے ہیں   یہ حکم رکھ دل میں مضموں
کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرخ چوں
یہ دنیا ہے سفر سرائے   غافل جو مست آنکھ لگائے
پونجی کھوئی چلے پچھتائے   پھر نہیں آوے ہاتھ کبھوں
کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرخ چوں
جو زاہد زہد نما ہوں گے   دل پتھر ہیں ریا ہوں گے
شرمندہ روز جزا ہوں گے   رو دست دعا سے تدبیر دوں
کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرخ چوں
کدھوں بیٹھے بیچ عماری   کدھوں نہ جیرے نال سواری
ذکر معشت گھر کی خواری   تن پر دیکھ غم سے رخو
کدھر کی بودھیا کدھر کا توں   چل رے چرخے چرخ چوں

خوش دل قسمت پر قانع ہو — ہنکار سوں دل کو مانع ہو
بندۂ قدرت صانع ہو — کس سوں کیا مطلب تجکوں
کدھر کی بوڑھیا کدھر کا توں
چل رے چرخے چرخ چوں
(از بیاض پروفیسر آزاد)
چوک چنڈں بوں

فدوی لاہوری

میرزا سودا ان کے حریف، غالب ان کو بقال بچہ کہتے ہیں فارسی و ریختہ میں کامل تھے۔ ایران میں ایک عرصہ تک رہے ہیں۔ تجارت ذریعہ معاش تھا۔ احمد نگر فرخ آباد میں ایک عطار کی دکان پر مکان کرایہ پر لے رکھا تھا عطار کی دوکان پہ اکثر آ بیٹھتے تھے اور وہیں شعر کے چرچے رہتے تھے۔ فدوی نے سودا کے بعض اشعار پہ اعتراض کیے تھے مثلاً ایک مقام پر سودا نے شیخ و برہمن دونوں کے لیئے دین کا لفظ استعمال کیا تھا فدوی نے اعتراض کیا کہ دین شیخ کے لیے اور دھرم برہمن کے لیے مخصوص ہے سودا نے جواب میں آیۂ کریمۂ "لکم دینکم ولی دین" نقل کی۔ اسی طرح سودا کا ایک شعر اور بحر میں حسب ذیل تھا ؎

تم نے جہاں وا کیے بند قبا اپنے جان — جائے صبا نے بباغ کھول دیئے گل کے کان

فدوی نے اصلاح دیکر اس طرح لکھا ؎

کھول دیے ناز سے تم نے دو چشم اپنے جان — کھولے صبا نے پس غنچۂ نرگس کے کان

ہجوؤں تک پہونچی۔ میرزا نے جس طرح ضاحک۔ فاخر مکیں۔ میاں فوقی۔ شیخ صنعت اللہ۔ ندرت کشمیری۔ مرزا علی وغیرہ ہجویں لکھی ہیں۔ فدوی کی بھی ہجویں لکھیں۔ چنانچہ پانچ اب تک میرزا کے کلیات میں موجود ہیں۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہجوگوئی کا سلسلہ ایک عرصہ تک قائم رہا ہے۔ ان میں سے ایک ہجو میرزا نے پنجابی زبان میں لکھی ہے جس کا مطلع ہے ؎

بنی جو سوداد سے کن یہ ڈھل فدوی جس کو دندعا زندہ ہے
بطلے بڑے نوں دسے یارا کہہ ہجو فدوی ستاء ندا ہے

یہ معرکہ ۱۱۸۶ھ میں پیش آیا۔

میرحسن فدوی کے متعلق لکھتے ہیں۔

"فدوی مردے بود برخود غلط برائے مباحثہ و مجادلہ بہ فرخ آباد پیش مرزا رفیع سلمہ اللہ آمدہ ہنگامہ برپا نمود بعدہ از ذلت بسیار بہ وطن خود برگشت یوسف زلیخا بزبان ریختہ گفتہ بود و بہمہ عالم می نمود ہر کسے کہ از و لطف بر می داشت از و محظوظ می شد۔ حالا معلوم نیست کہ زندہ است یا مرد از دست" ؎

مژہ کی نوک سینے میں نگاہ یار سے ڈوبی | کہ جیسے بھال توڑے میں مری کیبار سے ڈوبی
یہ چھو رنگ فدوی کا کف قاتل پہ اے یارو | کسی کے خون میں اسکے ہاتھ کو تلوار سے ڈوبی

میں تسلیم کرتا ہوں کہ میرحسن کا فیصلہ فدوی کے حق میں چنداں منصفانہ نہیں ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ خود فدوی کے ہموطن اس کے حالات و کمالات سے قطعاً بے خبر ہیں ورنہ اسکی تصنیف یوسف زلیخا کا سراغ چلتا ہے تاہم اسکی بلند پائیگی میں شک نہ کرنا چاہیئے۔ ذیل میں اس کے کلام کا نمونہ درج ہوتا ہے جو بعد تلاش حاصل ہوا ہے ؎

آنسو نہیں ہیں دیدۂ تر میں بھرے ہوئے
موتی ہیں آبدار صدف میں دھرے ہوئے

ابرو ترے کی تیغ سے سورج ... ہوئے
پھرتا ہے اپنے منہ پر سپر کو دھرے ہوئے

خالی کمان کو دل کے نشانوں پہ ایک بار
ترکش تری مژہ کے ہیں چاروں بھرے ہوئے

کہنے لگا کہ میری گلی کی طرف نہ آئے
جاوے دوانے یاں سے ادھر کوں پرے ہوئے

یہ سن کے میں نے عرض کی خدمت میں اس طرح
لیکن دو دست بستہ ادب سیں ڈرے ہوئے

جرأت کہاں کہ آسکوں قرآن کی قسم
لاتا ہے دل مراد تجھے آگے دھرے ہوئے

دو دن کی بہار ہے دیدۂ گریاں کے فیض سے
اشجار کوہ دشت کے یکسر ہرے ہوئے۔

حضرت مراد شاہ رح

والد کا نام پیر کرم شاہ عرف میاں شاہ ہے۔ چار سال لکھنؤ و دیگر مقامات میں گزارنے کے بعد سنہ ۱۲ھ میں اپنے پدر بزرگوار کی معیت میں واپس اپنے وطن لاہور آ رہے تھے کہ شاہجہاں آباد کے قریب قزاقوں سے مقابلہ ہوا۔ اور پیر کرم شاہ مارے گئے۔ اس اتفاق سے تین سال اور وطن آنا نصیب نہ ہوا۔

حضرت مراد شاہ کئی تصنیفات کے مالک ہیں۔ دیوان کے علاوہ متعدد چھوٹی چھوٹی مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں۔ سنہ ۱۲۱۲ھ میں اپنے شاگرد حکیم علیم اللہ کی فرمائش پر قصۂ چہار درویش نظم شروع کیا۔ اور کچھ حصہ نظم کر چکے تھے کہ پیام اجل آپہنچا اور عالم شباب میں تیس سال کی عمر میں دنیا سے سنہ ۱۲۱۵ھ میں کوچ کیا۔ مزار موضع مردانہ تحصیل شاہدرہ میں ہے۔

ان کی طبیعت غزل سے بہتر مثنوی پر جمتی ہے۔ اس عہد ان میں وہ کسی سے کم نہیں اور اہل ہندوستان کے دوش بدوش ہیں متواتر سات سال

ہندوستان میں رہنے کی بنا پر زبان بالکل صاف ہو گئی ہے سلاست اور روانی کے علاوہ کلام میں پختگی موجود ہے ۱۲۱۳ھ میں ایک منظوم خط عزیزان دہلی کو لکھتے ہیں جو نامہ مراد کے نام سے موسوم ہے اور ہمارے مخدوم جناب غلام دستگیر صاحب نامی کی سعی سے چھپ چکا ہے۔ اس خط میں اردو کی قبولیت کے ذکر میں فرماتے ہیں ـ

واہ اردو کیا ہے یہ ہندی زباں ہے — کہ جس کا قائل اب سارا جہاں ہے
کلام اب تجھ سے ہیں ہندی زباں میں — کہ دل شہرت ہوتا سارے جہاں میں
کہ اب وسعت ہیں اس کی سب سخندان — سمند طبع کو کرتے ہیں جولاں
لطافت یہ نکالی ہے اسی میں — کہ فرماتے نہیں کچھ فارسی میں
اسی کا شہرہ اب ہو جائے سب تک — یہاں سے تا بایران اہل عرب تک
خصوصاً شعر اب شاعر یہاں کے — نہیں کہتے بجز ہندی زباں کے
زبان ہندی کا یہ چرچا یہاں ہے — کہ شعر فارسی مطعون زباں ہے
یہ شہرت ہے اب اس مضمون پر کی — نہ کوئی فارسی پوچھے نہ ترکی
نہ اب ہندی سخن میں نقص ممکن — لطافت ہے بہت سی اس میں لیکن
نہ شاعر ہند کے ہیں فی الحقیقت — گئے ہیں فرس کے مضمون پہ سبقت
جو ڈھونڈا فارسی کے استاداں کو — کیا پر مغز تب ہندی زباں کو

فصاحت فارسی سے سب نکالی
لطافت شعر میں ہندی کے ڈالی

لفظ اردو کا استعمال ان کے ہاں تحسین کی طرح قدیم ہے گویا تحسین نثر میں اور یہ نظم میں سب سے پہلے لاتے ہیں۔ میں ایک اور مثال ان کی مثنوی اور چہار درویش سے دیتا ہوں ـ

یہ قصہ جو ہے چار درویش کا — اگر نظم ہو تو بہت ہے بجا

دیکھیو جو اردو زبان میں بیاں — کہ سجاتی ہے ہر اک کو یہ زباں

ناسی صاحب نے ان کی مثنوی مراد العاشقین در فارسی ترجیع بند بزبان چھاپ چکے ہیں ذیل میں ان کا مخمس بطور نمونہ کلام ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے

شہر لاہور رقبۂ اسلام — رونق آفاق میں ہے جس کا نام
ذہن ان کی تھی شہرۂ آفاق — حسن کا اس کے ساتھ جہاں مشتاق
اصفہاں ہے جو ایک نصف جہاں — خوبیوں میں نہ تھا اس سے کلاں
دور و نزدیک تھا یہی مشہور — اپنے نزدیک تھا بہت سا دور
تھا عمارت سے یہ قوی بنیاد — ربع مسکوں میں افتخار بلاد
تھا بہشت بریں بروئے زمیں — عجب نشاں تھے اس مکاں کے مکیں
ایک سے ایک تھے دو صد چنداں — سب ملائک صفت شبیہ انساں
اولیا و مشائخ و سادات — ذات اک سے اک ستودہ صفات
شہر تھا یہ کہ کان علم و ادب — کان کیا بلکہ جان علم و ادب
کیا بہار زمیں کروں تحریر — شہر تھا یا مرقع تصویر
گلبن اور ولا یہ حسن کی تھی بہار — گل تھے ہر ایک کے گلے کے ہار
کھینچے تھے دکھا کے رنج دل کو — خانہ خانہ زمیں تھے کمال ابرو
قافل بیٹھے ہیں کس کے رستی کا ہے — جال سے قربان ل سے کہتی تھی
تیر زد ہم گر ترکش آسماں نیست — گر چشمہ کرد انکہ مرد میدان نیست

(شہر لاہور کا نقشہ) لے یہ منظوم ڈاکٹر محمد باقر کے دیباچہ سے مزین ہو کر انجمن ترقی اردو کے رسالہ اردو نمبر اکتوبر ۱۹۲۳ء میں شائع ہو چکا ہے اور اردو دیوان مراد کا بھی نقشہ نا... صاحب نے لکھ کر اسی رسالہ کے جولائی ۱۹۲۰ء نمبر میں شائع کرایا (ناشر)

خوبرو تھے حیا سے سب موصوف   اور عاشق وفا میں تھے معروف

راہرو تھے کبھی طریقت پر   تھا قدم منتظر حقیقت پر

اور جس کو کہیں مجازی تھا   شیوہ اس کا بھی پاکبازی تھا

جو کہ عالم تمام دیکھ آیا   ہو نہ دیکھ اس کو پھر کہیں جانا

رشک آبادی جہاں تھا یہ   الغرض خوب ہی مکاں تھا یہ

سو زمانے سے ایسی زشتی کی   خوبی اس قطعۂ بہشتی کی

لے کے دوزخ میں ڈال دی یکبار   وقنا ربنا عذاب النار

کوئی اس میں پڑا جو ہوم قدم   ہے اس کا وجود رشک عدم

ہے مکاں کو شرف مکینوں سے   ذکر دوں ہنتوں کمینوں سے

نہ وہ رونق نہ وہ صفائی ہے   سکھیوں کی غرض دہائی ہے

نہ وہ توشہ نہ ماں سدھائے لے   سکھوں کو گئے اجاڑ دیے

اسی صورت سے آگے احمد شاہ   تھا گیا چھوڑ چیونٹیوں کی سپاہ

گو زمیں تھی سب انھوں نے گھیر   منہ دو ان کے ہو گئے دلیر

راہ خالی نہ تھی جو کوئی چلے   لیکن رہی تھیں جوتیوں کے تلے

اب ہیں پر سکھیوں سے سب لاچار   ہیں یہ گرد لپہ آہ سب کی پکار

نہیں آرام ان سے رات اور دن   کھا گئیں کان سن کے بھن بھن

دل کو بھیے بات کھانے کی   اٹھ گئی رسم بھی پکانے کی

آتش جوع نے جگر کیا کباب   جس کے دل کوں کہو ہو بیتاب

خشک روٹی نہیں پکاتا ہے   زن مصیبت سے وہ بھی کھاتا ہے

اور قلیہ پلاؤ کھائے کون   ہو سکے کس سے اور پکائے کون

پک گئی شب کہیں جو خالی دال   اپنے کھانے کا کیا لکھوں احوال

ناش کا دیکھ بیچ میں چھکا　　کھا گئے وسواس وہ جو تھا دل کا
منھ سے لقمہ وہیں اُگل ڈالا　　دیکھیو دال میں ہے کچھ کالا
یا یہ کہتے تجھے کیا ہوا ہے ہے　　لائیو طشت مجھ کو آئی قے
اس میں پہونچی حکیم جی کو خبر　　کوئی یاقوتی آئے وہ لے کر
لے ادھر وہ زبان پر رکھی　　پڑ گئی ناک میں ادھر مکھی
ناچتی ہیں کہیں جو کنچنیاں　　دیکھنے جائیے تک وہاں کا سماں
ہے دھیان ان کو بھی یہ تانوں میں　　مکھیاں پڑ نہ جائیں کانوں میں
اور پاؤں کی گت سے ہے منظور　　مکھیاں ہوں کسی طرح سے دور
ناچنے کا غرض بہانہ ہے　　مدعا مکھیاں اڑانا ہے
مکھیوں سے نہیں کسی کو نجات　　کچھ نہ پوچھو نمازیوں کی بات
جب کنویں بیچ ڈول ڈالے ہیں　　مکھیوں کا ہی بھر نکالے ہیں
کرنے جس وقت بیٹھتے ہیں وضو　　پانی سے منھ میں کرتے ہیں کھو کھو
آہ بھرنا بھی ہو گیا ہے محال　　اور لکھنے کا کیا لکھوں احوال
لیے کاغذ پہ کلک جب رکھی　　لکھتے لکھتے ہی یک قلم مکھی
سطر کی سطر ساری چاٹ گئی　　اڑ کے بھر آنکھ پر بھی کاٹ گئی
جتنے گھوڑے تھے بو زبام خنگ　　مگسی ہو گیا ہے سب کا رنگ
شہر میں دیکھ میں یہ ہنگامہ　　گاؤں میں آ لکھا مگس نامہ
سنبلی شہر کی اتاری نام　　ہے مریدوں کا اپنے جس میں مقام
لیکن خالی ہے ان سے شہر نہ گاؤں　　کہ برابر ہے ان کو دھوپ اور چھاؤں
دن کو گرتی ہیں یوں کہ صید بہ باز　　رات کو یہ اڑیں ہما پرواز
سب پرندے خطرے بھول گئے　　اور درندوں کے پاؤں پھول گئے

کوئی حالت نہیں ہے انساں کی — اور نہ صورت کوئی ہے حیواں کی
آہ قطع نظر ز بہ حیواں — نتواں دید صورت انساں
بس کر آگے نہ کہہ کچھ ان کی بات — کہ مراد اب یہ ہے دعا کا دات
مکھیوں سے نجات پاویں گے — رغبت دل سے کھاویں پیویں سب
شہر پر پھر وہی سماں ہووے — شکل بسنے کی پھر وہاں ہووے
نہ رہے کوئی اور فتنہ اور فساد — بے خلل شہر میں رہیں آباد
اختر نحس کا عمل جاوے — سعد اختر کا دور پھر آوے
شہر میں ہو سراسر آبادی — پھر وہی رونق اور وہی شادی
اور رہے اس کو تا قیام جہاں — فتنۂ آخر الزماں سے اماں

تا بر آوے سبھوں کے دل کی مراد
قید سے رنج و غم کے ہوں آزاد

پیر سکندر شاہ امداد متوفی ۱۲۱۴ھ

حضرت مراد شاہ کے چھوٹے بھائی ہیں۔ بیس سال کی عمر میں وفات پاتے ہیں مزار خانقاہ حضرت عبد الجلیل واقع لاہور میں ہے۔ نمونۂ کلام ؎

بادہ و جام و ساقی گل و دل — ہے نہیں ہائے اک غیرت گل
شب میں احوال اس کا کہہ نہ سکا — شیشہ ہر چند کہہ رہا ہے قل
زلف مشکیں کو دیکھ اس کی — کٹ گیا آج طرۂ سنبل
جس گل اندام کے لیے میں نے — کھائے اپنے بدن پہ لاکھوں گل

سو اشاروں میں اسکے خون میرا
لے گیا اس کے نہ نگیے کا مل
دیکھ کر اس پری کو ہوش وحواس
آہ پرواز کر گئے بالکل
فیض شاہ مراد سے امداد
ہم نے باندھے ہیں ریختوں کے پل

رام کشن

ہیں رام کشن کے ایک ترجیع بند سے جو لمبا ہے ۔صرف چند اشعار پر قناعت کرتا ہوں ۔

توڑے دتا ہے تجھ تیرے اقرار کی قسم
بے اعتبار ہیں ترے اعتبار کی قسم
ناگن کی بھانت ڈس کے میرا دل الٹ گئی
کرتا ہوں مجھ کو سیہ مار کی قسم
غفلت میں ہو گئی ہے تری چال دیکھکر
سب کبک کوہسار کی رفتار کی قسم
نازک بدن ہے تیرا کروں کیا صف بیاں
شرمندہ گل ہوئے گل گلزار کی قسم
زیباں بزیب خوبی اد ینہ کے نیچ
کھاتی ہے تیرے سخن شکر بار کی قسم
ہم سیں نہ اپنے رخ کو چھپا شوخ نازنین
تجھ کوں ہے رام کشن طلبگار کی قسم

(از بیاض پروفیسر آذر)

فقیر اللہ

فقیر اللہ خانوادۂ نوشاہیا سے بیعت میں اور شاہ امانت کے مرید ہیں ۔حاجی نوشہ متوفی سنہ ۱۱۰۳ھ اسکے بانی ہیں ۔شاہ امانت کا حاجی نوشہ سے یہ واسطہ ہے

کہ شاہ امانت حضرت عبدالغفور کے مرید ہیں۔ جو محمد حافظ سے بیعت رکھتے ہیں اور محمد حافظ محمد ہادی سے ارادت رکھتے ہیں جو بانی سلسلہ حاجی نوشہ کے مرید ہیں۔

فقیر اللہ مثنوی در مکنوں کے مصنف ہیں جو رمز العشق کی طرز میں تصوف پر لکھی گئی ہے۔ اس میں ایک ہزار سے زائد ابیات ہیں اور بحر بھی تقریباً وہی ہے۔ سرخیوں کے طور پر اس میں دوہرے لائے گئے ہیں۔ اسکی تاریخ تصنیف ۱۲۰۴ھ "چراغ" کے اعداد سے برآمد ہوتی ہے۔ اقتباس

انند سنا تیرے گن گاوال | ہر دم تیرا نام دھیاوال
آنند بھی ست گورو میں پایا | اچھا جاپ جس مجھے بتایا
"کنت کنزاً" نے کیا سایا | سوہنگ آہنگ آئے پکارا
اچھا جاپ جپائے کو سوئے | جس کا ہردا نرمل ہوئے
سوہنگ ہوا تا کو جان | ہمری شغلی کا بھید پچھان
ہو اللہ ہے اچھا جاپ | جب سیں گنیں کو تاں پاپ
باہر سو بھر اور آہنگ | اچھا جاپ ہے سوہنگ آہنگ
ہوا تا جب جس نے کہا | سو تیں ہو اللہ ہو رہا
ہوا تا جب سالک کہئے | وحدت دوار آہنگ ہو رہے
آپی ہر جی آپی توں | انا انا ہو بولیں توں
ہر ہر رنگی ہے بے چوں | جس پچھانی ہیں سبھ بیچوں
ہو جاپ سیں پاوے سکھ | جن ہو اور سبھی ہے دکھ
ہو جاپ ہی چڑھے پد کا | سادھو پائے بھید اس جد کا
شاہ امانت بھید بتایا | تو ہیں ان حد ناد بجایا

معنی اسم صفت کے جانوں | بوجھ بھید اور سر پچھانوں
اسم مسمی جسا نہ میت | سمجھ بوجھ کر دھر یو چیت
ہریک اسم کی شان پچھان | لازم حفظ مراتب جان
جس نے حق کوں سُن سمجھ پچھانا | حفظ مراتب لازم جانا
میں کیا کہتا ہوں دیوانا | سنکر طالب کر خوشیانا
اوس کے سات مراتب جان | ہر دو احد کے حکم پچھان
فرق اور جمع ہو جاس یہ نیک | بہتر دونوں کوں جانو ایک
گور ایسے بوجھ منزہ ذات | ناہو کافر مانا لمزات (کذا)
مت گور سیں یہ بھید پچھان | پھر دونوں کو ایک ہی جان
ایک ہی ایک ہے ایک ہی ایک | سمجھ لیئو اور بوجھو نیک
آپے عابد ہے معبود | آپے ساجد ہے مسجود
وحدت عین کثرت ہے یارو | ظاہر میں سمجھ بچارو
اور باطن میں تمیز جان | کثرت کوں وحدت پچھان
کل اسماء کی واجب جان | فاعل بیچ اشیا کے مان
سب اسماء کہا فانی | جانو حادث اور نقصانی

خاتمہ

مرمکنوں کا جس نے جانا | اپنے آپ کوں آپ پچھانا
فقیر اللہ کیا کہی بات | مرمکنوں ہے شاہ کی ذات
شاہ ہمارا شاہ ہمارا | کل عالم کا سرجن ہارا
مرمکنوں کے سن کوں جان | یعنی عدد "چراغ" پچھان

سر نگونوں کو کیا تمام — شاہ جیلانی کا لے کر نام
ہے وہ سید عبدالقادر — ظاہر باطن اول آخر
عبدالقادر پیر ہمارا محی الدین نام رکھا پورے — ظاہر باطن قادر قادر ہو کر تر کو بھر چھا پورے

رحمت شاہ

رحمت شاہ مثنوی شیریں فرہاد کا مالک ہے جس میں ہر نو دس اشعار کے بعد بند کے طور پر دوہرے آجاتے ہیں۔ اس مثنوی کی زبان بھاشا اور پنجاب آمیز ہے اور لطف یہ ہے کہ کبھی پنجابی غالب ہے اور کبھی برج۔ رحمت شاہ نے اپنے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ حتیٰ کہ ہم کتاب کے نام و تاریخ نیز مصنف کے زمانہ سے بے خبر ہیں پوری کو وہ اپنا وطن بتاتا ہے جہاں جگدیو کا استھان ہے۔ یہاں اس کے والدین آکر آباد ہو جاتے ہیں۔ اس کے والد نے سات مرتبہ حج کیا ہے۔

ابتداء۔

اول نام صاحب کا لیجے — پاچھے نے جیبی کا دھیا کیجے — جو جنت جو اس پائے — ہر ہر کرت سنگ لائے
اور داتا سبھن کا سائیں — پالے سبھی کو ہر جائیں — اس جہاں کیا کہوں بکھانو — اک جوت کی کلا بکھانو
لاکھو جیو جو جل میں رہتا — تا کا رزق ہمیشہ لہیں — پنچھی اور پرندے پاکھی — کیڑے جوں کی شکل بنجاتی
خبر لہندا وہ کرتارا — اسی دوار پہ کریں پکارا — دھرتی کوں نہیں پاس بٹھاوے — پانی کو نہیں مار بٹھائے
ہر ہر میں ہر ہے ہر جاتا — کون کرے ہر بن پہ ناتا — پاتھر من جو رزق پہنچاوے — ہو رجیو کہیں نظر آئے

رحمت شاہ اپنے وطن کے متعلق یہ بیان دیتا ہے ؎

اک نگر ات بسے سہاوا — نگر بیچ تاں کو ملاوا — دار دوار پہ گھوڑے تو رنگا — دیکھ دہوک ہو کہ لاجے مردنگا

ہر ادہیں کو پرا و پکارے — کرتنے پرش گئے اوتارے
نس دن نے مدہ ماشٹ رہیں — ششتر و سوں سر سنگ کہیں
پوری نام جگدیو استہانان — نگر لوگ ات چتر سوجانان
ہم بستے ہیں اسی نگر میں — دیا دھرم کار دچ سنکل مان
بات پتا ہمرہ جب آکیہو — ایس نگر استہان بنا ہو
سمجھ اودے سنگ کیتا — اینہاں اسے سکھ سنت لینا
ست بار عاشق اوہ بھیجے — پھر ہار مد بیٹھے لدے

انت کالی اس نگر میں آئے گیا اسلام
سب کار وچ پوٹے ہوئے نال رب دے نام

خاتمہ

دیو جنگل سب اکٹھے ہوئے — جلے دیکھو فرہاد جو ہوئے
کیا ہے فرہاد ہی تائیں — کتنے جو ماردیا اس تائیں
کرہ ساری اس کی کیا کچھ کیتا — عاشق مار لیا چھپ کیتا
لائق ہے بدلہ جو کرو — کتنے کوں سولی پہ دھرو
دل دیوان ایہ بات سنائی — کتنے کے گل پاؤ پھاؤ
مار مار کر بہت بیچالا — اوہ کتنے منہ کے ادھالا
اورک کیتا سب کو یادے — بدلہ او صاحب دکھلاوے
دیکھے مہر پہ صاحب سائیں — بدلہ اوہ چھوڑ ویندا نا ہیں

اوہ بدکار جو مار کر کیتے بہت بے حال
رحمت شاہ دے حفل داوہ سی مول نہ ڈال

عبدالرحمٰن خلدی

خلدی کا زمانہ تیرھویں صدی کا پہلا منتصف تصور کرنا چاہیئے۔ اگرچہ کلام میں قدامت کی جھلک ہے

گھونگھٹ دور کر مکھ دکھاوے سجن — دل عاشقاں نا ستاوے سجن
جدائی تیری سے جلا جان و دل — جلے کا جیانا جلاوے سجن
دیا جن تیری سے جلا جان و دل — جلے گا جیا ناجلاوے سجن
کرم کر تو نکار کے واسطے — ترے عشق میں مرچکاوے سجن
مرے خون کا کیا کرو گے جواب — جو پوچھے گا تم کو خداوے سجن
جدائی تمری سے تو میں مر رہا — مرے حال پر کر دیا رے سجن
وفا ابتدا میں بھلا چھوڑنا — تجھے کس کہا سو بتاوے سجن
سنبھارے سے محبت کا قول و قرار — کر دیا اپنا خدا رے سجن

کوئی دن تو دل بیٹھو خلدی کے ساتھ
نہیں جگ موں رہنا سدا رے سجن

(از بیاض مولوی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار)

غلام قادر جلال پوریہ غلام تخلص

اس کا زمانہ معلوم نہیں لیکن تیرھویں صدی کے نصف اول میں اسکو جگہ دی جاتی ہے۔ کلام میں فارسی ترکیبیں زیادہ غالب ہیں۔ غزل ذیل سراج دکنی

کی مشہور غزل کے جواب میں لکھی ہے ؎

ترے رخ کی تاب جمال سے نہ قمر کی کی وہ قمری رہی ۔ نہ سمن کو سیم بری رہی نہ چمن کی جلوہ گری رہی
کمرے خوش خرامی کی طرز میں ترے سرو قد کی برابری ۔ یہ ہوس ہمیشہ ہوا میں بھی بخیال کبک دری رہی
بجناب حضرت عشق جب لیا درس نسخہ صلح کل ۔ نہ کسی سے جنگ و جدل رہا نہ کسی سے کینہ وری رہی
بخیال صافی جسم تو شدہ خواب مخمل و عبقری ۔ گئی بادلہ کی جھلک بدل نہ ذرا بھی تاب زری رہی
ہوئے ہیچ بحر فنا میں ہم بکمال شوق حباب آشنا ۔ اسی ہیل جوش بلا میں بھی سبھی امن و فراغ دھری رہی
دل و دیں کیا ہے فدا میں سب تب عشق بیچ پھنسا ہوں جب ۔ نہ رہا ہے کچھ ز حق ادب جو رہی سو بالا سری رہی
بحلاوت لب لعل تو کرے سبزہ دعوی ہمسری ۔ بمراد دل تو سدا اگرہ بمذاق نے شکری رہی
دیکھ معجزہ نہیں کیا ہے یہ ترے حسن شان کے روبرو ۔ نہ کمال شان ملک رہا نہ مجال حسن پری رہی
کیا منزلوں سے جدا رہا رہ دور کعبہ عاشقی ۔ یہ مراد خاطر عاشقاں اسی راہ میں سفری رہی

ہے عنایت یار کی کروں کس زباں سے صفت بیاں
کہ کرم سے حالی غلام محمد بھی علی خوش نظری رہی

(از بیاض مولوی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار)

نثر

پوتھی سلوتری کی

نثر نظم سے نسبتاً کمتر لکھی گئی ہے اور اسکے نمونے کمیاب ہیں میں یہاں ایک ایسے رسالہ کا تذکرہ کرتا ہوں جو بارھویں صدی کے آخر میں لکھا گیا ہے یہ ایک فرس نامہ ہے جو دس فصلوں اور تیرہ اوراق پر شامل ہے اس کا آخری ورق مفقود ہے۔ کاتب کوئی غیر مسلم ہے جس نے بسم اللہ کے بجائے "ست گورپرشاد" لکھا ہے۔ اس رسالہ میں فارسی و عربی کا استعمال کم دیکھا جاتا ہے۔ بعض حروف ظرف و اضافت کی صورت میں کبھی پنجابی اور کبھی اُردو حرف لے آتا ہے۔ اسماء و افعال بھی بعض اوقات پنجابی ہیں اور اگرچہ رسالہ اردو میں لکھا گیا ہے۔ لیکن ٹھیٹ پنجابی لہجہ میں ہے۔ نمونہ:۔

"پوتھی سلوتری کی پچھاون نان کھوڑیاں کا عیب سواب عمر کا ذات کا رد کے سو دس بہانت کا ہے۔

بہانت پہلی پیدا ہونے کھورے کے۔ دوسرے کھورے کے سوادنے کی بہانت تیسری پچھان نان سوکن ادکن کا۔ بہانت چوتھی۔ پچھان نان نخس کا۔ بہانت پنجم پچھان نان برساں کا۔ بہانت ششم ٹل (مول) لینیس کھورے کے۔ بہانت سمتی پچھان نان ذات کھورے کی کا بہانت آٹھمی پچھان نان ٹھیت (خاصیت کا) بہانت نوں پچھاں

نسمیں کرنا علاج کا۔
ناں روگ کا۔ بہانت د
بہانت پہلی بیدیا جو نیے کھودے گئے۔ ایک برہمن تھا نام اس کا
اسپت تھا اکن ہوتری تھا۔ اکن ہوتر سیں دھوانکس کے جو آنکھیں
میں پیدا تھا۔ تس نے جو آنسو چلنے تھے داہنی جو اکھ تے آنسو بہ چلتے
تھے تس نے کھودا بہوت چکیا۔ بادیں اکھ تے آنسو جو چلتے تھے۔
تس نے کھودی
کھودیا ....
ہوت کھپی۔ پر تو بدا اسیا برہمن کا تھا۔ اس کا نام سلوتر تھا۔ تن
پوترا اپنے تو کھیا اک پوتھی کھودیاں کی گرد۔ جس نے کوں اوکن
اور روگ اور علاج جانیا جائے۔ تس ہیں اہ پوتھی کری" اپنا
ہیں نام رکھیا"

یہ عبارت بے ربط اور اکھڑی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف
زبان پر عبور نہیں رکھتا۔

ہزار مسائل

رسالہ ہزار مسائل فارسی کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے اور حفظ الرحمٰن صاحب (حفظ العلوم) کی ملک ہے۔ اس کے مؤلف اور زمانہ تالیف سے ہم بالکل بے خبر ہیں لیکن اس کے املا اور افعال اور اضافت کی جمع مونث کو دیکھ کر جو قدیم طرز میں ہے ہمیں تیرھویں صدی ہجری کی ابتدائی ربع میں اس کا تعین کرنا پڑتا ہے۔ کیاں بجائے کی۔ ہونگیاں بجائے ہوں گی۔ چھپتیاں بجائے چھپتیں۔ ہوتیاں بجائے ہوتیں وغیرہ قدیم شکلیں ہیں جو میر امن کے بہت جلد بعد متروک ہو چکی ہیں۔ نسخہ ہذا ۱۲۸۸ھ مطابق سمت ۱۹۳۰ بکرمی مطابق ۱۸۷۴ء کا نوشتہ ہے۔ نمونہ:

جب کہ نامہ مبارک نزدیک عبداللہ ابن سلام کے پہونچا شرطیں تعظیم کیاں بجا لیا کر نامہ معظمہ کوں پڑا اور اپنی اور اپنی قوم کوں اکٹھی کر کے مضمون نامۂ مبارک کا سنایا کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو آخری زمانہ کے پیغمبر تھے ایک نامہ پاس (کنا) بھیجا اور دعوت اپنے دین کی گئی ہے۔ لازم ہے کہ ہم سب لوگ ایمان لیا دیں اور ان کی شریعت اور دین کی پیروی کریں کوئی متفق ہو کر جواب سناؤ۔ ان سب نے کہا کہ اے عبداللہ ابن سلام تم پر سب لوگ علمار ہمارے سیں دانا تر ہیں۔ اور نبیوں کی حقیقت اور ماہیت پر بڑے واقف ہیں۔ تمھاری مرضی کے خلاف ہم نہیں کر سکتے جو تم فرما دیں

سب راضی ہیں لیکن یہ خیال ہم کوں آتا ہے کہ کیونکر اپنے دین کو
چھوڑیں اور ان کے دین کی پیروی کریں۔ تب عبداللہ ابن سلام
نے کہا کہ اے لوگو تم سب جانتے ہو کہ تم کو بھیں معلوم ہوگا کہ موسیٰ
پیغمبر علیہ السلام نے خبر دئی ہے اور دوسرے پیغمبروں نے
بھیں خبر دئی ہے۔ اپنی اپنی قوم سے کہتے ہیں کہ ایک نبی آخر الزماں
نام محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہوگا۔ اور جب اس کا زمانہ آوے
گا ہم سب کا دین چھپ جاوے گا۔ اور اسی کا دین مشرف
ہوگا۔ اور مشرق تا مغرب تک پھیل جاوے گا۔ اور ہم سب کی
کتاب اور شریعت منسوخ ہوجائے گی اور دوسرا یہ ہے کہ جو
چیزیں ہمارے دین میں حلال ہیں اس کے دین میں حلال ہونگیاں
توریت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور انجیل میں حضرت عیسیٰ
علیہ السلام اور زبور میں حضرت داؤد علیہ السلام اور دوسرے
صحیفوں اور نبیوں نے ارشاد فرمایا ہے کہ ان کی کتابوں کی پیروی
کرنے والوں کو چاہیے کہ اس پیغمبر کی شریعت میں داخل ہو کر
ایمان لیا دیں۔ اور اپنے دل کوں شمع دیں اس کی سین روشن
کریں"۔